”عہد آصفیہ میں اُردو شعر وادب کا ارتقاء“

مقالہ برائے

ڈاکٹر آف فلاسفی (اُردو)

دسمبر ۲۰۰۲ء

نگران

پروفیسر محمد انور الدین

شعبۂ اُردو

مقالہ نگار

محمد بشیر الدین

ایم۔اے، ایم۔فل

شعبۂ اُردو۔ اسکول آف ہیومانیٹیز
سنٹرل یونیورسٹی آف حیدرآباد
حیدرآباد۔ ۵۰۰۰۴۶

عہد آصفیہ میں
اردو شعر و ادب کا ارتقاء

پہلا فرمان (پیشِ لفظ)

باب اول ...... سلطنت آصفیہ
تہذیبی، تمدنی، سیاسی وادبی تاریخ کا مطالعہ ۲۱

باب دوم ...... اردو شعر وادب بہ عہد آصف جاہ اول
آصف جاہ ثانی (۱۷۲۴ء تا ۱۸۰۳ء) ۹۴

باب سوم ...... اردو شعر وادب بہ عہد آصف جاہ سوم
تا پنجم (۱۸۰۳ء تا ۱۸۶۸ء) ۲۰۷

باب چہارم ...... اردو شعر وادب بہ عہد میر محبوب علی خان
آصف جاہ سادس (۱۸۶۸ء تا ۱۹۱۱ء) ۲۳۴

باب پنجم ...... اردو شعر وادب بہ عہد میر عثمان علی خان آصف جاہ سابع (۱۹۱۱ء تا ۱۹۶۷ء) ۴۱۹

باب ششم ...... عہد آصفیہ میں اردو شعر وادب کا ارتقاء بہ یک نظر ۴۸۶

(اختتامیہ)

کتابیات ۵۰۲

بسم تعالیٰ

پہلا فرمان (پیش لفظ)۔

اللہ تعالیٰ کا صد شکر کہ اُس نے اپنے رسول آخرؐ کے صدقے میں راقم الحروف کو اُس کی کم علمی کے باوجود "عہد آصفیہ میں اردو شعر و ادب کا ارتقاء" پر پی۔ ایچ۔ ڈی کے لیے مقالہ لکھنے کی صلاحیت بخشی توفیق عطا کی۔

"عہد آصفیہ میں اردو شعر و ادب کا ارتقاء" دراصل اُردو ادب کی تاریخ کے تقریباً دو سو برس کے ادب پر محیط ہے۔ اُردو ادب کا یہ ایسا روشن ترین باب ہے۔ جس نے اپنی تابانی سے سارے ہندوستان کو اُردو شیرینی سے روشن کر دیا ہے۔ ولیؔ، فراقیؔ عزلتؔ نے اورنگ آباد کی سرزمین سے اُٹھ کر شمال کو اپنے جواہرات تخیل سے نوازا اور اورنگ آباد میں شمال و جنوب کی زبان کا سنگم

اس قدر مبارک ثابت ہوا کہ آج اردو غزل نے ساری
دنیا کو اپنا حلقہ بگوش بنا لیا ہے ——

"عہد آصفیہ میں اردو شعر و ادب کا ارتقاء"

جہاں دو سو برس کے ادب کا مطالعہ ہے وہیں اس عہد کے ادب کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اس نے اردو ادب کو چند خصوصی امتیازات بھی عطا کیے ہیں کہ جو کہ اردو شعر و ادب کی تاریخ کا اہم ترین حصہ ہے۔ عزلت نے اردو کی پہلی "راگ مالا" اسی عہد میں تصنیف کی۔ آزاد بلگرامی نے ہندوستان کی بے مثال تاریخ مرتب کی۔ شفیق نے فارسی کے ہندو شعراء کا تذکرہ ترتیب دیا۔ کلام غالب کی پہلی مکمل شرح حیدرآباد میں اسی عہد میں لکھی گئی۔ نظم طباطبائی نے اپنی شرح کلام غالب اسی عہد میں لکھی۔ واجد تلنگانوی نے اردو کا پہلا افسانہ حیدرآباد ہی میں

اسی عہد میں تخلیق کیا۔ اُردو کی پہلی صاحب دیوان شاعرہ نے بھی اپنا دیوان اسی عہد میں ترتیب دیا — اُردو ادب کے سلسلہ میں عہد آصفیہ کے یہ ایسے امتیازات ہیں جو بے نظیر ہیں۔

راقم الحروف نے اپنا ایم۔فل کا مقالہ پروفیسر محمد انور الدین کی بے مثال رہنمائی و رہبری میں مکمل کیا تھا خواہش تھی کہ پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقالہ بھی استاد محترم ہی کی سرپرستی تحریر کروں۔ خدا نے مجھے اپنی اس خواہش کو سرخ رو کرنے کا موقع عطا کیا۔ چنانچہ جب مجھے پی۔ ایچ۔ ڈی میں داخلہ مل گیا تو استاذی محترم پروفیسر محمد انور الدین صاحب جو کہ اُس وقت صدر شعبۂ اُردو کی کرسی پر متمکن تھے۔ نہایت شفقت کے ساتھ مجھے "عہد آصفیہ میں اُردو شعر و ادب کا ارتقاء" کا عنوان تجویز کیا اور راقم کی خواہش پر مجھے اپنی نگرانی میں مقالہ لکھوانے کی حامی بھری —

"عہدِ آصفیہ میں اردو شعر و ادب" پر مقالہ لکھتے ہوئے مقالے کو چھ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے باب میں سلطنت آصفیہ کے قیام و استحکام اور پھر ہندوستان میں اس کے انضمام کی تاریخ کا بیان کرتے ہوئے سیاسی کشمکش کے ساتھ ساتھ اور شعر و ادب کے روشن نقوش کا بیان کیا گیا ہے۔ مقالے کے دوسرے باب کا عنوان "اردو شعر و ادب بہ عہدِ آصف جاہ اول و آصف جاہ ثانی (۱۷۲۴ء تا ۱۸۰۳ء) ہے۔ ۱۸۰۳ء پر اس باب کو اس لیے ختم کیا گیا کہ اسی سنہ میں آصف جاہ ثانی نے انتقال کیا اور اسی سنہ میں دہلی کی مغلیہ حکومت انگریزوں کے زیر نگیں آ گئی۔

آصفیہ سلطنت کے تشکیل و استحکام کے دور میں

اورنگ آباد میں اردو کی روایت مستحکم ہوئی۔ دکنی دور کے خاتمہ کے بعد اورنگ آباد میں شعر و ادب کو نمایاں فروغ ہوا۔ ولی اورنگ آبادی نے دکنی کی اس روایت کو شمال سے مربوط کیا اور زبان کو فارسی کی چاشنی عطا کی۔ تلامذہ ولی نے آصفیہ سلطنت کے اس دور میں سینکڑوں نامور شعراء موجود تھے۔ ان شعراء میں صرف اہم شعراء کے کلام کو وسیلہ بناتے ہوئے اردو شعر و ادب کے ارتقاء کا بیان کیا گیا ہے —

مقالے کا تیسرا باب اردو شعر و ادب بہ عہد آصف جاہ سوم تا پنجم ہے۔ یہ عہد ۱۸۰۳ء سے ۱۸۶۸ء تک محیط ہے۔ اس عہد میں سلطنت آصفیہ بیرونی شعراء کا سہارا بنی ہوئی تھی۔ دہلی اور اس سے متعلق درباروں کی دگرگوں

حالات کے پیش نظر شعراء نے حیدرآباد کا رخ اختیار کیا۔ مقامی شعراء بھی اپنے فن سے شبستان ادب کو روشن کیے ہوئے تھے لیکن مقامی و بیرونی شعراء میں ایک طرح کی کشمکش و معرکہ آرائی شروع ہو گئی تھی۔ اس عہد میں مقامی شعراء نے بہرحال اپنا رنگ برقرار رکھا۔

عہد آصفیہ کے اس مرحلہ میں اردو کے ادیبوں نے نثر کی جانب بھی توجہ دی چنانچہ تاریخ پر متعدد کتابیں لکھی گئیں۔ اردو میں تذکرہ نگاری کو عروج حاصل ہوا اور حیدرآباد میں نثری داستانیں بھی تخلیق کی گئیں۔ اسی عہد میں اردو کا پہلا سائنسی رسالا حیدرآباد سے جاری ہوا۔

مقالے کا چوتھا باب " اردو شعر و ادب بہ عہد

نواب میر محبوب علی خاں آصف جاہ سادس" (۱۸۶۸ء تا ۱۹۱۱ء) کے عنوان کے تحت لکھا گیا ہے۔ یہ عہد اس لیے بھی اہم تصور کیا جاتا ہے کہ اسی عہد میں داغ اور امیر حیدرآباد آئے اور اسی زمانے میں اردو کو سلطنت آصفیہ کی سرکاری زبان قرار دیا گیا اور اسی مبارک عہد میں اردو کی جامعہ کا خاکہ بنایا گیا۔ جسے تحریک کی صورت میں فروغ دیا گیا۔

آصف جاہ سادس کا زمانہ ۱۸۶۸ء سے ۱۹۱۱ء پر محیط ہے۔ ہندوستان میں سیاسی جد و جہد اپنے عروج پر تھی۔ ان سیاسی فضاؤں کے باوجود حیدرآباد کے آسمان پر اردو شعر و ادب کے چاند ستارے منور تھے۔ اردو کے تقریباً تمام مشاہیر حیدرآباد سے وابستہ

تھے۔ اردو تصنیف و تالیف کا موسم اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ بازلیغہ بنا ہوا تھا۔ داغ و امیر کا یہ دور اردو شعر و ادب کا ایک روشن باب ہے۔

مقالے کے پانچویں باب میں "اردو شعر و ادب بہ عہد میر عثمان علی خاں آصف جاہ سابع (۱۹۱۱ء تا ۱۹۶۷ء) کا بیان کیا گیا ہے۔ اسی عہد میں اردو کی پہلی یونی ورسٹی 'جامعہ عثمانیہ' کا قیام عمل میں آیا۔ اردو دارالترجمہ کا بھی قیام اسی عہد کی دین ہے۔ عظمت اللہ خاں سلیم پانی پتی اور جوش ملیح آبادی نے اسی عہد میں غزل پر انگلیاں اٹھائیں۔ غزل کی گردن فوری مار دینے کی باتیں کہیں اور اسی عہد میں نظم کو فروغ حاصل ہوا۔ اردو میں گیت کی روایت آگے بڑھی — لیکن غزل نے جانکنی

کے بعد دم سادھ کر آگے کی منزل کو جا لیا۔ سائل
سالک، جلیل، احسن مارہروی، نوح ناروی، سجاد انصاری
جگر مرادآبادی، مخدوم محی الدین، شاہد صدیقی، مکش
حیدرآبادی، محب حسین، مظفر جاہ شجیع نے غزل
کے دامن کو اپنے خیالات و تخیل کے افشاں سے
روشن کردیا۔ نظم کو جس کی تاب لاتے ہی بنی۔ جوش
ملیح آبادی نے غزل کی بڑی سخت مخالفت کی لیکن
۱۹۳۶ء میں جب انہوں نے اپنا مجموعۂ کلام "شعلہ و شبنم"
شائع کیا تو اس کا پہلا حصہ غزل ہی سے مزین ہوا جو کہ
عہد حیدرآباد کی یادگار ہے۔ یہاں اس بات کا اظہار کرنا ضروری
معلوم ہوتا ہے کہ باب چہارم اور پنجم میں بیشتر گوشے مشترک حیثیت رکھتے ہیں۔
مقالے کے آخری باب یعنی باب ششم "عہد
آصفیہ میں اردو شعر و ادب کا ارتقاء بہ یک نظر" کے

عنوان سے لکھا گیا ہے۔ ۱۷۲۴ء سے ۱۹۴۸ء تک اورنگ آباد اور حیدرآباد دوسرے الفاظ میں سلطنت آصفیہ میں تخلیق پانے والے اردو شعروادب کے ارتقاء کا بیان کیا گیا ہے۔ باب کے آخر میں کتابیات درج کی گئی ہیں۔

راقم الحروف کے مقالے کا موضوع چونکہ "عہد آصفیہ میں اردو شعروادب کا ارتقاء" ہے لہٰذا مقالے کو صرف شعروادب ہی تک محدود رکھا گیا ہے۔ صحافت کے فروغ کو مقالے سے مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے۔

مقالے کی تیاری، ترتیب میں مختلف لائبریریوں سے مواد اکٹھا کیا گیا۔ اس سلسلے میں درج ذیل کتب خانوں کے ارباب مجاز نے ہمیشہ راقم الحروف کے ساتھ تعاون کیا اور ہر وقت مواد کھوجنے میں مدد کی ورنہ شاید یہ مقالہ آج تکمیل نہ پاتا۔ جن کتب خانوں سے استفادہ کیا گیا وہ ہیں:

- اندرا گاندھی میموریل لائبریری۔ حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی کیمپس حیدرآباد۔

- سنٹرل لائبریری، حیدرآباد (سابقہ آصفیہ لائبریری)

- کتب خانہ ادارۂ ادبیات اردو۔ پنجہ گٹہ، حیدرآباد

- کتب خانہ جامعہ عثمانیہ، یونیورسٹی کیمپس حیدرآباد

- کتب خانہ سالار جنگ میوزیم، حیدرآباد

- ڈاکٹر رادھا کرشنن میموریل لائبریری، حیدرآباد

- استاد شیخ داؤد میموریل لائبریری اینڈ ریسرچ سنٹر، حیدرآباد۔

میں مذکورہ بالا تمام کتب خانوں کے ارباب مجاز کا مشکور ہوں کہ مجھے اپنے مقالے کے مواد اکٹھا کرنے کا موقع عطا کیا۔

مقالے کی تحریر ترتیب اور تکمیل میں دوست
احباب کا بے انتہا تعاون بے انتہا اہم ہوتا ہے۔
دوست اگر حبیب بن جائیں تو کار جہاں دراز نہیں ہونے
پاتا بلکہ ریسرچ کی دشواریاں سمٹ کر ختم ہو جاتی ہیں۔
میرے ساتھی اسکالرز میں جناب محمد یونس محترمہ عرشیہ جبیں
جناب انوار احمد خاں کے ساتھ ساتھ حافظ الطاف حسین
نے مقالے کی تیاری کے دوران ہر ممکن مدد کی جس کے لیے
میں ان تمام کا مشکور ہوں۔

میرے ایم۔اے اور ایم۔فل کے ساتھی
ڈاکٹر محمود مصری کا بے انتہا مشکور و ممنون ہوں کہ انھوں نے
اپنے نجی کتب خانے سے حیدرآباد سے متعلق چند نایاب کتب

مجھے عنایت کیں۔ ڈاکٹر مصری نے بڑا نایاب کتب خانہ ترتیب دیا ہے۔ اللہ کرے زورِ ادب اور زیادہ۔

استاد محترم سید ممتاز مہری کے تعاون کا بے حد ممنون و مشکور ہوں، جنہوں نے مشکل مراحل میں دستگیری فرمائی۔

میں شعبۂ اردو حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی کے اساتذہ صاحبان پروفیسر رحمت یوسف زئی، صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر سید محبوب حسین، ریڈر شعبۂ اردو، ڈاکٹر نسیم الدین فریس اور ڈاکٹر حبیب نثار کا شکریہ ادا کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ انہی اساتذہ کے فیض سے آج میں یہ مقالہ مکمل کرنے میں کامیاب ہوا ہوں۔ خصوصاً ڈاکٹر حبیب نثار نے اس ناچیز پر کرمِ عظیم کیا اور مسودہ مبیضہ دیکھنے کی زحمت اٹھائی۔ اللہ انھیں جزائے خیر دے۔ آمین!

پروفیسر محمد انورالدین، سابق صدر شعبۂ اردو

کی مہربانیاں مجھے ابتدا ہی سے اپنا احسان مند کیے ہوئے

ہے۔ پروفیسر صاحب نے زندگی کے ہر کٹھن دور اہے پر

اس خاکسار کی ہر ممکن مدد فرمائی۔ سچ تو یہ ہے کہ پروفیسر صاحب

اسم بامسمیٰ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اُن کی خاموش خدمت نے

کئی اسکالرز کو نازک موقعوں پر سنبھال دیا اور اس خاکسار

کے تو وہ رہبر و رہنما ہیں۔ مواد کی فراہمی، ترتیب، تشکیل

سے لے کر مقالے کی تسوید تک ہر مرحلہ میں مجھے استاد محترم

کا تعاون حاصل رہا۔ یہ مقالہ ہرگز تکمیل نہ پاتا اگر استاد محترم

کا بے پایاں تعاون مجھے نصیب نہ ہوتا۔ احسان مند ہوں کہ

استاد محترم نے راقم الحروف کی ہر ہر قدم پر چاہے زندگی

کی رزم گاہ ہوکر مقالے کی تکمیل کا مرحلۂ سخت
استاد محترم کی عنایات نے ہر مشکل کو آسان بنادیا ۔

آخر میں اپنے محترم برادران جناب سراج الدین
صاحب، جناب فصیح الدین صاحب، جناب رضی الدین (مرحوم)
کا بے انتہا شکر گذار ہوں کہ مجھے مقالہ لکھنے کی ہر ممکن سہولت
بہم پہنچائی ۔ میرے چھوٹے بھائی احمد الدین احمد اور رضیب الدین
نے مقالے کی تکمیل و ترتیب میں ہاتھ بٹایا ۔ میں اپنے تمام
برادران کا ممنون و مشکور ہوں ۔ میرے رفیق زندگی محترمہ
رقیہ کوثر نے مقالے کی تیاری میں مدد کی، شریک حیات ہونے
کا حق ادا کر دیا ۔ خدا ان تمام کو دین و دنیا کی نعمت
سے سرفراز و مالامال کرے ۔ آمین !!!

میرے شکریے کے مستحق میرے والدین ہیں
جن کی تربیت اور دعاؤں نے مجھے اس قابل بنایا کہ
کچھ ورق سیاہ کرسکوں۔ میں اپنے والد بزرگوار الحاج
محمد ریاض الدین اور والدہ محترمہ زیب النساء بیگم
کا ممنون و مشکور ہوں۔ آج والد صاحب نہیں کہ
اپنی دعاؤں کا ثمرہ دیکھتے اور راقم کی بخشش کی
دعائیں دیتے ——

=

محمد رشید الدین

۳۰/دسمبر ۲۰۰۲ م
حیدرآباد

ا

باب اول

سلطنت آصفیہ

تہذیبی، تمدنی، سیاسی و ادبی تاریخ کا مطالعہ

آصفجاہ اولیٰ

نواب میر قمر الدین علیخان فتح جنگ نظام الدولہ نظام الملک مغفرت مآب ۱۱۱۲ھ ۱۱۶۱ھ

بسمہ تعالیٰ

عہد آصفیہ میں اردو شعر و ادب کا ارتقاء دراصل دکنی شعر و ادب کا تسلسل اور ادب کے ارتقاء کی ایک اہم اور مستحکم روایت ہے۔

آصفیہ سلطنت کے بانی میر قمر الدین خاں آصف جاہ اول کے جدِ امجد خواجہ عابد عہد اورنگ زیب میں حج کی نیت و ارادہ سے بخارا سے روانہ ہوئے اور اپنی حیات ناپائیدار کی آخری سانس سرزمین حیدرآباد پر مکمل کی۔ اُن کے انتقال کے صرف پچاس برس بعد اُن کے نبیرہ میر قمر الدین خاں نے گولکنڈہ کی قدیم قطب شاہی سلطنت کی سرزمین پر اپنی خود مختار حکومت قائم کی۔ پہلے برارپھر اورنگ آباد کو اپنی سلطنت کا دارالمقام قرار دیا — اورنگ آباد اورنگ زیب کے عہد صوبہ داری ہی کے زمانے سے شعر و ادب کا ایک اہم مرکز بنا ہوا تھا اور جب عالمگیر نے ۱۶۸۷ء میں گولکنڈہ کی فتح کے بعد اورنگ آباد کو اپنا مستقر قرار دیا تو یہاں اُردو زبان اور ادب پر نکھار آگیا۔ ولی اورنگ آبادی نے دکنی کے پرشباب شعری روایت کو شمال سے متعارف کروایا اور زبان کی پاکیزگی کے زیور سے آراستہ کیا۔ نظام علی خاں آصف جاہ ثانی نے اورنگ آباد سے شعر و ادب کی روایت کو پھر حیدرآباد کی سرزمین سے پیوست کر دیا۔ نواب میر محبوب علی خاں نے اُردو کو اپنے دربار کی زبان بنا کر امتیاز بخشا تو نواب میر عثمان علی خاں نے اُسے جامعہ کے سر کا تاج بنا دیا اور اس طرح اُردو شعر و ادب کا ارتقاء ۱۷۲۴ء سے ۲۰۰۲ء تک

حیدرآباد کی سرزمین پر رواں دواں مسلسل جاری وساری ہے ۔

محمد قلی قطب شاہ سلطنت قطب شاہی کا پانچواں بادشاہ تھا ۔ وہ ہندوستان کے اکبر اعظم کا ہم عصر تھا ۔ ۹۷۳ھ میں پیدا ہوا ۔ ۹۸۸ھ میں اپنے باپ ابراہیم قلی قطب شاہ کے انتقال کے بعد تخت نشین ہوا اور ۳۲ برس کامیابی سے حکمرانی کرنے کے بعد ۱۰۲۰ھ میں داعی اجل کو لبیک کہا ۔ محمد قلی قطب شاہ نے ۱۵۹۲ء میں شہر حیدرآباد کی بنا ڈالی اور شہر کے وسط میں چار مینار بنایا ۔ وہ اُردو کا پہلا صاحب کلیات شاعر ہے ۔ محمد قلی قطب شاہ کی وفات کے بعد اُس کے بھتیجے اور داماد محمد قطب شاہ نے عنان حکومت سنبھالی ۔ اس نے ۱۰۳۵ھ میں انتقال کیا ۔ اس کے بعد اُس کا بیٹا عبداللہ قطب شاہ تخت نشین ہوا ۔ اس بادشاہ نے اورنگ زیب کے ماتحت باجگزاری قبول کرلی ۔ جب اورنگ زیب نے شہنشاہ ہند کی گدی سنبھالی تو ایک مرتبہ پھر اس نے گولکنڈہ کی تسخیر کا بیڑہ اٹھایا اور ۱۶۸۷ء میں سلطنت قطب شاہیہ کا خاتمہ ہوگیا ۔ آخری سلطان ابوالحسن کو مغل فوجوں نے گرفتار کرلیا اور خلد آباد میں قید و نظر بند رکھا گیا ۔

سلطنت گولکنڈہ کے خاتمہ سے قبل ہی اورنگ زیب عالمگیر نے اورنگ آباد کو اپنا وقتی پایہ تخت بنالیا تھا اور وہ اپنی وفات ۱۷۰۷ء تک تقریباً ۲۵ برس اورنگ آباد میں مقیم رہا ۔ اس طرح گولکنڈہ کے زوال کے بعد اورنگ آباد میں اُردو شاعری کا ایک نیا دبستان وجود میں آیا جو ناصر جنگ شہید کے

عہد تک قائم و دایم رہا ۔

اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد اس کے بیٹے محمد اعظم نے محمد شاہ اول کے لقب سے مغل سلطنت کی باگ ڈور سنبھالی لیکن ۱۷۱۲ء میں اُس کی حادثاتی موت کے بعد سلطنت مغلیہ کو صحیح وارث نہ مل سکا چنانچہ ۱۷۱۲ء سے ۱۷۱۹ء تک دہلی کے تخت پر آٹھ حکمراں بیٹھے بالآخر سید برادران نے محمد شاہ کو تخت نشین کیا ۔ محمد شاہ ہی کے عہد میں میر قمر الدین خاں آصف جاہ نے شہرت حاصل کی ۔ اودھ کے صوبہ دار بنائے گئے لیکن دارالسلطنت کے حالات اور انتشار کو دیکھتے ہوئے بجائے اودھ صوبہ دکن کا رخ کیا ۱۱۳۶ھ میں سلطنت آصفیہ کی بنیاد رکھی اور اورنگ آباد سلطنت کا دارالخلافہ قرار دیا گیا ۔

نظام الملک آصف جاہ اول کے جد امجد خواجہ عابد بخارا کے قاضی کے عہدہ پر فائز تھے ۔ ۱۶۵۵ء میں حج کی نیت سے سمرقند سے ہندوستان تشریف لے آئے تاکہ بندرگاہ سورت سے بذریعہ جہاز جدہ روانہ ہوں ۔ مغل شہنشاہ شاہجہاں کو جب خواجہ عابد کی آمد اور ان کے علم و فضل کی اطلاع ہوئی تو اس نے ملازمت کی پیشکش کی ۔ جس کو انہوں نے فریضہ حج کی ادائی کے بعد قبول کرنے کا وعدہ کیا ۔ ۱۶۵۷ء میں جب فریضہ حج کی ادائیگی کے بعد ہندوستان پہنچے تو ہندوستان کی سیاست کا حال دگرگوں تھا ۔ صورت حال کا جائزہ لینے کے بعد وہ سورت سے سیدھے بیجاپور پہنچے جہاں اورنگ زیب محاصرہ کئے ہوئے تھا ۔ اورنگ زیب خواجہ عابد کی آمد سے بہت خوش ہوا ۔ دکنی سرزمین پر یہ خواجہ عابد کی وابستگی کی ابتداء

تھی۔ آئندہ دو سو نوے برس تک اُن کی اولاد نے اس سرزمین پر حکمرانی کے فرائض انجام دیے۔

اورنگ زیب نے جب عالمگیر کے لقب کے ساتھ اپنی شہنشاہیت کا اعلان کیا تو اُس نے خواجہ عابد کو "صدرِ کل" کے عہدہ پر مامور کیا۔ ۶ سال بعد انھیں عالمگیر نے اجمیر اور پھر ملتان کا صوبہ دار مقرر کیا۔ ۱۶۷۶ء میں اورنگ زیب عالمگیر نے انھیں مدینہ منورہ جانے والے حاجیوں کے قافلہ کا "میر حج" بنا کر بھیجا۔ حج سے فراغت پا کر خواجہ عابد سورت کی بندرگاہ پر پہنچے ہی تھے کہ عالمگیر نے انھیں نہ صرف تحائف بھیجے بلکہ قلیج خاں (بہ معنی شمشیر خاں) کے خطاب سے سرفراز کیا۔ عالمگیر نے انھیں ۱۶۸۲ء میں دوسری مرتبہ صدرِ کل کے عہدہ پر فائز کیا اور چار اور چار برس بعد یعنی ۱۶۸۶ء میں ظفرآباد (بیدر) کا صوبہ دار بنایا۔ ایک برس بعد خواجہ عابد قلیج خاں نے گولکنڈہ کے محاصرہ میں مغل فوجوں کے ہمراہ حصہ لیا۔ پھر

عظیم الدین صاحب لکھتے ہیں:

> "۱۶۸۷ء میں قلعہ گولکنڈہ کے محاصرہ کے دوران چھوٹی توپ کا ایک گولہ ان کے شانہ پر آ کر لگا جس کے نتیجے میں ان کا ہاتھ شانہ سے بالکل جدا ہو گیا۔ گولہ سے زخمی اور ہاتھ بالکل اُڑ جانے کے باوجود کسی اضطراب اور بے چینی کا اظہار کیے بغیر نہایت استقلال و قناعت کے ساتھ گھوڑے

پر سوار اپنے خیمہ تک واپس آ گئے۔ عمدۃ الملک
اسد خاں وزیر اعظم جب مزاج پرسی کو آئے تو
اس وقت جراح ان کے زخموں سے ریزہ ہائے
استخواں اور زنبورک کے گولہ کی کرچیں نکال رہے
تھے۔ شیر دل قلیچ خاں جراحوں سے باتیں کر رہے تھے
اور بائیں ہاتھ سے قہوہ پی رہے تھے۔ تین دن زخمی
حالت میں رہنے کے بعد ۱۷ ربیع الاول ۱۰۹۸ھ
مطابق ۱۶۸۷ء کو راہی دار البقا ہوئے۔ قلعہ گولکنڈہ
کے قریب موضع عطاپور میں تدفین عمل میں آئی۔
جنگ ختم ہونے کے بعد میدان جنگ سے اُن کا وہ
ہاتھ بھی دستیاب ہو گیا جو شانہ سے جدا ہو کر گر گیا
تھا۔ انگلیوں کی انگوٹھی (جس پر مہر کندہ تھی) کو دیکھ
کر شناخت عمل میں آئی۔ اس ہاتھ کو مزار سے نصف
میل کے فاصلہ پر قسمت پور میں دفن کیا گیا۔

قلیچ خاں جہاں ایک جری شہسوار تھے اور مرد میدان
تھے وہیں وہ قلم کے بھی دھنی تھے۔ علم و فضل کے علاوہ متقی و
پرہیزگار بھی تھے۔ اب بھی ہر سال ان کا عرس منایا جاتا ہے
یہ اُنہی کا فیض تھا کہ جس سرزمین میں وہ پیوند خاک ہوئے

وہاں ان کا خاندان ۱۹۴۸ء تک حکومت کرتا رہا"۔ [1]

جس زمانے میں خواجہ عابد قلیچ خاں مغل سلطنت میں صدر کل کے عہدہ پر فائز تھے عالمگیر نے انھیں اپنے بڑے بیٹے شہاب الدین کو سمرقند سے ہندوستان بلانے کا حکم دیا چنانچہ خواجہ عابد کے بڑے صاحبزادے شہاب الدین کو ۱۶۶۹ء میں ہندوستان طلب کیا۔ عالمگیر نے انہیں منصب سہ صدی ذات سے سرفراز کیا اور اس ۲۰ سالہ نوجوان کا عقد شاہجہاں کے وزیر سید سعد اللہ خاں کی صاحبزادی سے انجام دیا۔

شہاب الدین نے اورنگ زیب کے عہد میں اپنی وفاداری، بہادری اور قابلیت سے متعدد اعزاز حاصل کیے۔ ۱۶۸۱ء میں بادشاہ نے انہیں خطاب "خان" عطا کیا۔ ۱۶۸۲ء میں جنجیرہ رام سیج اور کونکن کے معرکوں میں کامیابی پر "غازی الدین خاں بہادر" کا خطاب عالمگیر نے عطا کیا۔ ۱۶۸۵ء میں جب انہوں نے مرہٹوں کے عظیم ترین مرکز قلعہ راہیر کی تسخیر میں شاندار کارنامے انجام دیئے پر شہنشاہ نے سابقہ خطابات میں نہ صرف "فیروز جنگ" کے خطاب کا اضافہ کیا بلکہ ماہی و مراتب کا اعزاز بخشا۔ ۱۶۸۶ء میں محاصرہ بیجاپور کے دوران شہزادہ محمد اعظم کو مصیبت میں جبکہ مغل فوجوں کے پاؤں اکھڑنے ہی کو تھے غازی الدین خاں بہادر

---

[1] عظیم الدین محمد "مختصر تاریخ مملکت آصفیہ" صفحہ ۹۵-۹۶ مقالہ مشمولہ مملکت آصفیہ جلد اول مرتبہ ڈاکٹر محمد عبد الحئی۔ سنہ اشاعت ۱۹۷۸ء

نے عین موقع پر امداد پہنچائی، عالمگیر بہت خوش ہوا اور جب بیجاپور فتح ہوا تو انھیں "فرزند ارجمند" کے خطاب سے نوازا۔ ۱۶۸۶ء میں غازی الدین خاں فیروز جنگ محاصرہ و فتح گولکنڈہ میں بھی کارہائے نمایاں انجام دیے۔ جب قلعہ گولکنڈہ فتح ہوگیا تو انھیں عالمگیر نے ہفت ہزاری کا منصب عطا کیا۔

۱۶۸۹ء میں فیروز جنگ بیجاپور میں سکونت پذیر تھے کہ وہاں طاعون پھیل گیا۔ فیروز جنگ اس وباء سے تو بچ گئے لیکن بصارت سے محروم ہوگئے لیکن اس بہادر باپ کے بہادر بیٹے نے اس حالت میں بھی فوج کی قیادت کا کام مستعدی سے انجام دیا۔

بینائی جانے کے بعد بھی فیروز جنگ نے جنگی مہموں میں برابر اپنی فوج کی کمان سنبھالی چنانچہ نیماجی سندھیا نے جب مالوے میں سر اٹھایا تو فیروز جنگ نے اسے پے بہ پے تعاقب سے ایسا تنگ کیا کہ شاہی ملازمت قبول کرتے ہی بنی۔" [1]

اورنگ زیب عالمگیر کے ۱۷۰۷ء میں انتقال کے بعد جب اس کے بیٹوں میں خانہ جنگی ہوئی تو غازی الدین خاں فیروز جنگ نے غیر جانبدار ہی رہنا مناسب سمجھا۔ شہزادہ معظم نے اس خانہ جنگی میں فتح حاصل کی اور بہادر شاہ کے لقب سے تخت مغلیہ پر بیٹھا۔ اس نے فیروز جنگ کو گجرات کا

---

[1] یوسف حسین خاں "تاریخ دکن عہد عالیہ" سنہ اشاعت ۱۹۳۷ء

صوبہ دار مقرر کیا۔

فیروز جنگ نے ۸ ردسمبر ۱۷۱۰ء کو گجرات ہی میں انتقال کیا۔ اُن کا جنازہ دہلی لایا گیا اور اجمیری دروازہ کے متصل اُن ہی کی بنائی ہوئی خانقاہ (نزد مزار شاہ وجیہہ الدینؒ) میں تدفین عمل میں آئی۔

فیروز جنگ کی شخصیت اور کردار کا محاکمہ کرتے ہوئے عظیم الدین محبت لکھتے ہیں:

"خان فیروز جنگ کے کردار و شخصیت کی ایک قابل ذکر خصوصیت یہ ہے کہ باوجود نابینائی کے بادشاہ نے ان کی موجودگی میں کسی دوسرے کو سرداری اور فوج کشی کا کام سپرد نہیں کیا۔ تاریخ عالم میں ایسی مثال ملنا محال ہے" [له]

غازی الدین خان بہادر فیروز جنگ ۱۶۶۹ء میں جب ہندوستان تشریف لائے عالمگیر نے اُن کا عقد سعد اللہ خان کی صاحبزادی سعید النساء بیگم سے انجام دیا۔ اسی بیگم سے انہیں ۱۱ر اگست ۱۶۷۱ء کو ایک لڑکا تولد ہوا۔ عالمگیر نے اس نومولود کا نام "میر قمر الدین" قرار دیا۔ میر کا اضافہ شہنشاہ کی طرف سے اس بنا پر کیا کہ نومولود کی ماں سیدانی

له عظیم الدین محبت مقالہ محولہ بالا ص ۹۸

ہیں۔ نومولود کا تاریخی نام "نیک بخت" (۱۰۸۲ھ م ۱۶۷۱ء) ہے۔ یہی "نیک بخت" بعد ازاں نظام الملک آصف جاہ اول کے نام سے مشہور ہوا اور دکن میں آصفیہ سلطنت کی داغ بیل ڈالی۔

نظام الملک آصف جاہ اول کا سلسلہ نسب سترہ ۱۷ واسطوں سے شیخ الشیوخ حضرت شہاب الدین سہروردیؒ سے ہوتا ہوا بتیسویں پشت میں خلیفہ اول حضرت ابو بکر صدیقؓ سے جا ملتا ہے۔

سلسلۂ نسب شاہان آصفیہ[1]

از حضرت سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ تا شیخ شہاب الدین سہروردیؒ

شیخ الشیوخ عارف ربانی حضرت شہاب الدین حفص عمر بن محمد سہروردیؒ کا سلسلۂ نسب حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفۂ اول حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے۔ علماء تاریخ نے بعض ناموں میں اختلاف کیا ہے۔ ایک مستند تاریخ میں حسب ذیل اسماء واعلام درج ہیں:

---

[1] ماخوذ از مملکت آصفیہ صفحہ ۸۹ جلد اول مرتبہ ڈاکٹر محمد عبدالحقؒ بار اول

امیر المومنین حضرت سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ
↓
ابو محمد مکی
↓
ابوالقاسم مکی
↓
عبدالرحمٰن مکی
↓
عبداللہ بصری
↓
محمد قاسم کشتکی
↓
ناصرالدین بصری
↓
قاسم علی رومی
↓
محمد سعید کشتکی
↓
عبداللہ صوفی
↓
عبدالرزاق بغدادی
↓
عبداللہ بغدادی
↓
محمد بہاؤ الدین بغدادی
↓
شیخ محمد بغدادی
↓
شیخ الشیوخ شہاب الدین سہروردی

سلسلۂ نسب شاہان آصفیہ [1]

از شیخ شہاب الدین سہروردی تا نواب نظام الملک آصف جاہ اول

شیخ الشیوخ عارف ربانی شہاب الدین ابو حفص عمر بن محمد سہروردی

↓

ابو محمد حافظ

↓

زین العابدین قطب الاقطاب

↓

شیخ علاؤ الدین

↓

شیخ تاج الدین

↓

شیخ فتح اللہ اول

↓

شیخ نجیب اللہ

↓

شیخ فتح اللہ ثانی

↓

شیخ جاوید سرمست

↓

شیخ فتح اللہ ثالث

↓

شیخ جاوید ثانی

↓

محمد درویش

---

[1] ماخوذ از مملکت آصفیہ ص ۸۹ جلد اول مرتبہ ڈاکٹر محمد عبد الحی اشاعت بار اول

↓

شیخ محمد مومن

↓

محمد عالم شیخ صدیقی علوی

↓

خواجہ عزیز اللہ

↓

خواجہ میر اسمٰعیل

↓

میر عابد قلیچ خاں

↓

شیخ شہاب الدین الملقب بہ
غازی الدین فیروز جنگ

↓

میر قمر الدین چن قلیچ خاں
نظام الملک آصف جاہ اول

مملکت آصفیہ اور اس کے حکمراں بہ یک نظر

آصف جاہ اول تا آصف جاہ سابع ؎۱

سلسلہ نمبر	نام	ولادت	جلوس	وفات
۱	حضرت مغفرت مآب میر قمر الدین خاں نظام الملک آصف جاہ اول بانی سلطنت آصفیہ	سنہ ۱۰۸۲ھ م سنہ ۱۶۷۱ء	سنہ ۱۱۳۷ھ م سنہ ۱۷۲۴ء	۴ جمادی الآخر سنہ ۱۱۶۱ھ م سنہ ۱۷۴۸ء
۲	نواب میر احمد خاں نظام الدولہ ناصر جنگ شہید	۱۸ محرم سنہ ۱۱۲۴ھ م سنہ ۱۷۱۲ء	۹ جمادی الآخر سنہ ۱۱۶۱ھ م سنہ ۱۷۴۸ء	۱۷ محرم سنہ ۱۱۶۴ھ م سنہ ۱۷۵۰ء
۳	نواب ہدایت محی الدین خاں مظفر جنگ	نامعلوم	۱۷ محرم سنہ ۱۱۶۴ھ م سنہ ۱۷۵۰ء	۱۷ ربیع الاول سنہ ۱۱۶۴ھ م سنہ ۱۷۵۰ء
۴	سید محمد خاں امیر الممالک صلابت جنگ آصف الدولہ	سنہ ۱۱۳۰ھ	۱۸ ربیع الاول سنہ ۱۱۶۴ھ م سنہ ۱۷۵۰ء	۲۰ ذی الحجہ سنہ ۱۱۷۵ھ م سنہ ۱۷۶۱ء
۵	حضرت غفراں مآب میر نظام علی خاں نظام الدولہ نظام الملک آصف جاہ ثانی	شوال سنہ ۱۱۴۶ھ م سنہ ۱۷۳۳ء	۴ ذی الحجہ سنہ ۱۱۷۵ھ م سنہ ۱۷۶۱ء	۱۷ ربیع الآخر سنہ ۱۲۱۸ھ م سنہ ۱۸۰۳ء
۶	حضرت مغفرت مآب میر اکبر علی خاں فولاد جنگ سکندر جاہ آصف جاہ ثالث	شوال سنہ ۱۱۸۲ھ م سنہ ۱۷۶۵ء	۲۲ ربیع الآخر سنہ ۱۲۱۸ھ م سنہ ۱۸۰۳ء	۱۷ ذیقعدہ سنہ ۱۲۴۴ھ م سنہ ۱۸۲۸ء
۷	حضرت غفراں منزل میر فرخندہ علی خاں ناصر الدولہ آصف جاہ رابع	۲۴ رمضان سنہ ۱۲۰۸ھ م سنہ ۱۷۹۳ء	۲۰ ذیقعدہ سنہ ۱۲۴۴ھ م سنہ ۱۸۲۸ء	۲۲ رمضان سنہ ۱۲۷۳ھ م سنہ ۱۸۵۷ء
۸	حضرت مغفرت مکاں میر تہنیت علی خاں افضل الدولہ آصف جاہ خامس	۲۰ ربیع الاول سنہ ۱۲۴۳ھ م سنہ ۱۸۲۷ء	۲۴ رمضان سنہ ۱۲۷۳ھ م سنہ ۱۸۵۷ء	۱۳ ذیقعدہ سنہ ۱۲۸۵ھ م سنہ ۱۸۶۸ء

؎۱ ماخوذ از آصف نامہ، مملکت آصفیہ
و رسالہ "شاداب" "حیدرآباد"
(آصفجاہی نمبر بابت مئی سنہ ۱۹۹۰ء)

۹	حضرت غفران مکان میر محبوب علی خاں آصف جاہ سادس	۱۷ ربیع الآخر سنہ ۱۲۸۳ھ م ۱۸۶۶ء	۱۳ ذیقعدہ سنہ ۱۲۸۵ھ سنہ ۱۸۶۸ء	۶ رمضان سنہ ۱۳۲۹ھ م ۱۹۱۱ء
۱۰	میر عثمان علی خاں آصف جاہ سابع	جمادی الآخر سنہ ۱۳۰۲ھ م ۱۸۸۵ء	۷ رمضان سنہ ۱۳۲۹ھ م ۱۹۱۱ء	۱۶ ذیقعدہ سنہ ۱۳۸۶ھ م ۱۹۶۷ء

شجرۂ حکمرانانِ مملکتِ آصفیہ بہ یک نظر

میر قمر الدین خاں نظام الملک آصف جاہ اول

- میر احمد خاں ناصر جنگ شہید
- سید محمد خاں صلابت جنگ
- میر نظام علی خاں آصف جاہ ثانی
  - میر اکبر علی خاں سکندر جاہ آصف جاہ ثالث
    - میر فرخندہ علی خاں ناصر الدولہ آصف جاہ رابع
      - میر تہنیت علی خاں افضل الدولہ آصف جاہ خامس
        - میر محبوب علی خاں آصف جاہ سادس
          - میر عثمان علی خاں آصف جاہ سابع
            - میر حمایت علی خاں اعظم جاہ
              - میر برکت علی خاں مکرم جاہ
            - میر شجاعت علی خاں معظم جاہ
- خیر النساء بیگم
  - مظفر جنگ

ناصر جنگ کو دھوکے سے شہید کرنے کے بعد آصف جاہ اول کے نواسے "خیر النساء کے "سپوت" ہدایت محی الدین خاں مظفر جنگ کے لقب کے ساتھ سریر آرائے سلطنت ہوئے۔ مورخین نے ناصر جنگ کی تاریخ شہادت کہی۔

"آفتاب رفت" اور "حسن خاتمہ"

۱۱۶۴ھ ۱۱۶۴ھ

مظفر جنگ ابھی دارالسلطنت اورنگ آباد پہنچ بھی نہ پائے کہ انھیں کے "دوستوں" نے ۱۷ ربیع الاول ۱۱۶۴ھ کو قتل کر دیا۔ آصف جاہ اول کے چوتھے فرزند میر نظام علی خاں نے اپنے بڑے بھائی سید محمد خاں صلابت جنگ کے لقب سے مسند نشین کیا۔

صلابت جنگ کے زمانۂ حکومت میں دکن انگریزوں اور فرانسیسیوں کی طاقت آزمائیوں کی آماجگاہ بن چکا تھا۔ اُدھر مرہٹے اپنی طاقت بڑھا رہے تھے نتیجہ یہ ہوا کہ ناصر جنگ شہید کے انتقال کے صرف دس برس بعد آصف جاہ اول کے خون سے سینچی ہوئی سلطنت آصفیہ

کا ایک تہائی سے زیادہ علاقہ نواب صلابت جنگ کے
اقتدار سے الگ ہو چکا تھا ۔

آصف جاہ اول کے چوتھے فرزند میر نظام علی
خاں نے اپنے والد بزرگوار کی سلطنت کے بگڑتے
حالات کا بغور جائزہ لے رہے تھے کہ انھیں
سنہ ۱۱۷۵ھ م سنہ ۱۷۶۱ء میں مغل شہنشاہ شاہ عالم
کا فرمان وصول ہوا

"جس کی رو سے میر نظام علی خاں
کو مناسب و خطابات کے ساتھ
صوبہ دار دکن مقرر کیا تھا ۔" [1]

صوبہ داری کا فرمان وصول ہوتے ہی میر نظام علی خاں
نے صلابت جنگ کو معزول کر کے بیدر کے قلعہ میں قید کر دیا ۔

---

[1] "مملکت آصفیہ" ص ۱۲۹

نظام علی خاں "آصف جاہ ثانی" کے لقب کے ساتھ ۱۱۷۳ھ میں تخت نشین ہوئے اور ۱۱۸۵ھ میں اورنگ آباد کی جگہ شہر حیدرآباد سلطنت آصفیہ کا دارالحکومت قرار پایا۔

آصفجاہ ثانی کے زمانے کے باکمالوں میں لچھمی نارائن شفیق کا نام ملتا ہے جنھوں نے "گل رعنا" "شام غریباں"، "مآثر آصفی"، "تنمیق شگرف"، "احوال حیدرآباد" "بساط الغنائم" اور "چمنستان الشعراء" جیسی تصانیف اپنی یادگار چھوڑیں۔ میر عبدالحئی خاں صمصام الملک صارم، شفیق ہی کی طرح اردو اور فارسی کے شاعر تھے۔ عبدالولی عزلت، اس عہد ایک باکمال فنکار تھے، موسیقی مصوری اور شاعری (اردو و فارسی) میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ اورنگ آباد پہونچے تو ناصر جنگ نے تعظیم وتکریم کی، اُن کی وفات کے بعد حیدرآباد کا رخ کیا اور آخر تک حیدرآباد ہی میں رہے۔ ۱۱۸۹ھ میں وفات پائی اور دائرہ میر مومن میں مدفون ہوئے۔ اردو اور فارسی دیوان کے علاوہ اردو میں پہلی "راگ مالا" مثنوی آپ کی یادگار ہے۔ عارف الدین خاں عاجز، نجم الدین پنچھی، سید محمد موسیٰ والہ، گردھاری لال احقر، مرزا جمال اللہ عشق نے بھی حیدرآباد کا رخ کیا۔ حیدرآباد میں نوازش علی خاں شیدا نے اسی زمانے میں روضۃ الاطہار اعجاز احمدی اور گلشن ایمان لکھی۔ شاہ تجلی بھی اسی عہد سے تعلق رکھتے ہیں۔ انہوں نے فارسی میں اپنے عہد کی تاریخ "تزک آصفیہ" لکھی۔ اردو کا پہلا تذکرہ "گلشن ہند" لکھنے والے مرزا علی لطف دہلوی اسی زمانے میں حیدرآباد آئے۔ لطف ہی کی طرح میر قمر الدین منت بھی دہلی سے حیدرآباد آئے اور آصف جاہ ثانی

کی مدح میں قصیدہ لکھا۔

دکن میں جب فرانسیسی اور انگریزی کی آپسی کشمکش کے علاوہ دکن میں اپنے اقتدار کے لیے انگریزوں کی تگ و دو کا عہد ہے۔ دوسری طرف مرہٹے، حیدر علی و ٹیپو سلطان اپنی اپنی سلطنت کو استحکام بخشنے میں مصروف ہیں۔ نظام علی خاں نے انگریزوں سے معاہدہ کرلیا۔ ادھر سراج الدولہ کی شکست کے بعد حیدر علی نے انگریزوں کو ہندوستان سے نکال باہر کرنے کا بیڑہ اٹھایا ہے۔ ابتداء میں آصف جاہ ثانی نے حیدر علی کو اس کے مقاصد میں کامیابی حاصل کرنے میں مدد دی لیکن جب انگریزوں نے اپنی عیاری کے ذریعہ مرہٹوں کو ملا کر نظام علی خاں آصف جاہ ثانی کے ساتھ "Triple Alliance" معاہدہ کیا تو نظام علی خاں میسور کے خلاف ہو گئے۔ آخر کار ۱۱۹۹ھ میں سلطان میسور، ٹیپو انگریزوں کا مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہو گئے۔ اسی زمانے میں ارسطو جاہ نے سلطنت آصفیہ کی نظامت سنبھالی۔ ۱۲۱۸ھ میں نظام علی خاں آصف جاہ ثانی نے وفات پائی۔ اس وقت شیر محمد خاں ایمان حیدر آباد کے سب سے بڑے شاعر سمجھے جاتے تھے انھیں کا کہا ہوا قطعہ تاریخ آصف جاہ ثانی کے لوح مزار پر کندہ کروایا گیا۔ ارسطو جاہ نے ۱۲۱۹ھ میں وفات پائی اور ۱۲۲۰ھ میں ایمان نے انتقال کیا۔

ایمان کے شاگردوں میں محمد صدیق قیس اور ماہ لقا بائی چندا
نے آنے والے عہد میں استناد پایا ۔

۱۲۱۸ھ میں میر اکبر علی خاں سکندر جاہ تخت نشین ہوئے

(۱۲۱۸ھ - ۱۲۴۴ھ) ارسطو جاہ کی وفات کے بعد میر عالم دیوان
بنائے گئے ۔ میر عالم ۱۲۲۳ھ میں وفات پائی ۔ اُن کے بعد منیر الملک
دیوان بنے ۔ اسی زمانے میں ماہ لقا بائی چندا کی خواہش پر منشی
غلام حسین خاں جوہر نے "ماہ نامہ" فارسی میں مرتب کیا (۱۲۲۵ھ)
چندا کا دیوان طبع ہو چکا ہے ۔ اس نے ۱۲۴۴ھ میں وفات پائی ۔
سکندر جاہ نے ۱۲۴۴ھ میں وفات پائی ۔ انہوں نے حیدرآباد سے
قریب حسین ساگر کی دوسری جانب ایک نیا شہر "سکندرآباد"
بسایا ۔ ابتداء ہی سے یہاں انگریزوں کی رہائش قرار پائی علاوہ
ازیں افواج کی چھاونی بھی اسی شہر میں بنائی گئی تھیں ۔ سکندر جاہ
کے بعد ناصر الدولہ آصفجاہ رابع تخت نشین ہوئے (۱۲۴۴ھ - ۱۲۷۳ھ) ۔
منیر الملک کی وفات کے بعد آصف جاہ رابع نے راجہ رایاں چندو لال
کو مدار المہام بنایا ۔ اس زمانے میں انگریزوں کی حکومت سارے ہندوستان
میں ہو گئی تھی ۔ ۱۸۵۶ء میں سلطنت اودھ کا الحاق کر لیا گیا تھا اور
تمام ہندوستان میں ایک عام بے چینی پائی جاتی تھی ۔ حیدرآباد میں بھی

عوام ایک طرح کے ہیجان میں مبتلا تھے اور انگریزوں کے خلاف عام طور پر نفرت پائی جاتی تھی۔ ناصر الدولہ اور چندو لال نے اپنی دور اندیشی سے عوام اور انگریزوں کو تصادم سے دور رکھا۔

چندو لال شاعر بھی تھے۔ شاداں تخلص تھا۔ وہ شاعر ہی نہ تھے شاعر نواز بھی تھے۔ اُن کے عہدِ وزارت میں انھوں نے شاہ نصیر، شاہ حفیظ اور ذوقؔ کو حیدرآباد آنے کی دعوت دی۔ شاہ نصیر اور شاہ حفیظ تو حیدرآباد آئے لیکن ذوق نے ذیل کے شعر کے ساتھ معذرت کرلی ؎

گرچہ ہے ملکِ دکن آجکل قدرِ سخن
کون جائے ذوقؔ پر دلی کی گلیاں چھوڑ کر

میر حسین علی خاں ایمانؔ اورنگ آبادی، علی عباس علی کافی اس عہد کے مشہور شعراء ہیں۔ اسی زمانے میں منشی قادر خاں بیدری نے دکن کی مبسوط تاریخ چھ جلدوں میں لکھی اور دکن کے مذاہب پر بزبان فارسی "مراۃ المذاہب" مرتب کی۔

حافظ میر شجاع الدین حسینؔ حیدرآباد میں مشہور

صوفی ہوئے ہیں جن کی خانقاہ اور مسجد چار مینار کے دامن میں آج بھی موجود ہے۔ آپ نے مختلف موضوعات پر پندرہ[15] کتابیں تصنیف کی۔ اسی زمانے میں محمد علی الفت نے دو مثنویاں لکھی۔ سید حسین علی خاں نے نثر میں تین قصے تصنیف کیے۔ "قصہ کامروپ" "قصہ چار درویش" اور "ہمیشہ بہار"۔

چند وولال کے بعد شمس الامراء کا عہد حیدرآباد کی ادبی تاریخ کا روشن باب ہے۔ آصف جاہ رابع نے ۱۲۷۳ھ میں انتقال کیا۔ مرنے سے قبل انہوں نے میر تراب علی خاں سالار جنگ مختار الملک کو حیدرآباد کا دیوان مقرر کیا۔ آصف جاہ رابع کے بعد افضل الدولہ آصف جاہ خامس (۱۲۷۳ھ تا ۱۲۸۵ھ) تخت نشین ہوئے۔ افضل گنج، افضل گنج کا پل، افضل گنج کا چمن انہی کے زمانے کی یادگاریں ہیں۔ اس زمانے میں ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی لڑی گئی۔ طرہ باز خاں نے حاجی علاء الدین کے ہمراہ انگریزوں کو حیدرآباد اور سلطنت آصفیہ سے نکال باہر کرنے کی سعیٔ بلیغ کی۔ حکمراں طبقہ نے انگریزوں کا ساتھ دیا۔ مجاہدین کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ بعد ازاں حاجی علاء الدین کو کالے پانی

سزاء سنائی گئی اور طرہ باز خاں کو پھانسی دی گئی ۔

اس زمانے میں محبوب نوازونت باقی، حکیم منظفر الدین خاں مزاج، رمز، میر احمد علی عصر، رضی الدین حسن کیفی، لقمان الدولہ دل، مجو لال تمکین اور محمد حفیظ الدین پاس (استاد شاہ) ممتاز شعراء تھے۔ اسی زمانے میں حبیب اللہ ذکا، شاگرد غالب نے بھی حیدرآباد کو اپنا مسکن بنایا اور ذکا کے وسیلے سے غالب نے حیدرآباد آنے کی سعی و جستجو کی ۔

اس عہد کے حیدرآباد میں آغا محمد داؤد صحو الوالعلائی، شاہ خاموش، افتخار علی شاہ وطن اور مسکین شاہ مسکین صوفی شعراء موجود تھے ۔

۱۲۸۵ھ میں میر محبوب علی خاں تین برس کی عمر میں افضل الدولہ کی وفات کے بعد تخت نشین ہوئے۔ رام پور سے داغ اور امیر مینائی حیدرآباد آئے۔ کشن پرشاد صدر المہام تھے۔ شعر و شاعری کا خوب چرچا ہونے لگا۔ بادشاہ وقت خود بھی شاعر تھے آصف تخلص تھا۔ نظم طباطبائی، جلیل مانکپوری

سید علی بلگرامی عماد الملک، وقار الملک جیسے علماء و روسا نے اس عہد کو تابناک بنایا۔ شبلی، حالی، عبد الحق، عنایت اللہ، نذیر احمد، رشید احمد، ظفر علی خاں، شرر اور سرشار جیسے اردو کے ادیب و شاعر اس عہد محبوبیہ کے آفتاب و مہتاب تھے۔

میر محبوب علی خاں آصف جاہ سادس نے ۱۸۹۲ء میں اردو کو سلطنت آصفیہ کی سرکاری زبان قرار دیا۔ ۱۹۱۱ء میں محبوب علی خاں کا انتقال ہوا۔ میر عثمان علی خاں نے تخت سلطنت پر جلوس کیا۔ علم و ادب کی ایسی خدمت کی، حیدرآباد میں تعلیم کو عام کرنے میں اس قدر اہم اور عظیم کردار ادا کیا کہ عثمانیہ یونیورسٹی کے ارباب مجاز اور طالب علموں نے انھیں "سلطان العلوم" کا خطاب دیا۔

نواب میر عثمان علی خاں ۱۹۱۱ء میں تخت نشین ہوئے۔ تین برس بعد انہوں نے نظم و نسق کو خود اپنے ہاتھ میں لے لیا اور ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۹ء تک سلطنت کے تمام کاروبار پر اُن کا راست تسلط قائم رہا۔ اسی اثناء میں ۱۹۱۸ء میں "ہندو سوشیل سرویس کانفرنس" قائم ہوئی۔ جس کا مقصد دراصل سماجی خدمات تھا

لیکن بہت جلد اس نے سیاسی صورت اختیار کرلی۔ اس سلسلے میں
کے کرشنا سوامی مدیراج لکھتے ہیں:

"ہندو سوشیل سرویس کانفرنس بہ ظاہر
ایک سماجی ادارہ تھا۔۔۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ
اس نے عوام میں سیاسی بیداری پھیلانے کا اچھا
کام انجام دیا اور اس کے ذریعہ حکومت سے تعلیمی
مطالبات بھی کئے گئے" [1]

میر محبوب علی خاں کے عہد میں جامعہ نظامیہ کا قیام عمل میں
آیا تھا اور پھر دائرۃ المعارف ۱۳۰۷ھ م ۱۸۸۹ء میں قائم
کیا گیا۔ اس طرح حیدرآباد میں یوں بھی پہلے ہی سے تعلیم کو عام
کرنے کا عمل شروع ہو چکا تھا۔ نظام کالج کامیابی سے درس و
تدریس کا فرض انجام دے رہا تھا۔ ایسے میں "تعلیمی مطالبات" چہ
معنی دارد؟۔ دراصل نظام کی حکومت کو کمزور کرنا اور مملکت
میں انتشار پھیلانا "ہندو سوشیل سرویس" کا سیاسی پروپگنڈہ
تھا۔ جس کی جانب کرشنا سوامی مدیراج "جی" نے دبی زبان میں
اعتراف و اشارہ کیا ہے۔ میر عثمان علی خاں نے ۱۹۱۹ء میں

---

[1] کے کرشنا سوامی مدیراج "حیدرآباد کی تیس سالہ سیاسی جدوجہد" ص ۱۶
سنہ اشاعت ندارد

نظم ونسق سے اپنا راست تسلط اٹھاتے ہوئے Executive Council قائم کی اور بعد ازاں مملکت کے تمام اختیارات کونسل کو تفویض کردیے ۔

حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس (جس کا قیام ۱۹۱۳ء میں عمل میں آیا تھا) نے اپنے مقاصد میں قلمرو آصفی میں ایک جامعہ کے قیام کی تحریک شروع کی تھی۔ ویسے جامعہ کی تجویز عہد محبوبیہ میں بھی پیش کی گئی تھی لیکن اس پر عمل درآمد نہ کیا جاسکا۔ حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کا پہلا اجلاس معتمد تعلیمات سر اکبر حیدری کی صدارت میں ٹاؤن ہال باغ عامہ میں ۱۹۱۵ء میں منعقد ہوا ۔ اس عہد کے تمام ممتاز دانشوروں نے اس کانفرنس میں حصہ لیا جن میں بلبل ہند سروجنی نائیڈو، مسٹر وامن نائک، کیشو راؤ، نواب عماد الملک، سر حیدر نواز جنگ، بیرسٹر اکبر علی خاں اور پروفیسر سید علی اکبر قابل ذکر ہیں۔ کانفرنس نے سر اکبر حیدری کی موجودگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جامعہ عثمانیہ کے قیام کی کامیاب تحریک پیش کی۔ جامعہ تو قائم نہ ہوئی لیکن امید ضرور بن گئی ۔ حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کا دوسرا سالانہ اجلاس اورنگ آباد

میں منعقد ہوا۔ تمام شرکاء نے جامعہ کے قیام کے مطالبہ کو شدت سے دہرایا اور آخرکار ۱۷ اپریل ۱۹۱۷ء کو سر اکبر حیدری نے اعلیٰ حضرت میر عثمان علی خاں کی خدمت میں ایک عرضداشت پیش کی اور اعلیٰ حضرت نے ۲۶ اپریل ۱۹۱۷ء کو جو حُسنِ اتفاق سے نواب میر عثمان علی خاں کا یوم پیدائش بھی تھا۔ جامعہ کے قیام کا فرمان جاری کیا اور جامعہ کا نام "جامعہ عثمانیہ" قرار دیا گیا۔ اُردو جامعہ میں تعلیم اُردو ذریعہ دی جانے والی تھی اس لیے دارالترجمہ کا قیام بھی جامعہ کے ساتھ ہی عمل میں آیا اور ۱۶ ستمبر ۱۹۱۷ء کو دارالترجمہ کا باضابطہ قیام عمل میں آیا۔

ترجمہ کے دوران سب سے اہم اور مشکل مسئلہ اُردو اصطلاحات وضع کرنا تھا۔ اس مقصد کے لیے دارالترجمہ کی ایک شاخ "مجلس وضع اصطلاحات" قائم کی گئی تھی۔ اس مجلس میں زبانوں ولسانیات نیز علم وفنون کے ماہر شریک تھے۔ اس مجلس نے اصطلاحات وضع کرنے کے اصول بنا لیے تھے اور ان ہی اصول کی پیروی میں الفاظ بنائے جاتے تھے۔

مجلس وضع اصطلاحات نے ۱۹۳۹ء تک مختلف علوم وفنون
کی پچپن ہزار اصطلاحیں تیار کرلی تھیں۔ بعد ازاں مزید
دس سال اس مجلس نے یہی کام انجام دیا۔ وضع اصطلاحات
کے علاوہ دارالترجمہ میں مختلف علوم وفنون کی کتابیں بھی اردو
میں ترجمہ کی جاتی تھیں۔ شفیعہ قادری[1] نے دارالترجمہ میں ترجمہ
کتابوں کی تعداد ۳۸۸ بتائی ہیں جبکہ حامد لطیف ملتانی[2] نے
دارالترجمہ میں ترجمہ کردہ کتابوں اور مترجم حضرات کا ایک
جدول اپنی تصنیف میں درج کیا ہے جس میں ترجمہ کردہ
کتابوں کی تعداد ۳۸۲ اور مترجم حضرات کی تعداد ۱۲۹
بتاتے ہیں۔ دارالترجمہ کے پہلے ناظم مولوی عبدالحق تھے اور
آخری ناظم الیشورناتھ ٹوپا تھے۔ دارالترجمہ کی خدمات کو
سراہتے ہوئے گلزار زتشی دہلوی لکھتے ہیں:

"۱۹۱۷ء سے ۱۹۴۷ء تک ایک باقاعدہ
اور منظم اعلیٰ پیمانے اور بلند معیار کی کوشش

---

[1] شفیعہ قادری "حیدرآباد کے علمی اور ادبی ادارے" ص ۲۷ سنہ اشاعت دسمبر ۱۹۸۳ء

[2] حامد لطیف ملتانی قادری "سلطان العلوم اور ان کی علمی خدمات" ص ۳۶ سنہ اشاعت دسمبر ۱۹۹۳ء

نظام حیدرآباد کے ایماء پر دارالترجمہ اور
دارالاشاعت حیدرآباد فرخندہ بنیاد
میں ہوئی۔ جہاں زبان و فلسفہ کے علمی و
ادبی عالی دماغ جمع کیے گئے۔ وہیں اس کے
ساتھ ساتھ سائنسی علوم و کتب کا ترجمہ
اور اصطلاحات سائنس کا ترجمہ بڑے
پیمانے پر عمل پذیر ہوا۔ کیمیاء، نباتات،
ادویات، نجوم، ہیئت، ریاضی، حساب و
ہندسہ، جغرافیہ، علم الارض، علم الحیوانات
انجینیرنگ وغیرہ بے شمار سائنسی علوم
کی کتب کا ترجمہ کے ترجمے کیے گئے، اصطلاح
سازی ہوئی۔" ۱؎

دارالترجمہ میں ترجمہ اور وضع اصطلاحات کا
کا کام ۱۹۱۸ء میں شروع ہو چکا تھا۔ جامعہ عثمانیہ

۱؎ گلزار زتشی دہلوی "اردو سائنسی صحافت" مضمون مشمولہ "اردو صحافت"
مرتبہ انور علی دہلوی ص ۲۸۶
سنہ اشاعت ۱۹۸۷ء

کی تعلیم کا آغاز ۱۹۱۹ء میں انٹرمیڈیٹ کی جماعت سے ہوا۔ ۱۹۲۲ء میں ایم۔اے اور ایل ایل بی کی جماعتیں شروع کی گئیں۔ ایک برس بعد میڈیکل اسکول اور انجنیرنگ اسکول کو کالج کا درجہ دیا گیا اور جامعہ عثمانیہ سے الحاق کر دیا گیا۔ اسی برس ریاست کے تین اضلاع ورنگل، گلبرگہ اور اورنگ آباد میں انٹرمیڈیٹ کالج شروع کئے گئے۔ ۱۹۳۴ء میں جامعہ موجودہ کیمپس میں منتقل ہو گئی۔ قبل ازیں گن فاونڈری علاقہ میں مختلف عمارتوں میں جامعہ کام کر رہی تھی۔ نواب زین یار جنگ مشہور آرکیٹکٹ کی نگرانی میں آرٹس کالج کی عمارت تیار ہوئی جو اپنی مثال آپ ہے۔ ۱۹۳۸ء میں جامعہ عثمانیہ کیمپس کا افتتاح سلطان العلوم کے ہاتھوں عمل میں آیا۔

۱۹۱۹ء کے بعد جامعہ عثمانیہ، دارالترجمہ، تعلیمی میدان میں اپنی ارتقاء کا سفر شروع کیا ادھر ۱۹۱۹ء کے بعد ہندوستان کی جنگ آزادی میں اہم موڑ "خلافت تحریک" کی صورت میں نمودار ہوا۔ ۱۹۲۲ء تک خلافت تحریک نے علی برادران اور مہاتما گاندھی کی قیادت میں غیر معمولی مقبولیت حاصل کر چکی تھی اور قومی یک جہتی

کا مظاہرہ جب اس تحریک کے عملی طور پر اس زمانے میں سامنے
آیا وہ ہندوستان کی تاریخ کا روشن ترین باب ہے۔ حیدرآباد
میں بھی اس تحریک کا اثر ہوا چنانچہ V.V.Tilak کے میدان میں
مولوی عبدالقیوم وکیل کی قیادت و صدارت میں ایک عظیم الشان
جلسہ منعقد ہوا جو حیدرآباد کی تاریخ کا ایک مثالی اجتماع تھا
حالانکہ حکومت نظام اور رزیڈنسی نے اپنی تمام تر سختی
اس جلسہ کو ناکام بنانے کے لیے لگا چکی تھی لیکن جلسہ ہوا اور
کامیاب ہوا۔ اس جلسہ کے بارے میں کرشنا سوامی مدیراج
لکھتے ہیں:

"یہ جلسہ راکھی پونم کے موقع پر ہوا تھا
اس لیے ہندوؤں نے صدر جلسہ کے ہاتھ پر
راکھی باندھ دی جو اتحاد و محبت کا مظہر تھا۔
صدر محترم نے اپنے بھائیوں کے اس خلوص و
محبت پر اظہار تشکر کرتے ہوئے اعلان
کیا کہ مسلمان اس راکھی کی لاج رکھیں
جو درحقیقت محبت و اتحاد کا ناقابل شکست
پیمان ہے۔" [1]

---

[1] کے کرشنا سوامی مدیراج "حیدرآباد کی تیس سالہ سیاسی جدوجہد" صفحہ ۲۸

خلافت تحریک کے بعد سارے ہندوستان میں قومی یک جہتی کو فروغ ہوا تھا۔ حیدرآباد میں منعقد ہونے والا یہ جلسہ بھی خلافت تحریک ہی کا ایک جز تھا۔ خلافت تحریک کے روح رواں مولانا محمد علی جوہر تھے۔ شاید اسی وجہ سے کاکناڈا میں ۱۹۲۳ء میں ہونے والے کانگریس کے سالانہ اجلاس کی صدارت محمد علی جوہر ہی نے کی تھی۔ اس سالانہ اجلاس سے قبل بلبل ہند سروجنی نائیڈو پر حکومت آصفیہ نے مملکت کے حدود میں ہونے کا امتناع ختم کر دیا اور ایک عرصہ بعد سروجنی نائیڈو کو حیدرآباد آنے کا موقع ملا انہوں نے حیدرآباد کے ڈھائی سو کانگریسی کارکنوں کے ہمراہ کاکناڈا کا سفر کیا۔ کاکناڈا کے اجلاس کو مسز آر۔ داس، پنڈت موتی لال نہرو، دیش بندھو، مولانا شوکت علی، سوباش چندر بوس، پنڈت جواہر لال نہرو اور مسٹر وٹھل بھائی پٹیل وغیرہ قومی رہنماؤں نے مخاطب کیا تھا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے حیدرآباد کے قائدین نے ایک علحدہ اجلاس منعقد کیا جس میں اسمبلی کے قیام کی تجویز پاس کی گئی۔

نواب میر عثمان علی خاں اور ان کی حکومت نے ۱۳۳۸ھ

ہی میں ایک فرمان کے ذریعہ رعایائے حیدرآباد کو تیقن دیا تھا کہ

مناسب بنیادوں پر لیجس لیٹو کونسل / اسمبلی قائم کی جائے گی

کاکناڈا اجلاس کے بعد حیدرآباد اسٹیٹ ریفارم اسوسی ایشن

نے اپریل ۱۹۲۷ء میں حکومت کو ایک یادداشت پیش کی جس میں

لیجس لیٹو کونسل / اسمبلی سے متعلق تجاویز پیش کئے گئے تھے چند

سال سوریہ پیٹھ (تلنگانہ) کے اجلاس عام میں آندھرا کانفرنس

قائم کی گئی اور اس کا پہلا اجلاس ۱۹۳۰ء میں جوگی پیٹھ میں ہوا اور

دوسرا اجلاس ۱۹۳۱ء میں بمقام دیورکنڈہ (تلنگانہ) منعقد

ہوا۔ آندھرا کانفرنس حیدرآباد کی سیاسی تاریخ میں اس لیے

اہمیت رکھتی ہے کہ اس کے قیام کے بعد مزید دیگر سیاسی و

سماجی ادارے قائم ہوئے اور آخرکار ان سب کو ضم کرتے ہوئے

حیدرآباد اسٹیٹ کانگریس بنائی گئی۔ اس کانگریس کا بنیادی

مطالبہ حکومت آصفیہ سے "ذمہ دارانہ حکومت" سے متعلق تھا۔

۱۹۲۸ء میں حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کے نقش قدم پر

People's Education Conference کی تشکیل عمل میں آئی اور تعلیم

کو عام کرنے کے سلسلے میں اس کے سالانہ اجلاس مملکت آصفیہ میں مختلف مقامات پر منعقد ہوئے۔ ۶/ اپریل ۱۹۲۹ء کو بمبئی میل کے ذریعہ مہاتما گاندھی حیدرآباد آئے۔ تین دن شہر میں قیام کیا اور مختلف سماجی اداروں کا معائنہ کیا' تقریریں کیں۔ سب سے بڑا جلسہ وویک وردھنی میدان پر منعقد ہوا۔ کچھ ہی عرصہ بعد علی برادران اپنی والدہ معظمہ کے ساتھ وارد حیدرآباد ہوئے۔ عوام نے جوش و خروش کے ساتھ خیر مقدم کیا۔ گاندھی جی نے "ہریجن ادہار" کی تحریک پیش کی تھی۔ پنڈتوں اور شاستریوں' برہمنوں کو یہ تحریک ایک آنکھ نہ بھائی۔ چنانچہ کانگریس میں ایک مخالف گروہ پیدا ہوا اور خلافت تحریک نے قومی یکجہتی کے جس جذبہ کو پروان چڑھایا تھا اس مخالف گروہ کی سرگرمیوں اور شدھی سنگھٹن کی کارروائیوں کی وجہ سے خاک میں مل گیا۔ کرشنا سوامی مدیراج لکھتے ہیں:

> "تحریک خلافت کی وجہ سے ہندوستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان جو پُرجوش اتحاد ہوا تھا وہ زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہ سکا

شدھی اور سنگھٹن کی تحریکات کی جب
ہوا چلی تو دونوں فرقے ایک دوسرے سے
الگ ہوتے گئے۔ اگرچہ کہ حیدرآباد
میں ان تحریکات کا کوئی خاص ردِ عمل
نہیں ہوا اور یہاں شدھی کی تحریک بالکل
پھیلنے نہیں پائی تاہم بیرونی اثرات کے نتیجہ
کے طور پر اندر ہی اندر فرقہ وارانہ کشیدگی
پھیلنے لگی ——" [1]

کرشنا سوامی مدیراج نے شدھی اور سنگھٹن تحریکات کے سیاسی مضمرات کا صحیح اندازہ لگاتے ہوئے سچ بات لکھنے سے اپنے قلم کو روک لیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں "اگرچہ حیدرآباد میں ان تحریکات کا کوئی خاص ردِ عمل نہیں ہوا" —— اس جملہ کا مطلب یہ ہے کہ مخالف گروپ کو بھی اسی طرح کی شدھی و سنگھٹن کی تحریک شروع کرنا چاہئے تھا۔ جس سے ردِ عمل

---

[1] کرشنا سوامی مدیراج "حیدرآباد کی سینتیس سالہ سیاسی جدوجہد" ص ۲۸

ظاہر ہوتا۔ یہاں کرشنا سوامی مدیراج کو چاہئے تھا کہ وہ
مخالف گروپ کی سیاسی بصیرت اور صبر و تحمل کی داد دیتے
لیکن اُن کے سوچے سمجھے ذہن نے اُن کے قلم پر پابندی لگادی۔
شدھی تحریک کی وجہ سے ۲۰ ردسمبر ۱۹۲۸ء کو نانڈیڑ
میں فسادات پھوٹ پڑے اور نانڈیڑ ہی میں مال ٹیکری
کے مقام پر مسلم اور سکھ فسادات ہوئے۔ حکومت نظام
نے مال ٹیکری کے فسادات کی تحقیقات کروائی سکھوں کو
اور معصوم مسلمانوں کو قصوروار قرار دیا۔ اسی طرح بعدازاں
گلبرگہ اور بیدر کے گنج میں فسادات پھوٹ پڑے۔ حیدرآباد
جو گنگا جمنی روایات کے مشہور تھا۔ متذکرہ بالا تحریکوں
کی وجہ سے فسادات سے متاثر ہوا۔ ۳۰ر جون ۱۹۳۱ء کو
پنڈت جواہر لال نہرو خیر سگالی دورے پر حیدرآباد تشریف
لائے اور سروجنی نائیڈو کے مکان گولڈن تھریشولڈ میں
قیام کیا۔ ۲۶ر جولائی ۱۹۳۱ء کو مولانا شوکت علی حیدرآباد
تشریف لائے۔ سیاسی اور سماجی تحریکات حیدرآباد میں
سرگرم تھیں اور اُردو دکنی کا ایک عاشق اپنی ہی دھن میں
پہاڑوں سے دودھ کی نہر نکالنے کی سوچ رہا تھا۔

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور نے دکنی ادب و کلچر
کے تحفظ و فروغ کے لیے ۱۹۳۱ء میں ادارۂ ادبیات اردو
قائم کیا اور آج تک اردو کی خدمت خاموشی سے انجام دے
رہا ہے۔ ادارہ کی سرگرمیوں کو علماء اور عوام تک پہنچانے
کی غرض سے ۱۹۳۸ء میں "سب رس" جاری کیا گیا جو آج
بھی ہر ماہ پابندی سے شائع ہو رہا ہے۔

ادارۂ ادبیات اردو کی کامیاب پیشرفت کو دیکھنے
کے بعد حیدرآباد کے چند فن کاروں / ادیبوں نے ۱۹۳۶ء میں
جبکہ سٹی کالج کے مدرس جناب سید محمد نے "جشن یادگار ولی"
کا اہتمام کیا اور اس کی صدارت نواب میر یوسف علی خاں
سالار جنگ سوم نے کی تو یہ تجویز اپنے صدارتی خطبہ میں
رکھی کہ اردو کے مخطوطات کی اشاعت ہونی چاہیئے۔ نواب
سالار جنگ کی اسی تجویز پر عمل کرتے ہوئے ۱۹۳۶ء میں
مجلس اشاعت دکنی مخطوطات قائم کی گئی جس میں جامعہ
عثمانیہ کے تمام معروف پروفیسرز کو شامل کیا گیا اور اسی
مجلس کے زیر اہتمام بابائے دکنی اردو ڈاکٹر سید محی الدین

قادری زورؔ نے دکنی اُردو ادب کا وہ درِ نایاب دریافت کیا اور پھر مرتب کر کے شائع کیا جسے آج اُردو دنیا "کلیات قلی قطب شاہ" کے نام سے جانتی ہے۔ اس کلیات کی اشاعت نے یکلخت ایک پل میں اُردو ادب کی تاریخ کو دو سو برس قدیم بنا دیا اور محمد قلی قطب شاہ "اُردو کا پہلا صاحبِ کلیات شاعر" قرار دیا گیا۔

۱۹۳۸ء کے آس پاس ایک نوجوان قوم پرست شعیب اللہ خاں نے "امروز" کے نام سے اپنا اخبار جاری کیا۔ اس اخبار میں ہندوستان کی تحریکِ آزادی کو نمایاں کیا جاتا تھا۔ ۱۹۴۹ء میں کسی نے شعیب اللہ خاں کو شہید کر دیا۔ الزام مجلس اتحاد المسلمین کے قاید رضاکاران قاسم رضوی پر لگایا گیا اور ایک خصوصی عدالت میں مقدمہ چلایا گیا۔ قاسم رضوی پر الزام ثابت نہ ہوا اور انھیں رہا کر دیا گیا۔

مجلس اتحاد المسلمین کے صدر نواب بہادر یار جنگ تھے۔ وہ اقبالؔ کے عاشق تھے اور خود کو اقبالؔ کا مردِ مومن

بنانے کی سعی کیا کرتے تھے۔ عبدالماجد دریابادی نے نواب بہادر یار جنگ سے اپنی ایک ملاقات کا ذکر "مقالاتِ ماجدی" میں کیا ہے۔ جس سے نواب صاحب کی سیرت کا اندازہ کیا جا سکتا تھا۔ نواب بہادر یار جنگ نے ایک عرصہ قبل درسِ اقبال کا سلسلہ شروع کیا تھا اور خود اقبال کے اردو و فارسی کلام کی خوبیاں بیان کیا کرتے تھے۔ ۱۹۳۸ء میں جب علامہ اقبال کا انتقال ہوا تو حیدرآباد میں "بزمِ اقبال" قائم کی گئی۔ ابتداء میں بزمِ اقبال کا دفتر "کتب خانۂ آصفیہ" کی بیرونی عمارت میں قائم کیا گیا تھا۔

۱۹۷۰ء میں نواب حسن یار جنگ نے بزمِ اقبال کی صدارت سنبھالی اور ۱۹۷۷ء میں "حیدرآباد اور بیرون حیدرآباد" کے تمام مصوروں سے اپیل کی کہ وہ اپنے فنِ کارانہ ذوق کی مدد سے اقبالؒ کا حق ادا کریں"۔[1] اس سلسلے میں ایک نمائش کمیٹی کا ~~افتتاح~~ بنائی گئی جس کے زیرِ نگرانی پہلی تصویری نمائش باغِ عامہ کے ٹاؤن ہال سے متعلق گیلری میں منعقد ہوئی۔ اس نمائش کا افتتاح بلبلِ ہند سروجنی نائیڈو نے کیا۔

---

[1] شفیعہ قادری "حیدرآباد کے علمی اور ادبی ادارے" ص ۱۵۶ سنہ اشاعت ۱۹۸۳ء

"بزمِ اقبال" کے زیرِ اہتمام دوسری نمائش ۱۹۷۵ء میں راجہ پرتاب گیرجی کی کوٹھی میں منعقد کی گئی۔ اس نمائش میں پاکستان کی خاتون مصورہ صغریٰ بی بی کی تصاویر بھی نمائش میں پیش کی گئیں۔ صغریٰ بی بی نے اقبال کی مختلف نظموں کو اپنے تصویروں کا موضوع بنایا تھا۔ ۷۵ء میں منعقدہ یہ نمائش اقبال دوستی میں ایک روشن مثال تھی ابھی پاکستان نہیں بنا تھا لیکن ہندوستان کی تقسیم کے مشورے سیاستدانوں میں زور و شور سے ہو رہے تھے۔ اقبال کو قطعہ زمین کے لحاظ سے ابھی تقسیم نہیں کیا گیا تھا کہ راجہ پرتاب گیرجی یعنی ایک ہندو راجہ کی کوٹھی میں کراچی کی مصورہ کی بنائی اقبال کی تصویریں نمائش کے لیے پیش کی گئیں۔ یہ ہندوستان کی قومی یکجہتی کی زندہ دلیل تھی۔ ۱۹۷۶ء میں بزمِ اقبال نے حیدرآباد کے مصوروں کی نمائش ضلع رائچور میں منعقد کی اور ۷۷ء میں شہرہ آفاق مصور عبدالرحمٰن چغتائی کی تصویروں کی نمائش حیدرآباد میں منعقد کی گئی۔ تقسیم ملک سے پہلے حیدرآباد میں اقبالیات کے سلسلے کی یہ منظم ترین کوششیں تھیں۔

ادبی سلسلے کی کڑی لطف الدولہ اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ

شوسٹ ہے جسے حکیم سید شمس اللہ قادری نے ۱۹۶۵ء میں قائم کی۔ اس ادارہ سے تاریخ کی کتابیں مرتب و شائع کی گئیں۔

حیدرآباد میں دستوری اصلاحات اور ذمہ دار حکومت کی مانگ ایک عرصہ سے کی جارہی تھی۔ چنانچہ ۱۷ جولائی ۱۹۳۹ء کو حضور نظام نے آئنگار کمیٹی کی سفارشات کی بناء پر دستوری اصلاحات کا اعلان کیا۔

سیاسی جماعتوں کو دستوری اصلاحات سے تشفی نہ ہوئی چنانچہ کانگریس نے اصلاحات کو مسترد کردیا۔ صدر مجلس اتحاد المسلمین نواب بہادر یار جنگ نے بھی اصلاحات کو یکسر مسترد کردیا۔ ساتھ ہی انہوں نے اپنی ناراضگی کے اظہار کی خاطر اور عوام کے مفاد میں اپنے تمام تر خطابات اور جاگیر سے دستبرداری اختیار کرلی۔

نواب بہادر یار جنگ کے اقدام نے نظام کی حکومت کے لیے خطرہ پیدا کردیا تھا دوسری طرف مجلس کو عوام کی زبردست تائید

حاصل ہو گئی تھی۔ حیدرآباد کی سیاسی فضاء کا بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر طیب انصاری لکھتے ہیں:

"حیدرآبادی سیاست میں تین مختلف گروہ واضح طور پر ابھر کر سامنے آ گئے تھے ایک تو وہ تھے جو کنگ کوٹھی کے وفادار تھے اور جنہیں بہرحال اپنے اقتدار کے تحفظ کی فکر تھی۔ دوسرا گروہ "اتحاد المسلمین" کے رضاکاروں کا تھا جن کے ہاتھوں میں پرچم آصفی اُردو زبان پر آزاد حیدرآباد کے ترانے تھے لیکن جو حضور نظام کو صرف مسلمانوں کے اقتدار کا مظہر قرار دیتے تھے اور تیسرا گروہ ان قوم پرستوں کا تھا جو انڈین نیشنل کانگریس کی بھرپور تائید و حمایت سے آزادی کی تحریک کو آگے بڑھا رہے تھے اور جنہوں نے "ذمہ دارانہ حکومت" کا مطالبہ کیا تھا۔"[1]

دستوری اصلاحات کو لاگو کرنے اور اُن کو مسترد

---

[1] ڈاکٹر طیب انصاری "حیدرآباد میں اُردو صحافت" صفحہ ۶۵ سنہ اشاعت جون ۱۹۸۰ء

کیے جانے کے بعد آصفی مملکت میں بھونچال آگیا اور اس کی
زد میں وزارتِ عظمیٰ کی کرسی آگئی پہلے سر مرزا اسمٰعیل اور
مہدی لائق علی وزارت بنی۔ اسی اثناء میں حکومت نظام
بہادر یار جنگ کو وزارتی عہدہ پیش کر کے ان کی اور
مسلمانوں کی مایوسی کو دور کرنا چاہتی تھی کہ ۲۶ رجون
۱۹۴۴ء کی رات ۱۱ بجے حقہ پینے کے بعد اچانک بہادر یار
جنگ کا انتقال ہوگیا۔ سارے شہر میں صف ماتم بچھ
گئی۔ روز نامہ "رعیت" میں بتاریخ ۲۸ رجون ۱۹۴۴ء کو
یم۔ نرسنگ راؤ نے اداریہ میں لکھا :

"قائد ملت نے اپنی قیادت کے چند ہی
سالوں کے اندر ایک بڑا کام یہ کیا کہ
آپ نے مسلمانانِ حیدرآباد میں ایک
عام سیاسی شعور پیدا کیا۔ گو قائد
ملت کے سیاسی نظروں اور سیاسی مسلک
سے ہم کو ہمیشہ سخت اختلاف رہا لیکن
ہم کو یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ قائد ملت نے
مسلمانانِ حیدرآباد کو جگایا اور ان میں
ایک زبردست ملی احساس پیدا کرایا۔

اس کو قائد ملت کی خدمات کی بدولت سمجھنا
چاہئے کہ سارے حیدرآبادیوں میں آزادی کی ایک
امنگ پیدا ہوگئی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ
قائد ملت نے حیدرآبادیوں کے دلوں سے وہ خوف
اور وہ ڈر نکال دیا جو آزادی کا نام لینے میں
حائل تھا ۔" [1]

بہادر یار جنگ کی وفات کے بعد اتحاد المسلمین کی صدارت پر
مولوی ابوالحسن سید علی فائز ہوئے وہ ایک سنجیدہ اور حقائق پسند قائد
تھے ۔ انہوں نے اکثریتی فرقہ کو اعتماد میں لے کر ایک طویل المعیاد سمجھوتہ
کرنے کا منصوبہ بنایا تاکہ مملکت آصفیہ کو آزاد رکھا جا سکے لیکن
مجلس کے دوسرے رہنماؤں کو آپ کی یہ تجویز پسند نہ آئی چنانچہ
ان کے خلاف ایک طوفان کھڑا ہوگیا مولوی ابوالحسن نے اتحاد المسلمین
سے استعفیٰ دے دیا اور پھر کبھی مجلس کا نام نہ لیا ۔

مولوی ابوالحسن سید علی کے بعد مجلس اتحاد المسلمین کی قیادت
سید قاسم رضوی کو سونپی گئی ۔ ہندوستان کی جنگ آزادی کامیابی
سے ہمکنار ہونے والی تھی ۔ سردار پٹیل کی یہ پالیسی تھی کہ تمام ریاستوں

---

[1] بحوالہ "حیدرآباد میں اردو صحافت" از ڈاکٹر طیب انصاری صفحہ ونیز
"دو ملک ایک کہانی" از ابراہیم جلیس صفحہ ۶۵

ریاستوں کو ہندوستان میں شامل ہو جانا چاہئے۔ سید قاسم رضوی نے اندازہ لگایا کہ جب ملک تقسیم ہوگا اور ایک نیا ملک پاکستان ہندوستان کی تقسیم کے بعد وجود میں آئے گا تو مملکت آصفیہ کو زبردستی ہندوستان میں شامل کرلیا جائے گا۔ مملکت آصفیہ کو آزاد و خودمختار رکھنے کی غرض سے سید قاسم رضوی ایک عوامی فوج رضاکار کے نام سے بنائی اور ہتھیار فراہم کرنے کی سعی کی۔ سید قاسم رضوی اچھے مقرر تھے۔ انہوں نے اپنی جوشیلی تقریروں کے ذریعہ سے عوام کو ہندوستانی فوج کے خلاف ابھارا بالآخر ہندوستان کی غلامی کے دن ختم ہوئے۔ ۱۵ر اگست ۱۹۴۷ء کو آزادی کا سورج طلوع ہوا لیکن ملک دو حصوں میں تقسیم ہوگیا۔ نواب میر عثمان علی خاں نے ۱۵ر اگست ۱۹۴۷ء کو ایک فرمان کے ذریعہ اپنی خودمختاری کا اعلان کیا۔

" میں نے اپنے فرمان ۱۱ر جون ۱۹۴۷ء اور اپنی تقریر ۱۲ر اگست ۱۹۴۷ء میں آزادی ہند کے تعلق سے جو مسائل پیدا ہوئے ہیں ان کے متعلق اپنے طرزعمل کا اظہار کردیا تھا۔ جہاں تک میری ریاست کا تعلق ہے میں نے صراحت کی تھی کہ جب انگریز چلے جائیں گے تو میں خودمختار بادشاہ بن جاؤں گا۔ چنانچہ اس کے

مطابق ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء سے میں نے یہ
مرتبہ حاصل کرلیا ہے —— " ۱؎

ہندوستان کی آزادی کے بعد پنڈت جواہر لال نہرو ملک کے پہلے وزیراعظم بنائے گئے۔ نواب میر عثمان علی خاں نے ہندوستان کے ساتھ مملکت آصفیہ اور معاہدہ خود مختاری کے سلسلے میں پنڈت نہرو سے گفت شنید کی غرض سے نواب علی یاور جنگ اور نواب زین یار جنگ کو روانہ کیا۔ پنڈت نہرو نے معاہدہ کو پسند کیا اور اپنے دستخط بھی کردیے۔ ۱۷ اگست ۱۹۴۸ء کو حضور نظام نے بھی دستخط کردیے۔ اس طرح بظاہر ہندوستان اور مملکت آصفیہ کے مابین پُرامن معاہدہ طے پاگیا۔

لیکن مجلس اتحاد المسلمین کے قائد سید قاسم رضوی نے اس معاہدہ کو مسترد کردیا۔ ہندوستانی حکومت پاکستان اور قائداعظم محمد علی جناح کے دباؤ کی وجہ سے بھی مملکت آصفیہ سے معاہدہ کرنے پر مجبور تھی۔ قائداعظم بہرحال برصغیر کی سیاست میں اہم رہنما سمجھے جاتے تھے لیکن مملکت آصفیہ کی بدقسمتی کہ ۱۱ ستمبر ۱۹۴۸ء

۱؎ بحوالہ "حیدرآباد کی تیس سالہ سیاسی جدوجہد" از کرشنا سوامی مدیراج صفحہ ۹ وغیرہ
"میر عثمان علی خاں آصف سابع حیات اور کارنامے" از طیبہ بیگم صفحہ ۱۰۵

کو اچانک قائدِ اعظم کا انتقال ہو گیا۔ ہندوستانی وزیر داخلہ مملکت آصفیہ پر نظریں لگائے بیٹھے تھے انہوں نے ۱۲ ستمبر ۱۹۴۸ء کو نصف شب کو حیدرآباد پر ۲۲ اطراف سے ٹینکوں اور ہوائی جہازوں کی مدد سے حملہ کردیا۔ مملکت آصفیہ کا سپہ سالار جنرل العیدروس خواب خرگوش میں مبتلا تھا اور بہ بانگ دعویٰ کرتا رہتا تھا۔ جب ہندوستانی فوجوں نے حملہ کیا تو آصفی فوج نے پسپائی اختیار کی۔ ہندوستانی ٹینکوں اور فوجوں کا اگر کسی حد تک کسی نے مقابلہ کیا اور مدافعت کی تو وہ سید قاسم رضوی کے جوشیلے رضا کار تھے جنہوں نے اپنی سرزمین کے لیے اپنے جسموں کی دیوار کھڑی کردی۔ اور چار دن کے اندر اندر آصفی فوج کو ہتھیار ڈالنے پڑے۔ ۱۷ ستمبر کو مملکت آصفیہ پر ہندوستانی فوجوں نے قبضہ جمالیا اور حضور نظام اب "راج پرمکھ" بنادیے گئے۔ برصغیر کی آخری عظیم مسلمان حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ رہے نام اللہ کا —

نواب میر قمرالدین خان فتح جنگ نظام الملک آصفجاہ اول
نواب ناصر جنگ شہید ناصر

دکن میں اُردو ادب کی نشو و نما کے سلسلے میں قطب شاہی سلطنت نے نمایاں خدمات انجام دیں۔ اسی سرزمین پر اُردو کا پہلا کلیات مرتب ہوا۔ اُردو کا پہلا دیوان مرتب ہوا۔ چھٹے قطب شاہی حکمراں، عبداللہ قطب شاہ کی فرمائش پر ملا وجہی نے اُردو میں پہلی نثری داستان "سب رس" لکھی۔ تب اُردو ادب نے ارتقاء کی ایک ایسی منزل طے کی جو کہ اُردو ادب کی بنیاد بن گئی۔

قطب شاہی حکمرانوں کی اس اُردو نوازی اور ادب نوازی کو آصفجاہی حکمرانوں نے اپنایا۔ قطب شاہی سلطنت کے تقریباً تمام حکمراں خود بھی شاعر تھے۔ اسی طرح آصفجاہی حکمراں بھی شاعر تھے۔

آصف جاہی سلطنت کے بانی نواب میر قمر الدین خاں

آصف جاہ اول فارسی کے بہترین شاعر ہونے کے علاوہ ساتھ اُردو میں بھی طبع آزمائی کیا کرتے تھے۔ ایک بہترین دانشور اور مدبر حکمران تھے۔ انہوں نے اپنی اولاد کو بھی علم کے زیور سے مالا مال کیا تھا۔

نواب میر قمر الدین خاں فارسی کے مشہور شاعر عبدالقادر بیدلؔ سے کلام پر اصلاح لی تھی۔ ابتداء میں شاکرؔ تخلص کیا کرتے تھے بعدازاں آصفؔ تخلص اختیار کیا۔ فارسی کے دو دیوان ۱۳۰۱ھ میں حیدرآباد سے شایع ہوئے۔ آصفؔ نے اُردو میں بھی شعر موزوں کیے ہیں۔ اس بات کا علم نہیں کہ اُردو کا دیوان مرتب کیا تھا کہ نہیں لیکن ایک غزل اور چند اشعار مختلف تذکروں میں ملتے ہیں۔

آصف جاہ اول کے جانشین نواب میر احمد علی خاں

آصف جاہ ثانی بھی فارسی اور اُردو کے اچھے شاعر تھے فنونِ لطیفہ

کے جملہ علوم میں انھیں دستگاہ حاصل تھی۔ اچھے ہوشیار
ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ایک اچھے مصور بھی تھے۔ شاعری
میں ناصر تخلص اختیار کیا تھا۔ ناصر کا جتنا کلام اب تک
دستیاب ہوا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاعری کی
خداداد صلاحیت موجود تھی۔ ناصر نے اورنگ آباد میں
اُردو شعر و ادب کی شمع فروزاں کیں جیسے بابائے دکن
اُردو ڈاکٹر سید محی الدین زور نے قطب شاہی عہد کے
ادب و تہذیب کے احیاء کا نام دیا ہے۔

نواب میر قمر الدین خاں آصف جاہ اول کے مصاحب
میں نواب درگاہ قلی خاں بھی موجود تھے جنھوں نے دہلی میں
نادر شاہ کے قتل عام کے موقع پر آصف جاہ اول کی جان کی
حفاظت کا انتظام والتزام سایہ کی طرح اُن کے ہمراہ رہتے
ہوئے کیا تھا۔ درگاہ خود بھی شاعر تھے اور درگاہ تخلص
کرتے تھے۔ ان کا بیشتر کلام محفوظ ہے۔ دہلی کا روزنامچہ

ان کی ایک مثنوی گلزار تصنیف ہے۔ جس میں دہلی کے روز و شب کا بیان بڑی تفصیل سے کیا ہے ۔۔۔۔ درگاہ کی اردو غزلیات کے علاوہ ان کے کہے ہوئے مرثیے ملتے ہیں ۔

عادل شاہی قطب شاہی سلطنتوں کے خاتمہ کے ساتھ ہی اردو بزم کا منظر اورنگ آباد منتقل ہو گیا اور اورنگ زیب عالمگیر کے عہد کے آخری پچیس برس میں اورنگ آباد اردو ادب کے فروغ و ارتقا کا مرکز بن گیا۔ اورنگ آباد میں نیا رنگ نیا روپ اپنایا۔ دکنی کا کرخت اور ٹھوس لہجہ شمالی ہند کی فارسی آمیز اردو سے نکھر سا گیا اور اردو زبان اورنگ آباد میں ایک فصیح اور شستہ زبان و لہجہ سے آشنا ہوئی ۔

آصفجاہ اول کا اردو کلام بزم اورنگ آباد کے ابتدائی دور کا نمونہ پیش کرتا ہے جبکہ ناصر اور درگاہ کا کلام اورنگ آباد کے بعد والے عہد کی مثال معلوم ہوتا ہے ۔ آئندہ صفحات میں کلام الملوک کا نمونہ پیش کیا جاتا ہے ۔

بانیٔ سلطنت نواب قمرالدین خاں آصف جاہ اول ایک اچھے سیاست داں، حکمراں، منتظم ہی نہ تھے بلکہ اچھے سخن فہم، سخن سنج اور شاعر بھی تھے۔ اسی کے ساتھ شاعر و ادیب نواز بھی تھے۔ انہوں نے عبدالقادر بیدل کے آگے میدانِ شعر و شاعری میں زانوئے ادب تہہ کیا تھا۔ ابتداء میں "شاکر" تخلص کرتے تھے بعد اذاں "آصف" اختیار کیا۔ فارسی کے دو دیوان ترتیب دیئے جو کہ حیدرآباد سے ۱۳۰۱ھ میں طبع و شائع ہوئے۔ زیادہ تر تصوف، معرفت، فلسفہ و اخلاق کے مضامین شعر کے پیراہن میں باندھے ہیں۔

آصف کا زمانہ آتے آتے اردو شعر و سخن نے ایک طویل اور مستحکم سفر طے کر لیا تھا۔ محمد قلی سے ولی تک اردو شاعری کی روایت متواتر موجود تھی جسے ولی نے شہرتِ دوام عطا کیا تھا۔ آصف ولی کے معاصر شاعر ہیں۔ انہوں نے اردو میں طبع آزمائی کی ہے۔ فارسی کلام کی طرح اردو میں بھی یقیناً غزل، رباعی، قصیدے و مرثیے لکھے ہوں گے لیکن

ابھی تک ان کا کلام دستیاب نہیں ہوا ہے ۔ صرف چند شعر کا
پتہ چلا ہے ۔ یہ تمام اشعار ذیل میں درج کئے جاتے ہیں ۔

شمیم کاکل مشکیں سے جب میں اونگ گیا
تو آئے کہنے لگے اس کو سانپ سونگ گیا

—

میں تنہا نہ تن بلکہ جاں بیچتا ہوں
یہ ہستی کی ساری دکاں بیچتا ہوں

—

ہے یہ بازار جنوں ... دیوانوں کے
یہاں دکانیں ہیں کئی چاک گریبانوں کے

—

دور سے سمجھا تھا اس شجاعت کی تحریر ہے
پاس جا دیکھا تو خون عاشق کا دامن گیر ہے

—

ادھر دیکھو تو کس ناز و ادا سے یار آتا ہے
مسیحا کی موئی امت کو ٹھوکر سے جلاتا ہے

—

کس طرح سے ماہ نو انجم کے عقدے واکرے
ہوئیں جہاں لاکھوں گرہ واں ایک ناخن کیا کرے

—

جی سے کہہ دو کہ آہ سرد کے ساتھ
ٹہلتے ٹہلتے چلے تو چل نکلے

—

اس گلبدن کے حق میں رونا ہے عین حکمت
کرتے ہیں ضعف دل پر آنکھیں گلاب پاشی

—

گالی نہ کہو کوئی میر سے دلبر کو حد سے
مجھ دل کے گلے میں یہ دعائے عینی ہے

—

نواب میر قمر الدین خاں آصف کے فرزند میر احمد ناصر جنگ بھی شاعر تھے اور ناصر تخلص کرتے تھے۔ آصف کا پسندیدہ طریقہ تھا کہ اکثر و بیشتر آپ کی خدمت میں پیش کئے گئے دوسرے شعراء کے کلام سے کوئی شعر یا مصرع منتخب کرتے ہوئے دربار میں موجود شعراء کے سامنے پیش کرتے کہ اس طرح پر طبع آزمائی کریں۔ اور اپنے موزوں کردہ زیادہ تر شعر یا طرحی مصرعے اپنے دوسرے لڑکے ناصر کے پاس بھیج دیتے پھر ناصر اس پر غزل لکھ کر آصف کی خدمت میں پیش کیا کرتے تھے۔ اس طرح پدر و پسر کے درمیان مشغلۂ شعر و سخن اکثر و بیشتر ہوا کرتا تھا۔

لیکن ایک روز ناصر جنگ نے اپنا ایک شعر جو ذیل میں لکھا جاتا ہے اپنے والد بزرگوار کی خدمت میں بذریعہ مراسلہ روانہ کیا ؎

مرنجان خاطرم جاناں مزاجی نازکی دارم
تو گر از حسن مغروری من از عشق تو مغرورم

شعر پڑھنے کے بعد آصف نے کہا کہ شعر میں عیب ہے
اور جب ناصر جنگ تشریف لائے تو اُن سے کہا ۔

" در بیت مرسلہ قباحت این ست کہ بفرودی
نسبت بعاشق خوب نیست " ؎[1]

اس اجمال کی تفصیل سے بات واضح ہوتی ہے کہ آصف کی نظر شعر کے معائب و حسن پر بڑی گہری تھی اور لفظ و معنی کے رشتہ پر وہ توجہ دیتے تھے اسی کے ساتھ آصف کے تنقیدی شعور کی نشاندہی ہوتی ہے ۔

ناصر جنگ کے بارے ڈاکٹر زور لکھتے ہیں:

" آثار تو ایسے تھے کہ دکن پھر ایک بار محمد قلی قطب شاہ کے زمانے کی جھلک دیکھ لیتا۔ اورنگ آباد اس وقت ہر طرح سے عروج کمال کو پہنچ چکا تھا۔

؎۱ تفصیل کے لیے دیکھیے "حیاتِ آصف" مولفہ محمد محبوب جنیدی ص ۱۰۹

قدرت کو اپنا قانون پورا کرنا تھا۔ اس نے
بہت جلد زوال کے اسباب پیدا کر دیے
اور ناصر جنگ کا خاتمہ کے ساتھ ہی اورنگ آباد
بھی اجڑ گیا اور وہاں کی تمام چہل پہل اور علمی و ادبی
سرگرمیاں حیدرآباد منتقل ہو گئیں۔ ناصر جنگ
اور اورنگ آباد کا خاتمہ اصل میں ایک قدیم
طرز شعر و سخن کا خاتمہ تھا جو عہد قطب شاہیہ
و عادل شاہیہ کی یادگار تھا۔" ؎۱

ڈاکٹر زور نے مندرجہ بالا اقتباس میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے "یقیناً" یہ امر واقعہ ہے لیکن اس بات کو بھی ذہن میں رکھنا چاہیے کہ اس کائنات میں وقت اپنا فرض ادا کرتا ہے۔ اورنگ آباد اس لیے اہم اردو مرکز بن کر ابھرا کہ شمالی ہند کے

؎۱ بحوالہ رسالہ جامعہ دہلی ص ۱۵ شمارہ ۳ جلد ۱۲

علاقہ دوآبہ میں بننے والی زبان اردو کا سلسلہ ارتقاء ابتداء کے
کچھ عرصہ بعد فارسی و ترکی کے پس منظر میں ختم سا ہو گیا تھا اور
دکن میں اردو میں ادب تخلیق ہو رہا تھا ۔ دکنی علاقائی زبانوں
کے اثر کی وجہ سے ثقیل سی ہو گئی تھی ۔ سلاست بہت کم تھی ۔
عالمگیر کے فتح دکن کے بعد (اور اس سے کچھ عرصہ قبل سے) اورنگ آباد
شمالی اور دکنی زبان کے ارتصال ہونے لگا جس کی وجہ سے اردو
ادب کو بھی فروغ حاصل ہوا اور زبان میں بھی سلاست و فصاحت
آ گئی ۔ ۱۶۵۶ء سے ۱۷۶۱ء یعنی ایک سو پانچ برس تک اورنگ آباد
میں اردو شعر و ادب کی شمع فروزاں رہی ، زبان و بیان کو ایک
نیا روپ اور نیا آہنگ عطا کرنے کے بعد یہ شمع بجھ گئی ۔
پروفیسر محمد نورالدین ناصر جنگ مشہید کی شخصیت اور ان کے
کمالات فن کا بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"ناصر جنگ شہید کو بھی علوم و فنون سے خاص لگاؤ
تھا۔ عربی، فارسی اور سنسکرت میں مہارت رکھتے
تھے۔ موسیقی، مصوری اور خطاطی میں کمال حاصل تھا۔
وہ خود بھی اچھے شاعر تھے، فارسی میں تین دیوان
مکمل کیے۔ صائب کے پیرو تھے اور اس کے رنگ
کو اس کمال کے ساتھ اپنایا تھا کہ ان کے
اشعار پر صائب کے کلام کا دھوکہ ہوتا ہے۔
اردو کے بھی اچھے شاعر تھے لیکن کسی دیوان کا
پتہ نہیں چلتا۔ تذکروں میں چیدہ چیدہ
اشعار مل جاتے ہیں۔ آزاد بلگرامی کے بڑے مداح
اور سرپرست تھے ۱۱۵۸ھ م ۱۷۴۵ء میں
جب آصف جاہ نے انھیں اورنگ آباد میں اپنا نائب

مقرر کیا اس وقت انہوں نے آزاد کو اپنا مصاحب اور استاد مقرر کیا اور جب تک زندہ رہے یہ سلسلہ جاری رہا۔ آزاد نے خزانہ عامرہ میں ان کی علمی ادبی محفلوں کا حال تفصیل سے لکھا ہے جن میں اس وقت کے بڑے بڑے علماء و شعراء شریک ہوتے تھے۔ ناصر جنگ کا دور حکومت ۱۷۴۸ء تا ۱۷۵۰ء بہت مختصر رہا۔ [1]

جناب نصیر الدین ہاشمی نے اپنی تصنیف "دکن میں اردو" میں تذکرہ قنوت، تذکرہ شفیق، تذکرہ طبقات الشعراء اور بیاض مملوکہ مولوی صفی الدین مرحوم سے ناصر جنگ کی ایک غزل اور چار شعر نقل کئے ہیں۔ ناصر جنگ شہید کا یہ تمام کلام

---

[1] پروفیسر محمد انورالدین "حیدرآباد دکن کے علمی و ادبی رسائل" ص ۱۶
سنہ اشاعت ۱۹۹۲ء

ذیل میں نقل کیا جاتا ہے —

نین تیرے شکار کرتے ہیں
دل بیمار فگار کرتے ہیں
خوب رو جب سنگار کرتے ہیں
آرسی پر بہار کرتے ہیں

کس بے داد سوں چمن میں آج
پھول سارے پکار کرتے ہیں

اہل دل گریۂ ندامت سیں
سیر ابر بہار کرتے ہیں

چشم بد دور کہ دلبریں سارے
اپنے ناصر کوں پیار کرتے ہیں

—

یار خورشید جہاں تھا مجھے معلوم نہ تھا
ذرے ذرے میں عیاں تھا مجھے معلوم نہ تھا

مجھے بہاری گلی والا گویا خوش نہیں آتا
کھٹکتا ہے کلیجے میں وہ باریک سر والا

—

اے کبوتر جا کے کہہ یوسف کو گو ہر سے نکل
چاہ سے تیرے زلیخا ہو گئی ہے باولی

—

روز بد میں کس سے ہے یار دریافت کی امید
گر زوال آتا ہے ٹل جاتا ہے سایہ ساتھ سے [1]

محمد عظیم الدین صحبت اپنے ایک مقالے "مختصر تاریخ مملکت آصفیہ، حیدر آباد دکن" میں ناصر جنگ کی مہارت لسان و موسیقی و مصوری کا بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

---

[1] نصیر الدین ہاشمی "دکن میں اردو" ص ۳۸۰

" ناصر جنگ شہید کو عربی اور فارسی کے علاوہ سنسکرت
میں بھی بدرجہ احسن مہارت تھی۔ موسیقی و مصوری
میں ان کا کمال استادانہ منصب پر فائز تھا۔ خطاطی
میں بھی انہوں نے کافی مشق کی تھی۔ سلاطین آصفیہ
میں ناصر جنگ سب سے زیادہ خوشخط تھے۔ اُن کے دربار
میں وہ سارے شعراء اور فضلاء جمع تھے جو نظام الملک
آصف جاہ اول کے دربار سے وابستہ تھے۔ ان حضرات
کے وجود کو ورثۂ پدری سمجھ کر ان کی قدر و منزلت
کرتے تھے۔ ان میں قابل ذکر میر غلام علی آزاد
بلگرامی، صمصام الدولہ شاہ نواز خاں مولف "تاریخ
مآثر الامراء" موسیٰ خاں جرات، مرزا جان رسا
نقد علی خاں ایجاد وغیرہ۔ ناصر جنگ کی سرپرستی
میں آزاد بلگرامی اور صمصام الدولہ شاہ نواز خاں
نے جو علمی کارنامے پیش کئے، وہ ناقابل فراموش

ہیں۔ ناصر جنگ فارسی کے بہترین شاعر تھے
ان کے تین فارسی دیوان شائع ہو چکے ہیں جو
کم و بیش ۱۶۷۰ صفحات پر مشتمل ہیں۔[1]

ڈاکٹر یوسف حسین خاں "تاریخ دکن" میں ناصر جنگ کے ایک
اور تخلص "آفتاب" کا ذکر کرتے ہیں اور ان کے نکھرے ہوئے ذوق سخن
کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"نواب ناصر جنگ کو شعر و شاعری کا ذوق
اپنے والد ماجد سے ورثے میں ملا تھا۔ آفتاب
اور ناصر تخلص کرتے تھے فارسی میں مرزا صائب
کا تتبع کرتے تھے۔ جس کی نسبت کئی جگہ اظہار
بھی کیا ہے۔ ان کی سخن فہمی کا تذکروں میں ذکر ہے۔
فارسی کے علاوہ اردو میں بھی شعر کہتے تھے۔"[2]

---

[1] عظیم الدین محبت مقالہ مشمولہ مجلہ آصفیہ ص ۱۱۷
[2] ڈاکٹر یوسف حسین خاں "تاریخ دکن" ص ۲۵۵ سنہ اشاعت ۱۹۶۷ء

یہ سچ ہے کہ ناصر جنگ شہید کے کلام کی تعریف و توصیف بیشتر تذکرہ نویسوں نے کی ہے اور یقیناً ناصر جنگ اچھے شاعر ہوں گے لیکن جو کچھ باقیات ہم تک پہنچے ہیں۔ ان سے ناصر کے کلام کے محاسن کا اندازہ لگانا مشکل ہی نہیں ناممکن معلوم ہوتا ہے۔

آصف اور ناصر کے ہم عصر طبقہ امراء سے متعلق ایک اور شاعر کا ذکر اس باب میں کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ راقم کی مراد درگاہ قلی خاں سے ہے۔

درگاہ قلی خاں نام اور تخلص درگاہ تھا۔ مومن الدولہ سالار جنگ بہادر خطاب تھا۔ والد کا نام خاندان قلی تھا۔ چار برس کی عمر ہی آصف جاہ اول کے زیر سرپرستی آ گئے۔ درگاہ کی ابتدائی تعلیم و تربیت پر اظہار خیال کرتے ہوئے۔ میر سعادت علی رضوی لکھتے ہیں:

نواب ذوالقدر ۲۹ رجب ۱۱۲۲ھ میں بمقام
سنگمنیر پیدا ہوئے۔ ابتداً گو اپنے والد خاندان
قلی خاں کے زیر پرورش رہے۔ مگر ان کی حقیقی
تعلیم و تربیت حضرت مغفرت مآب نواب
آصف جاہ بہادر کے زیر نگرانی ہوئی۔ قدرت
کی طرف سے ایک خاص جوہر قابلیت عطا
ہوا تھا۔ نہایت ذہین اور ذکی الطبع تھے۔ کچھ
تو اس فطری اثر اور کچھ آصف جاہ بہادر
کی تربیت کے فیضان سے سن رشد کو پہنچنے
سے قبل ہی انہوں نے اکثر علوم و فنون سے بہرہ یاب
ہو کر اپنے ہمعصروں میں ممتاز حیثیت حاصل
کرلی۔ متانت اور سنجیدگی کے ساتھ طبیعت
میں شوخی اور ظرافت کی چاشنی بھی تھی چنانچہ
وہ جس بزم میں شریک ہوتے اس کو ایسا

گرویدہ بنالیتے۔ اس طبقہ کے دستور کے موافق
فن موسیقی میں بھی درجہ مہارت و کمال حاصل
کیا۔" ؎۱

آصف جاہ اول کے بعد نواب ناصر جنگ اور نواب صلابت جنگ مرحوم کے عہد میں مدارج میں مزید ترقی ہوئی۔ خطاب ذوالقدر جنگ اسی زمانے میں عطا ہوا۔ عرصہ تک صوبہ خجستہ بنیاد کے صوبہ دار رہے۔ ۱۱۷۹ھ میں خدمت سے سبکدوشی اختیار کی اور گوشہ نشین ہو گئے۔ ۱۱۸۰ھ میں انتقال کیا۔ اورنگ آباد میں اپنے والد کے مقبرہ میں دفن کئے گئے۔ میر غلام علی ارشد نے تاریخ کہی "اہل عالم سینہ چاک از ماتم سالار جنگ" ؎۲

حکیم سید مظفر حسین نے درگاہ کا تذکرہ "مرقع دہلی" کو مرتب کیا۔ مقدمہ میں انہوں نے درگاہ کے اردو فارسی کلام

؎۱ میر سعادت علی صاحب رضوی "نواب درگاہ قلی خاں سالار جنگ اور ان کی مرثیہ نگاری" ص۲۸ مضمون مشمولہ "مرقع سخن" جلد اول

؎۲ اسد علی خاں تمنا "تذکرہ گل عجائب" ص۵۹ سنہ اشاعت ۱۹۸۵ء۔

کے نمونے بھی پیش کیے ہیں۔ جن میں غزل، قصیدہ اور رباعی کے نمونے ہیں۔ میر سعادت علی رضوی نے سالار جنگ کتب خانے میں موجود ایک بیاض دریافت کی جس میں درگاہ کے مرثیے موجود ہیں۔ درگاہ کی سخن دانی کا ذکر کرتے ہوئے نصیر الدین ہاشمی لکھتے ہیں :

"فارسی کے آپ اچھے شاعر تھے۔ اُردو میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ زیادہ تر مرثیے کہا کرتے تھے۔ کتب خانہ سالار جنگ میں آپ کے مرثیے موجود ہیں۔" [1]

میر سعادت علی رضوی نے انہی مراثی کو اپنے مضمون میں متعارف کروایا ہے۔ نمونہ کلام ذیل میں نقل کیا جاتا ہے :

قصیدہ :

پڑی ہے آ کے گلے ناگہاں بلائے سفر
سفر نہیں ہے سقر بل سقر سے ہے بدتر

---

[1] نصیر الدین ہاشمی ؛ دکن میں اُردو ؛ ص ۳۸۷

زبان خامہ ہے اس کے بیان میں عاجز
ہے جس کا شحنۂ کلفت حساب صدر دفتر

اسیر تیشۂ تعذیب صامت و ناطق
غریق لُجّۂ تخریب ہے گا سب لشکر

نہیں ہے تختۂ بازار میں اناج کی جنس
نہ غلّہ بلکہ سبھی نقد و جنس ہے کمتر

- - - - - - - - -

- - - - - - - - -

اسی تردد و افکار میں لگی تھی نیند
کہ ناگاہ خواب میں دیکھا قریب وقت سحر

کھڑا ہے آ کے سرہانے پہ میر نوراں
ولیٔ عصر و خوش منظر و خجستہ سیر

کیا کمال عنایت سے کیا ہے فکر تجھے
ہے تیرے کام کا حامی امام جن و بشر

- - - - - - - - -

- - - - - - - - -

مراد بندۂ درگاہ روز ہے کہ کرے
ابوتراب کی تربت کی خاک کحل بصر [1]

—

درگاہ حق کا ہے گا وہ شاہ برگزیدہ
جیوں سرمہ کر دیا ہے جس کی ضیائے دیدہ

—

امت کے ہاتھ سینے پہ جاں بلب رسیدہ
ہے جنتی جو کوئی اس پر دل اپنا وارے

—

منکے منا یہی ہے جو خاک چرن حسین
یہ بندہ درگاہ کا انجن کرے دن رین

میر سعادت علی رضوی اطلاع دیتے ہیں کہ درگاہ نے سلام بھی کہے ہیں۔ درگاہ کے مراثی کو تین ادوار میں تقسیم

---

[1] ماخوذ از دہلی بارہویں صدی میں (مرقع دہلی) مرتبہ حکیم سید مظفر

کرتے ہوئے انہوں نے لسانی تغیر کا جائزہ لینے کی کوشش کی ہے۔ ایک اقتباس دیکھیے:

"ان مرثیوں کی زبان میں جو ۱۱۶۷ھ سے ۱۱۷۲ھ تک کے دوران لکھے گئے، فارسی اثر بہت زیادہ ہے۔ فارسی ترکیبیں، فارسی الفاظ جا بجا استعمال ہوئے ہیں۔ اس کے ۱۱۷۲ھ سے ۱۱۷۷ھ تک کے مرثیے ہندی رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ نہ صرف ہندی الفاظ کی کثرت ہے بلکہ مرثیوں کے ہر بند میں ایک خالص ہندی زبان کا شعر شامل کیا ہے۔ آخری عمر کے کلام میں تناسب پایا جاتا ہے یعنی ۱۱۷۷ھ سے ۱۱۸۰ھ تک نہ صرف فارسی الفاظ زیادہ ہیں نہ ہندی البتہ دکھنی محاورات

کہیں کہیں پائے جاتے ہیں۔ تفصیلی نظر ڈالنے
سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ فارسی اور ہندی کے
مقابلے میں دکھنی اثر ان کے کلام میں بہت
کم ہے .... اُس زمانے کے عام خیال کے
موافق مرثیہ گوئی سے درگاہ قلی خاں کا
مقصد بھی صرف رونا اور رلانا تھا ۔" [1]

اُردو مرثیہ عادل شاہی اور قطب شاہی عہد میں شہرت دوام حاصل کر چکا تھا چنانچہ مرزاؔ اور روحیؔ کے مراثی کی سند موجود ہے اسی روایت کو درگاہ نے قائم رکھا ہے ۔

اس باب میں مملکت آصفیہ کی تشکیل و تعمیر کا بیان کرنے کے بعد ضروری معلوم ہوا کہ عہد آصفیہ کے ابتدائی عہد کے طبقۂ امراء کے ان مندرجہ بالا شعراء کے کلام کا ذکر و تجزیہ اسی باب میں کیا جائے۔ آئندہ باب میں عہد آصفیہ کے ابتداء سے آخر عہد نظام علی خاں آصف جاہ ثانی یعنی ۱۸۰۳ء تک محیط اُردو شعر و ادب کا تذکرہ و تجزیہ کیا جاتا ہے ۔

---

[1] بحوالہ بالا ص ۳۱ مشمولہ "مرقع سخن" جلد اول

۲

باب دوم

اردو شعر و ادب بہ عہد آصف جاہ اول

آصف جاہ ثانی (۱۷۲۴ء تا ۱۸۰۳ء)

آصفجاہ اوّل

نواب میر قمر الدین علیخان فتح جنگ نظام الدولہ نظام الملک مغفرت مآب ۱۱۱۲ھ ۱۱۶۱ھ

مرقع سخن

نواب میر نظام علی خان آصفجاه ثانی

آصفیہ سلطنت ۱۷۲۴ء میں قائم ہوئی۔ آصف جاہ اول آصف کے بعد نواب میر احمد علی خاں تخت نشین ہوئے۔ ناصر جنگ ان کا خطاب تھا۔ اسی مناسبت سے ناصر تخلص اختیار کیا تھا۔ اردو کے اچھے شاعر تھے۔ شعراء کے قدردان و مربی تھے۔ مندوی خاں فدوی نے ناصر کی سخن سنجی و سخن فہمی کی داد اپنی ایک نظم میں دی ہے۔ ناصر جنگ کو دھوکے سے شہید کر دیا گیا اور ان کے بھانجے مظفر جنگ نے آصفیہ تخت سنبھالا لیکن ابھی چین کی سانس بھی نہ لے پائے تھے کہ انھیں بھی انہی لوگوں نے ختم کر دیا جنھوں نے ناصر جنگ کو شہید کیا تھا۔ مظفر جنگ کے آصف جاہ اول کے تیسرے صاحبزادے صلابت جنگ کے لقب کے ساتھ تخت نشین ہوئے۔

صلابت جنگ کے عہد میں آصفیہ سلطنت کا میدان بنی رہی۔ حکمراں کی کمزوری کی وجہ سے آصف جاہ اول اور

ناصر جنگ شہید کے خون سے سینچے اور فتح کیے گئے علاقے ایک کے بعد دیگرے مرہٹوں کے قبضہ میں چلے گئے۔ سلطنت نصف رہ گئی ۔ آصف جاہ اول کے چوتھے فرزند میر نظام علی خاں اپنے والد اور بڑے بھائی کی محنت کے پھل کو اس طرح دشمنوں کے ہاتھوں میں جاتا دیکھ نہیں پائے اور انہوں نے شاہ عالم ثانی شہنشاہ ہند سے دکن کی صوبہ داری کا فرمان حاصل کرنے کے بعد اپنے بڑے بھائی صلابت جنگ کو گرفتار کر لیا اور بیدر کے قلعہ میں قید کر دیا اور خود آصف جاہ ثانی کے لقب سے تخت آصفیہ پر متمکن ہوئے ۔ آصف جاہ ثانی نے ۱۸۰۳ء میں انتقال کیا ۔

آصفجاہ اول کے سلطنت آصفیہ قائم کرنے آصف جاہ ثانی کے انتقال تک آصفیہ عہد میں سیاسی تبدیلیاں ہی رونما نہیں ہوئے بلکہ تہذیبی تمدنی اور ادبی لحاظ میں بھی ارتقاء

ہوا۔ نواب میر نظام علی خاں آصف جاہ ثانی نے دارالسلطنت اورنگ آباد سے حیدرآباد منتقل کیا۔ حیدرآباد تقریباً ایک صدی بعد دوبارہ سے سیاسی مرکز بن گیا۔ دارالسلطنت کی یہ تبدیلی سیاسی اعتبار ہی سے اہم نہ ثابت ہوئی بلکہ ادبی محاذ پر بھی اہم اقدام ثابت ہوا۔ ایک صدی بعد ادبی مرکز اورنگ آباد سے حیدرآباد منتقل ہوا اور اس طرح حیدرآباد کی دکنی اورنگ آباد کی شائستہ زبان سے اثر پذیر ہوئی۔ آصف جاہ ثانی کے ہمراہ اورنگ آباد کے نامور شعراء بھی حیدرآباد ہجرت کر آئے۔ چنانچہ آزاد بلگرامی، عزلت، تجلی، تمنا، شفیق، شیدا وغیرہ نے حیدرآباد میں بزم سخن ایسی فروزاں کی سارا ہندوستان اردو شاعری سے منور ہو گیا۔

آصف جاہ اول سے آصف جاہ ثانی تک کا عہد

اُردو شاعری کا وہ ابتدائی اور تشکیلی دور ہے جہاں ولی اورنگ آبادی کے بعد پروان چڑھنے والی اُردو شاعری نے لسانی اعتبار سے سارے ہندوستان کو یکسانی عطا کی۔ اس عہد میں دلی لکھنؤ اور حیدرآباد ایسے مرکز تھے۔ جہاں اُردو زبان و ادب خواص و عوام کا اوڑھنا بچھونا ہو گئے تھے۔ ان سلطنتوں کے حکمراں بھی شاعر تھے اور شعراء و ادباء کے سرپرست و قدرداں تھے۔ عوام بھی سخن فہم و سخن سنج تھے۔ اپنی داد و تحسین سے شعراء کے حوصلہ بڑھا رہے تھے۔

دہلی میں اُردو شعر و ادب ابھی طفلِ مکتب تھا اور گرتے پڑتے شہسواری کے لیے ایڑ لگا رہا تھا۔ سراج الدین علی خاں آرزوؔ، شاہ حاتمؔ، مظہر جانِ جاناں، شاہ آبروؔ، ناجیؔ، فائز وغیرہ نے

اپنے زورِ قلم سے دہلی میں اردو شعر و ادب کی بنیادی اساس فراہم کی۔ حقیقت نگاری کو شعار بنایا۔ تصوف کے ساتھ ساتھ ایہام گوئی کو پروان چڑھایا اور پھر دہلی میں سودا، میر، درد اور سوز جیسے شعرا نے کائنات کے ہر موضوع کو اپنے سخن میں بیان کیا۔ میر خدائے سخن بنے۔ سودا ملک الشعراء اور قاآنی ہند قرار دیے گئے۔ درد نے تصوف سے اردو شاعری کو مالا مال کیا۔

لکھنؤ میں اردو شاعری کی شمع دہلی سے ہجرت کرنے والے شعراء نے ہی فروزاں کی تھی۔ جس عہد کا ہم تذکرہ کر رہے ہیں۔ اس میں اودھ کی سلطنت پر شجاع الدولہ اور آصف الدولہ نے حکومت کی۔ شجاع الدولہ نے دہلی سے آنے والے شعراء کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور اپنی نوازشوں سے شعراء کو حوصلہ بخشا۔ معاشی پریشانیوں سے انھیں

چھٹکارہ دلایا۔ اسی زمانے میں لکھنؤ آرام و آسائش
کی وجہ سے عیش و عشرت کی آماجگاہ بن گیا تھا۔
اس ماحول کا اثر شاعر پر بھی پڑا۔ اُردو شعراء نے
لکھنؤ میں ایہام گوئی کو عروج پر پہنچا دیا۔ رعایت لفظی
اور صنائی کو ہی شعر کی خوبی سمجھ لیا گیا۔

آصف الدولہ خود بھی شاعر تھے اور اپنا دیوان مرتب
کیا ہے۔ انہی کے عہد میں دہلی سے ہجرت کرنے والے
میر حسن نے اُردو کی سب سے بہترین مثنوی سحر البیان
لکھی اور آصف الدولہ کی خدمت میں پیش کی تھی۔

دہلی اور لکھنؤ کے برخلاف حیدرآباد میں اُردو
شعر و ادب کا ارتقا روایتی انداز میں برقرار تھا۔ دکنی
ادب کی روایت ابھی زندہ تھی۔ زندگی شاعری کا ماخذ تھی۔
قطب شاہی شعر و ادب کی روایت نے حیدرآباد میں
نیا جنم لیا۔ حقیقت نگاری واقعیت کے ساتھ ساتھ

تخیل کے گل بوٹے بھی سجائے جا رہے تھے۔ عزلت نے شاعری کو دوسرے فنون لطیفہ سے ہم آہنگ کیا۔ آزاد بلگرامی، شفیق، تمنّا، تجلی نے تذکرے لکھ کر ادبی و ثقافتی خزانوں کو محفوظ کرنے کا فرض ادا کیا۔

آئندہ صفحات میں عہدِ آصفیہ میں ۱۷۲۴ء سے ۱۸۰۳ء کے درمیان تخلیق پانے والے شعر و ادب کا بیان کیا جاتا ہے۔

۵

سید سراج الدین نام سراجؔ تخلص تھا۔ اورنگ آباد کے رہنے والے تھے۔ نسباً حسینی سید تھے۔ خاندان نہایت معزز و مقتدر تھا۔ آباواجداد میں اکثر مشائخ و صوفیا گزرے ہیں۔ سید سراج الدین کے والد بزرگوار ایک صوفی منش بزرگ تھے۔ اورنگ آباد میں رہتے تھے۔ سراج کی پیدائش اورنگ آباد ہی میں ہوئی۔ نصیرالدین ہاشمی نے "دکن میں اردو" میں سراج کا سنہ پیدائش ۱۱۲۷ھ[1] درج کیا ہے۔ پروفیسر عبدالقادر سروری نے بھی شاہ سراج کا سنہ پیدائش ۱۱۲۷ھ ہی درج کیا ہے[2]۔ جبکہ پروفیسر سید محمد سراج کے دیوان کی اندرونی شہادت کی بنا پر اُن کا سنہ پیدائش ۱۱۲۸ھ لکھتے ہیں[3]۔ سراجؔ اپنے دیوان کی ترتیب پر اپنی عمر کے ساتھ

---

[1] نصیرالدین ہاشمی "دکن میں اردو" ص ۳۷۷ ترقی اردو بیورو ایڈیشن ۱۹۸۶ء

[2] پروفیسر عبدالقادر سروری "شاہ سراج اورنگ آبادی اور ان کی اردو شاعری" مضمون مشمولہ مجلۂ طیلسانین جلد چہارم شمارہ اول ص ۵۷

[3] پروفیسر سید محمد "سراج اور اُن کی شاعری" ص ۱۷ مضمون مشمولہ کاروانِ سخن مرتب عادل حیدرآبادی۔ ۱۹۵۶ء

سنہ ہجری کا بیان بھی کیا ہے ۔ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

جب کیا جزوِ پریشانِ سخن شیرازہ بند
تھے برس چوبیس[۲۵] میں عمرِ بے نیاز کے
سال ہجری تھے ہزار و ایکصد و پنجاہ و در
واقفِ علمِ لدنی، صاحبِ اسرار کے

اس لحاظ سے سنہ ولادت ۱۱۲۸ھ صحیح ہے ۔

سراج کی تعلیم و تربیت مذہبی، دینداری اور تصوف کے گہرے ماحول میں ہوئی ۔ مزاج میں وحشت[۱] پیدا ہو گئی جو جنون تک پہنچی انجام کار برہنہ پا جنگل کو نکل جاتے اکثر اوقات حضرت شاہ برہان الدین کے مزار پر طواف کیا کرتے ۔ سات برس اسی حالت جذب و دیوانگی میں گزرے ۔ گھر والوں نے مجبور ہو کر پابہ زنجیر کیا ۔ کچھ وحشت کم ہوئی ۔ ۱۱۴۷ھ میں شاہ عبدالرحمٰن صاحب چشتی سے بیعت کی ۔

سراج نے اپنا دیوان ۱۱۵۲ھ میں مرتب کیا ۔ کچھ عرصہ بعد مرشد نے شعر گوئی کی مخالفت کر دی ۔ سراج اگرچہ فطری شاعر تھے لیکن مرشد کے حکم کے تحت یک لخت شعر گوئی ترک کر دی اور سترہ[۱۷] برس تک ایک شعر بھی نہ کہا ۔ ۱۱۶۱ھ میں شاہ عبدالرحمٰن

---

۱ پروفیسر عبدالقادر سروری مرتبہ "کلیاتِ سراج" ص۳۹ ۔ مقدمہ ص ۔ دہلی ۱۹۸۲ء

کا وصال ہوا۔ سراج کا فطری جوہر پھر عود کر آیا اولاً انہوں نے
فارسی شعراء کے کلام کا ایک مجموعہ منتخب کیا۔ ۱۱۶۹ھ میں یہ
مجموعہ "منتخب دیوانہا" کے عنوان سے سامنے آیا۔ اس مجموعہ کے
بعد انہوں نے اُردو میں ایک معرکۃ الآرا، مثنوی "بوستان خیال"
۱۱۷۳ھ میں لکھی ــــ

سراج نے بروز جمعہ بتاریخ ۴ شوال المکرم ۱۱۷۷ھ
کو داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ معاصرین نے "تاریخ" کہیں ــ

غلام علی بلگرامی "ہے ہے مصباح بزم خاموش"
اولاد محمد ذکر بلگرامی "سراج بزم ادب کرد نورانی"
لچھمی نرائن شفیق "رو بہ رحمان نمود شاہ سراج"

سراج کے عزیز شاگرد ضیاء الدین پروانہ نے تاریخ کہی ؎

ندا رسید ز ہاتف بہ سمت پروانہ
بگو سراج بہ ناموس قبر پنہاں شد

۱۱۷۷ھ

شاہ سراج کے علمی و قلمی آثار و یادگار میں چار تخلیقات ملتی ہیں۔
۱۔ کلام فارسی ۲۔ کلیات اُردو
۳۔ منتخب دیوانہا ۴۔ مثنوی بوستان خیال

سراج کے کلام میں ہمیں درد و اثر کی ایک عجیب کیفیت ملتی ہے۔ اُن کے درد میں تلخی نہیں ایک قسم کی لذت ملتی ہے۔ وصل کی خواہش ان کے سوز و گداز کو شعلہ پوش کر دیتا ہے ؎

جل گیا شوق کے مسئلہ میں سراج
اپنی دانست میں بے جا نہ کیا

شوق و تجسس ہی کو سراج خلوص و صداقت کی بادشاہت قرار دیتے ہیں ؎

بیٹھا ہے تخت شوق پہ جو ہو کے بے ریا
وہ بادشاہ بارگہ کبریا ہوا!!

سراج کے کلام میں سادگی، بے تکلفی، فطری رجحان، حقیقت اور اصلیت کا اظہار اور اثر، نمایاں نظر آتے ہیں جیسے ؎

کہاں ہے گلبدن موہن پیارا
کہ جیوں بلبل ہے نالاں دل ہمارا
تغافل ترک کر اے شوخ بے باک
تلطف کر، نوازش کر، مدارا

ہر رات سراج آتشِ غم میں نہ جلے کیوں
پروانۂ جاں سوز ہے بلہار کسی کا

مولانا الطاف حسین حالی نے اپنی معرکتہ الآراء تصنیف "یادگارِ غالب" کے دوسرے حصے میں غالب کے کلام کی خصوصیات بتاتے ہوئے ان کے کلام کی سب سے اہم خصوصیت سادگی بتائی ہے ۔ سراج اورنگ آبادی کے کلام میں بھی سادگی اہم خصوصیت کے طور پر سامنے آتی ہے ۔ یہ سادگی اُن کے یہاں دو طرح سے ملتی ہے ۔ خیالات کی سادگی اور الفاظ کی سادگی ـــــ سادگیٔ خیال و سادگیٔ الفاظ کے باوجود سراج کے کلام میں معنیٰ آفرینی داد طلب کرتی ہے ۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ـــــ

سادگیٔ خیال :

جانے پہ جی نثار ہوا کیا بجا ہوا
اس راہ میں غبار ہوا کیا بجا ہوا

فصلِ گل کا غم دلِ ناشاد پر باقی رہا
حشر تک یہ مظلمہ صیاد پر باقی رہا

جو دیکھے اُس کے کاکل کا تماشا
نہ دیکھے پھر وہ سنبل کا تماشا

اگرچہ ہر سرو راست قامت چمن میں مغرور سرکشی ہے
مقابل اُس قد خوش ادا کے مری نظر میں غلام ہوگا

سراپا سحر ہے موہن کہ جس تصویر لکھنے میں
نہ لا دیدار کی طاقت مصور نے قلم بھولا

سراج کے کلام میں الفاظ کی سادگی کی بہار دیکھیے:

مہر کر مہر موم دل ہو کر
کر عطا دل کا مدعا سارا

ہوا ہوں ان دنوں مائل کسی کا
نہ تھا میں اس قدر گھائل کسی کا

ہمارا دلبر گلفام آیا
قرار جان بے آرام آیا

ہمارے پاس جاناں آن پہنچا
دل بے جاں کو اب جان پہنچا

—

مئے و جام و گل و شراب ہے موجود
بہارِ وصل کا سامان پہنچا

—

ہے کمندِ حلقۂ گیسو بلا
دیکھ کر جس کو ہو یکسو بلا

سادگیٔ الفاظ کے ہمراہ جذبات کی تصویر ملاحظہ ہو ؎

یار کو بے حجاب دیکھا ہوں
میں سمجھتا ہوں خواب دیکھا ہوں

سراج کے کلام میں سادگیٔ الفاظ اور سادگیٔ خیال نے اُن کے مضمون آفرینی کو متاثر نہیں کیا ہے۔ دراصل یہ اُن کے اسلوب اور طرزِ ادا کی خوبی ہے کہ مضمون آفرینی اپنا پرتو خوب دکھاتی ہے۔ مضمون آفرینی کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

دل مرا زلف سے چھوٹ پھنسا ابرو میں
کفر کوں ترک کیا مائل محراب ہوا

—

رہ گئے ذوقِ تبسم میں تغافل کے شہید
بسملوں کا خوں بہا جلاد سر ساقی رہا

—

بسکہ دل محوِ خیالِ حلقۂ کاکل ہوا
پیچ و تابِ آہِ دل میں رشتۂ سنبل ہوا

—

صبح دم سیرِ چمن کا جب کیا گلرو نے عزم
ہر صدائے خندۂ گل نالۂ بلبل ہوا

—

ارے نجم صبح آنے کی خبر ہے سرو قامت کی
قیامت کل کو آئی ہے عمل کرلے تو آج اپنا

—

رشتہ میں موجِ گل کی ہوائے بہار میں
سب بلبلوں کا چاکِ گریباں رفو ہوا

—

ہمارا خونِ ناحق کب ہوا خالی ارے قاتل
زمیں میں گل ہو نکلا آسماں پر ہو شفق پھولا

—

اے سراج آفتاب رو آیا
ہے مرے گھر میں آج مہماں صبح

—

سراج کے کلام میں تشبیہ و استعارہ کے ساتھ ساتھ مبالغہ بھی ملتا ہے۔
ذیل کے اشعار ملاحظہ ہوں ؎

خطرۂ شبنم نہیں شرمندگی کا ہے عرق
دیکھ تجھ چہرے کی خوبی پھول گلشن میں لیا

—

کیوں سرنگوں نہ ہوئے تجھ ابرو کے سامنے
شرمندگی کا بار ہے پشت ہلال پر

—

بھر رہا ہے بسکہ دود آہ میرا اے سراج
آسماں جوں پردۂ فانوس کالا ہو گیا

پھول اور شبنم کو دیکھ کر شاعر کو خود اپنی ذات کا الم یاد آتا ہے ؎
خندۂ گل ہے گریۂ شبنم
ہے ہنسی یار کی مرا رونا

مبالغہ اور حُسن تعلیل کی یہ مثال دیکھیے :

نہ پوچھو آسماں پر تم ستارے
ہماری آہ کی چنگاریاں ہیں

سراج کے کلام میں واردات قلبی اور سوز و گداز کے اشعار کی بھی کمی نہیں۔ عشق مجازی سے عشق حقیقی تک کا سفر انہوں نے سوز و گداز کے شعلوں میں دود بن کر کیا تھا۔ یہی وجہ ہے اُن کے کلام میں سادگی کے ساتھ ساتھ سوز و گداز بھی ملتا ہے۔ انھیں خود بھی اپنی اس کیفیت کا اندازہ تھا — لکھتے ہیں ؎

سراج کے اشعار تیرے کیا بلا ہیں
بھبھوکے ہیں مگر سوز جگر کے

سوز جگر کے بھبھوکوں میں فنا ہوتے ہی بقا سمجھتے ہیں ؎

ہے اُسے نورِ بقا صبح ابد تک اے سراج
شمع ساں جو کوئی کمر باندھا فنا کے واسطے

جو چڑھا دار پر ہوا منصور
یہ محبت کی پہلی منزل ہے۔

وصل و ہجر کا بیان ملاحظہ ہو ؎

حالت وصل و جدائی کیا کہوں
ایک دم ہے حق میں میرے سو قرن

کونسی شب ہے کہ ہر دن سراج
درد کے آنسو سے دامن نم نہیں۔

وصل کے دن شبِ ہجراں کی حقیقت مت پوچھ
بھول جاتی ہے مجھے صبح کو ہر شام کی بات

تصوف و موعظت کے مضامین دیکھیے ؎

دیکھا ہوں ہر طرف نگہ امتحان سے
کوئی دوسرا نظر نہیں آیا جمالِ دوست

اے بت پرست دیدۂ بینا سیں دیکھ توں
اک ذات میں ظہور ہوا کئی صفات کا

—

جو اٹھا مجلسِ ناسوتی سے
محرمِ خلوتِ لاہوت ہوا

—

میخانۂ وحدت کا جو کوئی جام پیا ہے
آرام کے کوچہ سیں نکل بے خبر آیا

—

پردۂ سری کھلا ہے جس اوپر
عالمِ ظاہر کا وہ غافل ہوا

سراج کے یہاں شوخی و ظرافت کے مضامین بھی ملتے ہیں۔ انہوں نے زاہد کو اپنی ظرافت کا ہدف بنایا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

زلف کافر سیں لگی بہنے نسیم مشک بو
زاہدو بادِ خزاں ہے گلشنِ ایمان کا

—

نہیں ہے حرمت مے کی خبر تجھے زاہد
کہ میکشوں کو ہے معلوم احترام شراب

—

چاہیے زاہدوں کو حجرۂ تنگ
باغ عاشق ہے وسعت شراب

—

عشق نہیں زاہدوں کی قسمت میں
حرف تقدیر کو نہیں تبدیل

—

محراب بیچ سجدہ ریائی ہے زاہدو
ان ابروؤں کو دیکھ کے قامت کو خم کرو

—

ہے ذوق بادہ کشی زاہد ریائی کو
بھرو شراب سے شکل کتاب کا شیشہ

شاہ سراج کی ایک غزل اہل حال میں بہت مقبول ہے
اور اکثر قوال اس کو پُر لطف انداز میں گاتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ
اس بحر میں ایسی رواں غزل سوائے سراج کسی نے نہیں لکھی۔

غزل ملاحظہ ہو:

خبرِ تحیرِ عشق سن، نہ جنوں رہا نہ پری رہی
نہ تو توں رہا نہ تو میں رہا جو رہی سو بے خبری رہی

چلی سمتِ غیب سیں کیا ہوا کہ چمن سرور کا جل گیا
مگر ایک شاخِ خیالِ غم جسے دل کہیں سو ہری رہی

شہِ بے خودی نے عطا کیا مجھے اب لباسِ برہنگی
نہ خرد کی بخیہ گری رہی نہ جنوں کی پردہ دری رہی

نظرِ تغافلِ یار کا گلہ کس زباں سیں بیاں کروں
کہ شرابِ صد قدح آرزو خمِ دل میں تھی سو بھری رہی

وہ عجب گھڑی تھی کہ جس گھڑی لیا درس نسخۂ عشق کا
کہ کتاب عقل کی طاق پر جیوں دھری تھی یوں ہی دھری رہی

ترا جوشِ حیرتِ حسن کا اثر اس قدر سیں یہاں ہوا
کہ نہ آئینہ میں جلا رہی نہ پری کو جلوہ گری رہی

کیا خاک آتشِ عشق نے دلِ بے نوائے سراج کوں
نہ خطر رہا نہ حذر رہا مگر ایک بے خطری رہی

شاہ سراج نے ۱۷۴۷ء میں اردو میں مثنوی "بوستان خیال" لکھی۔ روانی، برجستگی، سادگی اور اثر آفرینی اس کی اہم خصوصیات ہیں۔ مثنوی آپ بیتی پر مبنی ہے۔ منور احمد مجددی مثنوی "بوستان خیال" کے بارے میں لکھتے ہیں:

"یہ قصہ بہت غیر معمولی ڈرامائی کیفیت رکھتا ہے۔ اصل قصہ یعنی خود مصنف کی سرگزشت اس سے بالکل جداگانہ حیثیت رکھتی ہے۔ مثنوی عموماً کسی تاریخی یا فرضی قصہ پر مشتمل ہوتی ہے۔ مثنوی نگار کی خوبی یہی ہے کہ صفائی، تسلسل اور سادگی کے ساتھ قصہ کو بیان کر دے۔ نہ الفاظ کے طمطراق کی ضرورت ہے، نہ بلند پردازی اور مضمون آفرینی کی۔ اس لحاظ سے سراج کی مثنوی خاص اہمیت رکھتی ہے۔ واقعہ بالکل سیدھا سادھا ہے اور کسی حیثیت سے مافوق الفطرت نہیں جیسا کہ عموماً اردو مثنویوں میں ہوا کرتا ہے۔"[۱]

---

[۱] غفور احمد مجددی "شاہ سراج اورنگ آبادی" ص ۱۲ مضمون مشمولہ "مرقع سخن" مرتبہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور۔ سنہ اشاعت ۱۹۳۵ء

پروفیسر عبدالقادر سروری "بوستان خیال" کے بعض حصوں کو میر حسن کی "سحر البیان" سے زیادہ بہتر بتاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "بوستان خیال" دکن کی بہترین مثنوی ہے۔[1] پروفیسر گیان چند جین اُردو مثنوی کا ارتقاء بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"سراج کی بوستان خیال غیر معمولی اہمیت کی حامل ہے ...... بوستان خیال میں مثنوی میر حسن کی طرح حسن فطرت بھی پیش کیا گیا ہے"۔[2]

غفور احمد مجددی نے سراج کی مثنوی "بوستان خیال" پر اظہار خیال پر اظہار خیال کرتے ہوئے اس بات کا اظہار کیا ہے کہ اس میں شاعر نے اپنی ہی سرگزشت بیان کی ہے۔ مثنوی کے ابتدائی اشعار ملاحظہ ہوں:

ارے ہم نشینو ذرا دکھ سنو
مرے دل کے گلشن کی کلیاں چنو
مرے پر عجب طرح کے درد ہیں
کہ سب درد اس درد کے گرد ہیں

---

[1] پروفیسر عبدالقادر سروری "اُردو مثنوی کا ارتقاء" ص ۹۸ طبع اول
[2] پروفیسر گیان چند جین "اُردو مثنوی شمالی ہند میں" ص ۱۲۱ سنہ اشاعت ۱۹۶۹ء۔

فلک ہو تو اس چوٹ میں جائے لوٹ
جگر کے جگر کے جگر میں ہے چوٹ

کہوں کیا کلیجہ میں سوراخ ہے
مری داستاں شاخ در شاخ ہے" ؎[1]

شاہ سراج اورنگ آبادی کے دیوان میں تقریباً پانچ ہزار شعر ہیں۔ جس میں ردیف وار غزلیں، مثنویاں، مخمس، ترجیع بند، رباعیات سب کچھ موجود ہیں۔ ذیل میں سراج کی چند رباعیاں درج کی جاتی ہیں:

ہر آن ترے خیال سے میں ہوں مشغول
یک بار نگاہ مہربانی سیں نہ بھول
بندہ ہوں ترا ہمیشہ جان و دل سیں
اے قادر بے نیاز کر مجھ کوں قبول ؎[2]

تھا عین نماز میں کہ ساقی آیا
بھر ساغر مئے مرے مقابل لایا
یہ اس کوں اشارے میں کہا تائب ہوں
بولا کہ شتاب لب پیاں سوں پایا ؎[3]

؎[1] سراج "بوستانِ خیال" مرتبہ پروفیسر عبدالقادر سروری
؎[2] و ؎[3] ماخوذ از "دکنی رباعیاں" مرتبہ ڈاکٹر سیدہ جعفر ص ۱۲۵ و ص ۱۲۶
سنہ اشاعت ۱۹۶۶ء

ایک اور رباعی ملاحظہ ہو ۔

مجھ دل پہ وفورِ غم نے باندھا ہے کھلا
ہر آن صنم کی تیغ مبرا ہے گلا
کیا طرفہ لگن لگی ہے جانی میں مجھے
دیکھو تو حجاب اور نہ دیکھو تو بلا [1]

سراج کی رباعیوں کے موضوع تصوف اور عشق ہیں جس طرح غزل میں سراج کا طرزِ ادا سادگی شیرینی دلفریبی اور جاذبیت پر مبنی ہے اسی طرح اُن کی رباعیوں میں بھی یہ تمام خوبیاں پائی جاتی ہیں ۔

ولی اورنگ آبادی کے داعیٔ اجل کو لبیک کہنے کے بعد اُن کی روایت کو داود اورنگ آبادی نے بڑی خوبی سے نبھایا ۔

مرزا داود نام اور تخلص داود تھا ۔ اُن کے والد مرزا سلطان بلخ کے رہنے والے تھے عہدِ عالمگیر میں اورنگ آباد آئے اور شاہی ملازمت اختیار کی ۔ عالمگیر نے اُن کی

---

[1] سراج اورنگ آبادی " کلیاتِ سراج " مرتبہ پروفیسر عبدالقادر سروری ص ۳۳۸

صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے انھیں اعزاز واکرام اور منصب عطا کیا تھا۔

سردار علی اپنے "تذکرہ شعرائے اورنگ آباد" میں[1] اور عبدالجبار خاں ملکاپوری نے "محبوب الزمن"[2] میں داؤد اورنگ آبادی کی لیاقت لسان اور اُن کے محاسنِ شعری کا اعتراف کیا ہے لیکن حمید اورنگ آبادی نے "گلشنِ گفتار"[3] میں لکھا ہے کہ داؤد نے باقاعدہ تعلیم نہیں حاصل کی تھی اس کے باوجود اُن کے کلام میں لغزش نہیں پائی جاتی، لکھتے ہیں:

"اگر چہ بر کتاب صرف و نحو وغیرہ عبورے نداشت و لے در کلام او لغزشے ظاہر نیست۔"

داؤد اورنگ آبادی، ولی کے شاگرد تھے اور ولی کا تتبع کرنے میں فخر محسوس کرتے تھے چنانچہ اُن کے دیوان کے بیشتر اشعار میں اس بات کی جانب اشارے ملتے ہیں۔ داؤد کے ہم عصر شعراء میں سراج اورنگ آبادی، عاجز، ساقی وغیرہ

---

[1] سردار علی "تذکرہ شعرائے اورنگ آباد" ص 9 طبع اول

[2] عبدالجبار خاں ملکاپوری "تذکرہ محبوب الزمن" "تذکرۂ شعراءِ دکن" حصہ اول ص ۴۷۹

[3] حمید اورنگ آبادی "گلشنِ گفتار" مرتبہ سید محمد ص ۶۵ طبع اول

قابل ذکر ہیں۔ داؤد خود کو سراج کا مدمقابل گردانتے تھے۔ اسی لیے اپنے اکثر اشعار میں اُن پر چوٹ کی ہے۔ خالدہ بیگم جنھوں نے "دیوانِ داؤد" مرتب کیا ہے مختلف حوالوں کا تجزیہ کرنے کے بعد لکھتی ہیں:

"داؤد کی پیدائش کے ٹھیک سنہ کا تو
پتہ نہ چلا مگر اس کا اندازہ اس طرح کیا
جا سکتا ہے کہ داؤد کو سراج کا مدمقابل
سمجھا جاتا تھا چونکہ سراج کا سنہ پیدائش
۱۱۲۷ھ ہے اور داؤد نے جگہ جگہ خود کو
ولی کا جانشین لکھا ہے۔ اس بناء پر کہا
جا سکتا ہے، وہ سراج سے عمر میں
بڑے ہی ہوں گے" [1]

خالدہ بیگم نے سراج کا سنہ پیدائش ۱۱۲۷ھ لکھا ہے۔ انھیں تسامح ہوا ہے سراج کا سنہ دراصل ۱۱۲۸ھ ہے۔ بہرحال یہ ممکن ہے کہ داؤد، سراج سے عمر میں بڑے ہوں

---

[1] داؤد اورنگ آبادی "دیوانِ داؤد اورنگ آبادی" مرتبہ خالدہ بیگم ص ۳ دیباچہ سنہ اشاعت ۱۹۵۸ء

اس لیے کہ ۱۱۲۸ھ کے قریب ولی نے انتقال کیا۔ اس سنہ میں داؤد کی عمر بیس (۲۰) برس رہی ہوگی تب ہی تو انہوں نے اپنے کلام پر اصلاح لی ہوگی۔ داؤد اورنگ آبادی نے ۱۱۶۸ھ میں انتقال کیا۔

داؤد کا کلام اس اعتبار سے اہم ہے کہ اس کے ذریعہ قدیم دکنی دور کے بعد شمال کے زیر اثر اور ولی اورنگ آبادی کی کوششوں سے اورنگ آباد میں اردو زبان کا جو کینڈہ بن رہا تھا اس کی نشاندہی ہوتی ہے۔ داؤد کی زبان پر اظہار خیال کرتے ہوئے خالدہ بیگم لکھتی ہیں:

> "داود کا کلام دو سو سال[1] قدیم ہونے کے باوجود آج بھی آسانی سے سمجھ میں آسکتا ہے۔ صرف بعض بعض جگہ قدیم الفاظ، محاورات اور نامانوس انداز بیان ملتا ہے۔ یہ اس عبوری دور کے شاعر ہیں جب کہ قدیم رنگ کی شاعری ختم ہوتی ہے اور نئے طرز کا آغاز ہوتا ہے۔ اس عبوری دور کا مرکز

---

[1] اگر داؤد اورنگ آبادی کی پیدائش جیسا کہ خالدہ بیگم نے لکھا ہے سراج سے قبل اور ۱۱۰۰ھ متصور کی جائے تو آج ان کا کلام تقریباً تین سو سال قدیم قرار دیا جائے گا۔ — بشیر الدین۔

اورنگ آباد بنتا ہے کیونکہ اس زمانے
میں اس شہر کو سیاسی اور علمی مرکزیت
حاصل تھی۔ جس کی بنا پر یہ شمالی ہند
اور دکن کے دبستان شاعری کا سنگم
بن گیا تھا۔ یہاں کے شاعروں کی زبان
ایک مخلوط شکل کی ہو گئی تھی۔ انہوں
نے نہ تو ٹھیٹ دکنی اردو کلام موزوں
کیا اور نہ ٹھیٹ اردوئے معلیٰ شاہجہاں آباد
میں یہی وجہ ہے کہ ان کی زبان میں گولکنڈہ
اور بیجاپور کے قدیم شاعروں کی خصوصیات
کے ساتھ ساتھ اردوئے معلیٰ کی خصوصیات
بھی ملتی ہیں۔ داؤد اسی دور کی پیداوار
ہیں ـــــ " [1]

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ داؤد کو اپنے کلام کی خوبی کا
بخوبی اندازہ تھا چنانچہ اکثر اشعار میں تعلی کرتے ہوئے کلام

---

[1] ایضاً ص۔

اعجازِ بیان پر فخر کا اظہار کیا ہے۔ دو شعر دیکھئے ؎

سن کر اے داؤد تیری شاعری
ملک سب ہندوستان کا دنگ ہے

—

گوش رکھ سنتا ہے اے داؤد یار
ہر سخن تیرا در شہوار ہے

اپنے سخن کے چراغ کے روشن ہونے اور سراج کے رشک سے جل جانے کا بیان ایک شعر میں کیا ہے، لکھتے ہیں ؎

جب سے روشن ہے مجھ سخن کا چراغ
اشک سیتیں سراج جلتا ہے

دیوان داؤد کی پہلی غزل دیکھیے، حمد و نعت و منقبت سے معطر ہے۔ غزل کیا ہے مثنوی کی ابتدا معلوم ہوتی ہے دراصل غزلِ مسلسل ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

ابتداء لکھتا ہوں اسم اللہ کا

کھینچ مد دیوان پہ بسم اللہ کا

بعد حمد و ذکر اللہ احمد

شغل ہے نعت رسول اللہؐ کا

فرض ہے نعت رسول اللہؐ بعد

منقبت کہنا ولی اللہ کا

عشق اولاد علیؓ آساں نہیں

ہے کٹھن سالک سفر اس راہ کا

پیر کامل بن پہنچا راہ حق

کام میں داؤد ہر گمراہ کا [1]

داؤد اورنگ آبادی کے دیوان سے چند اشعار منتخب

ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔

عزیزاں خواب میں دیکھا ہوں اس سرو قامت کوں

ہوا معلوم وقت آیا ہے میری سرفرازی کا

---

[1] دیوان داؤد اورنگ آبادی ص ۹

صاف دل ہے آرسی مانند
نت ہے حیراں جمال روشن کا

—

غبار معصیت سوں زنگ ہے آئینۂ دل پر
کرے گا پاک اور صاف اس کوں آب اشک ندامت کا

—

مجھے لکھنا ہے وصف اوس گلبدن کا
اگر کاغذ ملے برگ سمن کا

—

تن کے فانوس میں دل آتش غم سوں ہے گداز
شمع مانند جلا تھا مجھے معلوم نہ تھا

—

صاف دل ہو گر ہے تجھ کوں خواہش ترک ہوا
آب آئینہ اوپر آتا نہیں ہرگز حباب

—

تحصیل علوم عشق کرے
تجہ مکہ کی کتاب خوب ہے خوب

—

سوز پروانہ آج رو رو کر
شمع کرتی ہے بزم میں تقریر

—

تجہ کوں سونا ہے اگر اہل نظر
مت نظر رکھ اپنی سیم و زر طرف

—

جاگ اٹھ صبح مرگ ہے درپیش
خواب غفلت میں کیوں تو سوتا ہے

—

حرف حق مت بول مخفی دل میں رکھ
گرچہ تیرا صدق جیوں منصور ہے

—

مجہ میں دل کے مرے غم کا اثر باقی ہے
صرف چشم میں انجھو کا گہر باقی ہے

—

ڈاکٹر نسیم الدین فریس داؤد کے کلام کا جائزہ لیتے ہوئے رقمطراز ہیں:

"دکنی ادب کی تاریخ میں داؤد کی اہمیت یہ ہے کہ وہ اس عبوری دور کے شاعر ہیں جب دکنی زبان اور اس کا مخصوص رنگ دھیرے دھیرے ریختہ اور اس کے جدید پھیلتے اور ابھرتے ہوئے رنگ میں مدغم ہورہا تھا۔ انہوں نے ولی کی قائم کردہ روایت کی تکرار کی اور ولی کے اسلوب زبان اور رنگ سخن کو مقبول بنانے میں بھرپور حصہ لیا۔" [1]

خالدہ بیگم کے مرتبہ دیوان داؤد اورنگ آبادی میں صرف غزلیں شامل ہیں۔ دوسری اصناف سخن نہیں۔ ڈاکٹر سیدہ جعفر نے داؤد اورنگ آبادی کی ایک رباعی دریافت کی ہے جو ان کی مرتبہ تصنیف "دکنی رباعیاں" میں شامل ہے۔ ملاحظہ ہو ۔

---

[1] ڈاکٹر نسیم الدین فریس "اٹھارویں صدی کی دکنی شاعری کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ" مقالہ غیر مطبوعہ ص ۲۷۶ مخزونہ لائبریری شعبۂ اردو حیدرآباد یونیورسٹی۔ حیدرآباد۔

"ہم وصفِ علی میں جینا یاری دیکھے
الائش کثرت سیں جدائی دیکھے
دیکھا دیکھا نہ دیکھا جا تھا
در پردہ ہم بندے کی خدائی دیکھے" [1]

سراج اور داؤد کے ایک ہم عصر نواب صمصام ملک میر عبدالحئی خاں صارم تھے جو کہ آصف جاہ اول کے دیوان تھے۔ ۱۱۴۲ھ میں اورنگ آباد میں پیدا ہوئے۔ تعلیم و تربیت کے بعد اپنی قابلیت کی بناء پر آصف جاہ کے دربار میں رسائی حاصل کی۔ کم عمری میں یعنی تیس برس کی عمر میں ۱۱۷۲ھ میں انتقال کیا۔ [2] ولی اور سراج کے انداز میں کلام ملتا ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں [2]

میں مدت کے بعد ایک دم جو سویا
دیکھوں تو جھ کنے ہے صنم گویا

---

[1] سیدہ جعفر "دکنی رباعیاں" ص ۱۶۹
[2] تذکرہ شعرائے دکن

سجن تجہ زلف میں پل پل رہا ہے
ہمارے ہاتھ میں کب دل رہا ہے

—

نہیں کھلتا بہار و باغ سوں دل
یہی عقدہ مجھے مشکل رہا ہے

—

ازبسکہ تم اب عشق کی سیکھیں گھاتیں
سب بھول گئے شادی کی باتیں

—

مجھے گر جاں کنی کا حکم وہ شیریں دہاں کرتا
کہاں اس کا خدا کی سوں اے یار و بیاں کرتا

داؤد اور صارم کے ہم عصروں میں سید اعظم اعظم
اور مرزا ابدال بیگ ابدال کے نام بھی ملتے ہیں۔ یہ دونوں شعراء

برہان پور کے متوطن تھے۔ ولیؔ کا زمانہ بھی دیکھا تھا۔ ابتلؔ کے کلام کی حمد اور اورنگ آبادی کے کلام اور فصاحت کی تعریف کی ہے۔

غضنفر حسین غضنفرؔ بھی اسی زمانے کے شاعر ہیں۔ اُن کی صرف ایک مثنوی دستیاب ہوئی ہے جو تاریخی واقعہ پر قلمبند کی گئی ہے۔ مزید کلام اب تک پردۂ خفا میں ہے۔ غضنفرؔ نے آصف جاہ اول اور مغل صوبہ دار عالم علی خاں کے درمیان ہونے والی جنگ کو مثنوی کی ہیئت میں بیان کیا ہے۔ مثنوی کا نام "جنگ نامہ عالم علی خاں" ہے۔ اس مثنوی کو مولوی عبد الحق نے انجمن کے ترجمان رسالے "اردو" کے جنوری ۱۹۳۲ء کے شمارے میں اپنے مقدمہ کے ساتھ شائع کیا ہے۔ مثنوی کی ابتداء حمد سے کی ہے۔ ذیل میں دو شعر درج کئے جاتے ہیں ؎

اول حمد واجب ہے کرتار کا
دو عالم کے وارث خریدار کا

—

قضا اور قدر جس کے ہے ہاتھ
نہیں شک شبہ کچھ کسی بات میں سلہ

سید محمد حسین شاہ تنویر بھی اسی عہد کے شاعر ہیں۔ آپ کا تعلق حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت بخاری سے تھا۔ ۱۰۸۱ھ میں بیجا پور میں تولد ہوئے۔ عادل شاہی سلطنت کا آخری زمانہ دیکھا۔ طویل عمر پائی۔ عادل شاہی سلطنت سے نواب میر نظام علی خاں آصف جاہ ثانی تک کا عہد دیکھا۔ ایک سو پانچ برس کی عمر میں ۵ر جمادی الثانی ۱۱۸۶ھ میں وصال ہوا۔ ضلع اننت پور میں مزار ہے۔ اورنگ آباد کے شعراء کے برخلاف شاہ تنویر کا کلام دکنی لب و لہجہ کا حامل ہے۔ مضامین تصوف سے مملو ہیں۔ نثر میں بھی کچھ رسالے ملتے ہیں۔ چنانچہ رسالہ "غیبت" "رسالہ قادریہ" "عقاید صوفیا" کے علاوہ مثنوی "اسرار توحید" دیوان یادگار ہے۔

مثنوی "اسرار توحید" سے ایک اقتباس دیکھیے :

ذات کو ہر شے کے تیئں ہے انقلاب
اور صفت کو انفکاک و انسلاب
جو کہ آب آتش نہووے عکس نیز
سلب نا ہوے فرقِ آتش غرقِ آب
تا ہوئے صرف عدم محض وجود
حال بیداری نہووے حالِ خواب
نام مبدل ذات متغیر صفات
یہ عقاید سنت دراہ صواب [1]

شاہ میر کی غزل دیکھیے :

---

[1] ماخوذ "دکن میں اردو" از نصیر الدین ہاشمی

تیرا خدا ہے جو کہ ترے سے جدا نہیں
جو کوئی جدا ہے تجھ سے او تیرا خدا نہیں

ہے آفتاب روز سے ایک دم نہیں جدا
گر ہو جدا تو جان وہ شمس الضحیٰ نہیں

تیرا نبی نہیں ہے ترے سے علٰحدہ
جو ہے علٰحدہ وہ پیغمبر ترا نہیں

جیسا کہ اصل چھاؤں سے یکدم نہیں جدا
گر ہو جدا تو اصل اوس چھاؤں کا نہیں

جو رہنما ترا ہے ترے ساتھ ہے مدام
گر ہو نہ تیرے ساتھ ترا رہنما نہیں

کہتے ہیں جس کو خلق محمد وہ ہے خدا
یعنی خدا وہ جدا وہ محمد جدا نہیں ۳

---

۳ مأخوذ رسالہ "نوائے ادب" بمبئی جولائی ۱۹۵۳ء ۶

شاہ میر کے ہاں تصوف کے مضامین اہمیت رکھتے ہیں۔
مندرجہ بالا غزل دراصل غزلِ مسلسل ہے۔ جس میں تصوف
کا مضمون "خدا اور بندہ کے رشتہ کو بیان کیا گیا ہے۔
اس غزل مسلسل کی زبان قابل توجہ ہے۔ یہ زبان سراج
اور داؤد کی زبان سے مختلف ہے اور اس میں قدیم دکنی لہجہ و املا
ملتا ہے جو کہ خانقاہی طرز اسلوب کی نشاندہی کرتا ہے۔
سیدہ جعفر نے شاہ میر کی ایک رباعی اپنی تصنیف میں درج
کی ہے جو ذیل میں نقل کی جاتی ہے۔

شہ میر نہ کر فکر توں کچ خود کا واللہ
رزاق ترا قادر و قیوم ہے اللہ
پیدا ہے جن نے موکوں وہ کیا رزق نہ دیوے
لاحول ولا قوۃ الا باللہ[1]

---

[1] سیدہ جعفر "دکنی رباعیاں" ص ۱۸۳

شاہ میر کے ایک ہم عصر اور اردو کے ایک اہم ترین شاعر سید عبدالولی عزلت ہیں۔ عزلت سورت میں ۱۱۰۵ھ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد حاجی شاہ سعداللہ اپنے زمانے کے معروف صوفی تھے۔ ان کے دبدبہ و وقار کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ اورنگ زیب عالمگیر جیسے شرع کے پابند شہنشاہ سے اُن کی خط و کتابت تھی۔ نسبتاً کاظمی اور مشرباً قادری تھے۔ مولانا عبدالشکور سے خرقہ خلافت پایا تھا۔ ۲۶ رجمادی الاول ۱۱۸۹ھ کو انتقال کیا۔

سید عبدالولی عزلت نے ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی۔ فطری شاعر تھے۔ سیر و سیاحت کا بہت شوق تھا۔ سورت سے اورنگ آباد آئے۔ وہاں سے ۱۱۶۵ھ میں دہلی پہنچے۔ میر تقی میر سے ملاقات کی۔ شعر و شاعری کی محفلیں جمی۔ میر نے عزلت کی بیاض سے دکنی کے بیشتر شعراء کی سوانح و کلام نوٹ کیا تھا اسی کے حوالے سے اپنے تذکرہ "نکات الشعراء" میں دکنی شعراء کا حال و کمال درج

گیا ہے۔ دہلی میں کچھ عرصہ رہنے کے بعد عزلت بنگال گئے۔ مرشد آباد میں کچھ عرصہ رہے، نواب علی وردی خاں ناظم بنگالہ کے مصاحب ہوئے۔ نواب کی وفات کے بعد اورنگ آباد آئے۔ یہ نواب میر احمد خاں ناصر جنگ کا عہد تھا۔ ناصر جنگ نے بڑی توقیر کے ساتھ دربار میں مدعو کیا اور عزلت کو فکر معاش سے آزاد کر دیا۔ ناصر جنگ کی شہادت کے بعد عزلت حیدرآباد آ گئے۔ حیدرآباد ابھی سلطنت آصفیہ کا دارالسلطنت نہیں بنا تھا۔ عزلت نے حیدرآباد ہی میں ۱۱۸۹ھ میں انتقال کیا اور دائرہ میر مومن میں آسودۂ خاک ہیں۔

سید عبدالولی عزلت ولی دکنی کے بعد دکن کے ایسے شاعر ہیں جن کا ذکر بخیر شمال و جنوب کے ہر تذکرہ نگار نے کیا ہے۔

عزلت اپنے زمانے کے مشہور و مقبول شاعر تھے۔ افضل بیگ قاقشال نے "تحفۃ الشعراء" میں لکھا ہے کہ وہ "فارسی اور ہندی"

اپنی یادگار چھوڑا ہے۔ اس کے علاوہ مثنوی "راگ مالا"
"ساقی نامہ" اور "بارہ ماسی" ان کی تخلیقات ہیں۔

"دیوان عزلت" اور مثنوی "راگ مالا" کو
عبدالرزاق قریشی نے مرتب کیا اور اردو ریسرچ انسٹی
ٹیوٹ بمبئی سے شائع کیا ہے۔ چند شعر اور ایک غزل
ذیل میں درج کی جاتی ہے ؎

قتلِ عزلت سے نہ منکر ہو کہ گل کے مانند
لب پہ ہنستا ہے ترے خون نمایاں تیرا

—

آج دل بے قرار ہے میرا
کس کے پہلو میں یار ہے میرا

—

خدا کے حمد میں کہتا ہوں ہر دم
کیا ایک حرف میں جب دو عالم

درود مصطفیٰ آل و اطہر
کیوں ہووے موبموا اپنا زباں کر

غزل ملاحظہ ہو ـــــ

جل ہوا کا جل کس تن کی طولیا کے واسطے
خوں ہوا کس کے ہاتھوں کی حنا کے واسطے

دیکھتا ہوں جمع کر خاطر پریشاں کی راہ
کر رہا ہوں کس کے کوچے کی صبا کے واسطے

اس عرق ریزاں خوش کی چاہ کا ہوں میں مریض
سیب کا شربت ہے یہ میری دوا کے واسطے

شور بلبل سن عدم کے خواب میں جاگیں گے لوگ
مت دہر و گل کو کسی کی قبر او پر خدا کے واسطے

مثل غزلت باب عرفاں خود بخود تجھ پر کھلے
دل کو جیوں آئینہ روشن کر خدا کے واسطے

مثنوی "راگ مالا" سے

ڈاکٹر حبیب نثار جنھوں نے "اردو ادب اور موسیقی"
کے موضوع پر تحقیق کی ہے یہ اطلاع دیتے ہیں کہ "عزلت
کی راگ مالا اردو میں لکھی جانے والی پہلی مکمل راگ مالا ہے"۔ [۱]
راگ مالا میں ہندوستانی موسیقی کے راگ/راگنی، ان کے پتر
اور ان کے بھارجہ (پوتے، پتیرے) کی تفصیل ملتی ہے۔ ڈاکٹر
نثار اس کی توضیح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ کسی بھی راگ میں
پانچ سے سات سُر ہوتے ہیں۔ سُروں کی ترتیب کی
مناسبت سے ان کے خاندان تشکیل دیے گئے ہیں۔
راگ مالا میں راگ/راگنی کے اسی خاندان کی تصویریں
رنگوں اور لفظوں میں کھینچی جاتی ہیں۔ اس طرح ایک خاندان
میں جیسے ٹھاٹھ کیا جاتا ہے۔ چھ راگ ان کی چھتیس ۳۶
راگنیاں اور پھر ہر راگنی کے چھ چھ پتر (بیٹے) اور پھر ہر

---

[۱] ماخوذ "اردو ادب میں ہندوستانی موسیقی ایک جائزہ" از حبیب نثار
ص ۱۱ مقالہ غیر مطبوعہ، مخزونہ کتب خانہ شعبۂ اردو
حیدرآباد سنٹرل یونی ورسٹی۔ حیدرآباد۔

ہیئر کے چھ چھ بھارجہ ہوتے ہیں — کسی بھی راگ مالا نظم میں اس راگ کے وقت، پس منظر اور ماحول و موسم کی نشاندہی کی جاتی ہے۔ اس لیے کہ راگ کے صحیح اثر پذیری کے لیے اُسے اُس کے متعینہ وقت اور ماحول کے مطابق گانا ضروری ہوتا ہے۔ تب ہی راگ و راگنی سر چڑھ کر بولتی ہے اور اسی لیے "بے وقت کی راگنی" کا محاورہ مروج ہوا ہے۔ ؂

مثنوی "راگ مالا" کا ایک اقتباس دیکھیے ؎

عمارت ایک سر کوبِ فلک تھی
در و دیوار میں مہ کی جھلک تھی
مرصّع تخت پر بیٹھا جواں ایک
کہ دولت اور طرب کا مراں ایک
قبا دلچسپ تھی سبز اس کے بر میں
کلاہ سر مغرق تھی گہر میں

؂ تفصیل ڈاکٹر حبیب نثار کے غیر مطبوعہ مقالہ متذکرہ سے اخذ کی گئی ہے۔

خطِ سبز اس کا روشن تھی نمایاں   تھی جب پر کا تھا سر ریحاں
اور اس کے گرد میں تھی اک پری کا او   منہ اس کا نقشہ جبیں اور زلف جادو

غزلت کے "بارہ ماسی" کا ایک اقتباس دیکھیے

دل بے معشوق عالم میں کہاں ہے
جو صبح ہوں تو شام عشق جاں ہے
چکوریں ماہ کی قرباں ہیں با شوق
گلے میں قمریوں کے سرو کا طوق
سمندر کو ہے آتش آبِ حیواں
گل مکرند و کا الفت جانِ تاباں
جو بلبل ہے تو گل اوپر فدا ہے
پتنگا شمع کے منہ پر جلا ہے
ہوا ہے کوہ کن شیریں کا مفتوں
ملا اک جلوہ لیلیٰ سے مجنوں

* بارہ ماسی کو بارہ ماسہ بھی کہتے ہیں۔ یہ نظم سنسکرت و ہندی

اصناف سخن سے ماخوذ ہے۔ اس نظم میں برس کے بارہ مہینوں یعنی تینوں موسموں میں ہجر زدہ عورت کے جذبات کا بیان کیا گیا ہے۔

عزلت کے دیوان میں رباعیاں بھی موجود ہیں جو آزاد میں آٹھ ہیں۔ ذیل میں عزلت کی صرف دو رباعیاں درج کی جاتی ہیں ؎

اول مئے عشق اپنے سے بے ہوش کیا
یاد اپنی دے پھر ہم کو فراموش کیا
ہم نے ابھی جرس وار اے یار سفری
دم کو نالاں لبوں کو خاموش کیا

روشن دلوں کے وقار میر کر لو نظر
جاوے ہے نہاں آنکھوں سے آئینے کے گھر
حیراں ہوں تمہارا دیکھ منہ سخت نہ کہو
گر سالو تو دیکھو یار غیرت تو پتھر

سید عبد الولی عزلت سورت سے اورنگ آباد اور پھر دہلی، کلکتہ کا سفر کرنے کے بعد اورنگ آباد لوٹے اور وہاں سے حیدرآباد پہنچے اور یہیں مکہ مسجد کی سیڑھیوں پر حیدرآباد کا پانی پیا اور اسی سرزمین کے ہو گئے۔ حیدرآباد ہی میں ان کا انتقال ہوا اور دائرۂ حضرت میر مومن میں تدفین عمل میں آئی۔

عزلت کے ایک کم عمر ہمعصر تمنا تھے۔

میر اسد علی خاں نام اور تخلص تمنا تھا۔ ۱۱۶۸ھ میں اورنگ آباد میں پیدا ہوئے۔ تمنا کے والد سید علی خاں[1] نواب نواب صلابت جنگ کے دربار میں فوج داری اور وقائع نگاری کے اہم عہدوں پر فائز تھے۔ تمنا بچپن ہی میں حیدرآباد چلے آئے۔ جب ارسطو جاہ مدارالمہام ہوئے تو تمنا[2] ان کے دربار سے وابستہ ہو گئے اور انہی کے توسط سے نواب نظام علی خاں آصف جاہ ثانی کے دربار تک رسائی حاصل کی۔ تمنا اپنے عہد کے ایک باکمال شاعر ہوئے

۱؎ ڈاکٹر مہر جہاں "میر اسد علی تمنا" ص ۹

۲؎ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو "تذکرہ محل عجائب" ص ۱۳، ص ۱۴

ہیں۔ انہوں نے تقریباً تمام مروجہ اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ غزل اور قصیدہ میں کمال دکھایا ہے۔ انہوں نے اردو اور فارسی شعراء کا تذکرہ "گل عجائب" کے نام سے ۱۱۹۲ھ میں لکھنا شروع کیا۔ جس کی تاریخ خود انہوں نے ہی کہی ہے۔ دیکھیے:

قطعہ تاریخ آغاز تذکرہ

چوں ایں تذکرہ را نمودم شروع

زحق است اُمید اتمام او

تمنا بتاریخ سالش زمن

خود گفت آغاز نسخہ بگو

۱۱۹۲

مولوی عبدالحق نے "گل عجائب" کو مرتب کیا ہے[1]۔ انہوں نے اس تذکرے کی تاریخ اختتام ۱۱۹۵ھ لکھی ہے۔ ڈاکٹر حنیف نقوی نے "گل عجائب" کی ابتداء اور اختتام دونوں ہی

---

[1] اسد علی خاں تمنا "گل عجائب" مرتبہ مولوی عبدالحق شائع کردہ انجمن ترقی اردو اورنگ آباد ۱۹۲۸ء

تاریخوں سے اختلاف کیا ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ تمنّا نے تذکرہ ۱۱۸۳ھ[1] میں ہی لکھنا شروع کیا تھا۔ ڈاکٹر حنیف نقوی کے اس اختلاف کو ڈاکٹر لئیق صلاح[2] ان کے قیاسات قرار دیتے ہیں۔

اسد علی خاں تمنّا کے تذکرے "گلِ عجائب" میں حسب ذیل قطعات تاریخ اختتام درج ہیں۔[3]

تذکرۂ شاعراں شد چو تمام ایں زماں
شد دل و جانِ حزیں منتہج و شادماں
داشت تمنّا دلم فکر بتاریخِ او
آمدہ آوازِ غیب شکر خدائے جہاں
۱۱۹۷

---

[1] ڈاکٹر حنیف نقوی "شعرائے اردو کے تذکرے" ص ۲۷۸ سنہ اشاعت ۱۹۷۶ء لکھ
[2] ڈاکٹر لئیق صلاح "عہد ارسطو جاہ علمی و ادبی خدمات" ص ۳۹۲ سنہ اشاعت ۱۹۸۶ء
[3] اسد علی خاں تمنّا "گلِ عجائب" ص ۱۷۵ شایع کردہ اتر پردیش اردو اکیڈمی لکھنؤ سنہ ۱۹۸۵ء

ہزار شکر جناب مولیٰ کہ تذکرہ شد تمام اکنوں
درود بر ختم مرسلیں و بر آل او باد ہمیشہ و ہم
برائے تاریخ سال ختمش چو بود در دل مرا تمنا
گل عجائب شگفت نیکو گلبن سادہ گفت طبعم
۱۱۹۶ھ

ان دونوں قطعات میں اختلاف سنین موجود ہے۔ جس کی بناء پر ڈاکٹر حنیف نقوی نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ۱۱۹۵ھ اس تذکرہ کے اختتام کی تاریخ ہوگی اور ۱۱۹۶ھ میں انہوں نے اس تذکرہ پر نظر ثانی کی ہوگی۔ [1]

تمنّا نے اپنے تذکرہ میں جملہ اکیاون [51] شعراء کا ترجمہ لکھا ہے جن میں سے صرف آٹھ شاعر شمالی ہند کے ہیں، چودہ [14] حیدر آباد دکن سے متعلق ہیں اور انیس [19] شعراء ان کے وطن اورنگ آباد سے تعلق رکھتے ہیں۔

---

[1] نصیر الدین ہاشمی "اردو کی پہلی صاحب دیوان شاعرہ الف النساء امتیاز" ص ۱۷۷ مضمون مشمولہ "دکھنی (قدیم اردو) کے چند تحقیقی مضامین" سنہ اشاعت ۱۹۶۳ء

تمنا اپنے دور کے ممتاز شاعر تھے۔ انہوں نے اپنا کلیات مرتب کیا تھا۔ جس میں جملہ اصناف سخن موجود ہیں۔ ان کے کلیات کے دو نسخے دستیاب ہیں۔ ایک نسخہ کتب خانہ سالارجنگ میں مخزون ہے۔ اور دوسرے کتب خانہ آصفیہ کی زینت ہے۔ کلیات تمنا میں غزلیں قصائد، تاریخی قطعات اور رباعیوں کے علاوہ فارسی کی بھی چند غزلیں درج ہیں۔

تمنا کی شادی ۱۱۶۸ھ م ۱۷۵۷ء میں لطف النساء سے انجام پائی۔ لطف النساء خود بھی شاعرہ تھیں اور امتیاز تخلص تھا۔ امتیاز نے اپنا دیوان مرتب کیا ہے اور اس نے ایک مثنوی "گلشن شعراء" بھی لکھی ہے۔ نصیرالدین ہاشمی نے ثابت کیا کہ امتیاز اردو کی پہلی صاحب[1] دیوان شاعرہ ہے۔ جن کا دیوان ۱۲۱۲ھ میں مرتب ہوا ہے —— تخلص کی بناء پر نصیرالدین ہاشمی نے امتیاز کا تذکرہ بطور ایک مرد کے کیا تھا لیکن ساتھ ہی یہ اندیشہ بھی ظاہر کیا تھا کہ:

۱؎ نصیرالدین ہاشمی "اردو کی پہلی صاحب دیوان شاعرہ لطف النساء امتیاز" ص ۱۲۷ مضمون مشمولہ "دکھنی (قدیم اردو) کے چند تحقیقی مضامین" سنہ اشاعت ۱۹۶۳ء

"امتیاز دکن کا شاعر ہے۔ ہم کو نہیں معلوم
اس کا نام کیا تھا اور کس کا شاگرد تھا۔ کسی
قدیم اور جدید تذکرے میں اس کا حال
درج نہیں ہے۔ اختتامی شعر میں لفظ "کنز"
آیا ہے۔ اس سے خیال ہوتا ہے کہ ممکن ہے
امتیاز کوئی شاعرہ ہو" لہ

تمنا کے دیوان میں اولاً مناقب کا عنوان ہے۔ اس
میں حمد و نعت و منقبت اور مناجات کے عنوان ملتے ہیں۔ اس
کے بعد غزلیات اور پھر قصائد درج ہیں۔ انہوں نے مشکل قافیوں
اور سنگلاخ زمینوں میں طبع آزمائی کی ہے اور شعر خوب سے خوب
نکالے ہیں جس سے اُن کی شاعری کی عظمت اور قادر الکلامی کا
ثبوت ملتا ہے۔ اسی کے ساتھ اُن کے باکمال شاعر ہونے کی سند
بھی ملتی ہے۔ کلام کا نمونہ دیکھیے :-

لہ رضی الدین ہاشمی "اُردو کی پہلی صاحب دیوان شاعرہ لُطف النساء امتیاز"
مضمون مشمولہ "دکھنی (قدیم اُردو) کے چند تحقیقی مضامین" سنہ اشاعت ۹۶۳ء
ص ۱۷۷

چھوڑا کے کفر و عصیاں کا دورایا
دکھادے راہِ عرفاں بادشاہا
بچا رکھ نفسِ شیطاں سے اپنا
الٰہی معذرت خواہا ہیں ناہا

سوارِ توسنِ سنجاب نکلا
غبارِ خاطرِ احباب نکلا

کبھی شیوۂ سوز و گداز کیا
کبھی جلوۂ ناز و نیاز کیا
مرا روز اسی نے سیاہ کیا
شبِ زلف کو جس نے دراز کیا

نہ ہے لطف و کرم نہ ہے مہر و وفا
وہی طرزِ ستم، وہی رسمِ جفا

ہوا باغ باغ گلبدنوں کی بہار دیکھ
لب واہ زلف واہ ہے چشم سیاہ واہ

—

تیرے کوچے میں ہم آنکھوں سے چلے ہیں آ دیکھ
راہ سب کرتے ہوئے اشک فشاں کاٹے

—

مت کہہ کہ جیب چاکوں کی دیتے ہیں داد ہم
دامن کو کھینچ لیتے ہیں قاتل سمجھ ابھی

—

اس کا بوسہ لیا میں نے تو جھڑک کر بولا
چھوڑ دے بس میرے ہونٹوں کی دھڑی جاتی ہے

—

عنایت اور بھی کچھ ہو گی یا نہیں کہہ دے
تو بوسہ دے کے عبث دل کو چاٹ دیتا ہے

وہ تیرے ناز کو میرے نیاز کو پہونچے
جو حسن و عشق کو آپس میں بانٹ دیتا ہے

—

اللہ رے دل کا کوئی نہیں محرم مرے سوا
داغِ جگر تجھی کو دکھانا کبھو کبھو

—

جائے عبرت ہے یہ دنیا نہ اٹک زلفوں میں
کفِ افسوس کو اے دل تو یہاں سے مل چل

تمنا نے اپنی غزلوں میں محبوب کا ذکر کیا ہے وہ ماورائی اور ملکوتی حسن کا مالک نہیں بلکہ غالب اور مومن کے محبوب کی طرح اسی آب و گل کی دنیا کا رہنے والا ایک عام انسان ہے جو سیدھا سادا اور معصوم بھی ہے اور اسی کے ساتھ ہرجائی پن بھی رکھتا ہے ۔

تیرا ملنا اس سے گر ہووے تو میں جانوں
وہ ہرجائی اگر اس وقت گھر ہووے تو میں جانوں

—

وہ مجھ کو جان کر انجان جانتا ہی نہیں
یہ بھولے پن کے میں قربان جانتا ہی نہیں

تمنا نے اپنی غزلوں میں داخلی کیفیات و احساسات کو بڑی نزاکت سے پیش کیا ہے۔ جذبات و احساسات میں تنوع موجود ہے جو کیفیات انہوں نے بیان کی ہیں وہ فطری محسوس ہوتی ہیں۔

صدا بھی کہاں تک اس کے نہ پہنچے
تمنا تو نے رویا یا کرایا

—

بلبل قسم ہے حضرت گل کی صبا سے پوچھ
ہیں بے دماغ باغ میں غنچہ کی بو سے ہم

—

آستیں بھیگی ہے لب خشک تمنا کیا وجہ
مژہ نمناک ہیں اور تر ہیں ہماری آنکھیں

اسد علی خاں تمنا کے قصائد کے دو نمونے دیکھیے۔ پہلا قصیدہ
حضرت امام سجاد کی مدح میں ہے۔ اقتباس دیکھیے :

کہا میں ایک دن اوس سے کہ او ستم ایجاد
جفا و جور کہاں تک، کہاں تک بیداد
کئی دنوں سے یہ احوال ہے کہ واقف نہیں
سرور دل ہے کدھر اور کدھر ہے خاطر شاد
نہ رات کو مرے نالوں پہ رحم ہے تجھ کو
نہ میرے بخت ہی کرتے ہیں ان دنوں امداد
نہ میرے حال پہ الطاف ہے نہ مہر و کرم
نہ اگلی باتیں جو بھولی ہیں اپنی وہ ہی یاد
تباہ کیوں نہ ہوا ایسے مزاج سے فریاد
یہ دل کہ شیشہ ہو کس طرح بیضۂ فولاد

یہ کہہ کے وہاں سے ہوا رخصت جلا بیاباں میں
کہ شہر کو کروں ویراں و دشت کو آباد

تمنا کے دوسرے قصیدے میں جو کہ نواب نظام علی خاں آصف جاہ ثانی کی مدح میں لکھا گیا ہے کا اقتباس دیکھیے۔ لہجہ اور اسلوب دونوں کا مزاج و موضوع کی بناء مختلف ہے ۔

شکر صد شکر خدائے رنگ بخش جہاں
حسبِ خواہش دور کرتا ہے زمیں پہ آسماں
ہیں آثارِ شفق پر صبح سطحِ باغ دیکھ
صحنِ گلشن پر تنا ہے سرخ کیا ہے سائباں
سبزۂ روئیدہ فرشِ سبز مخمل بے گماں
ہو کے فراشِ نسیمِ صبح دم جاروب کشاں

— — — — — — — — — — —

— — — — — — — — — — —

سنبل کا طرہ ہووے اور زینتِ خیاباں
جاں زلف کا حلقہ شانہ گرہ کشا ہو
شاعر ہو اور رنگین مضمون ہو دست بستہ
پائے نگار ہو اور رنگینیٔ حنا ہو
قمری ہو اور صنوبر پروانہ اور چراغاں
میں اور حصول میری خاطر کا مدعا ہو
وہ مدعا کہ جس پر پڑھتا ہوں قطعہ تو
ممدوح سے اجابت مداح سے دعا ہو

اسد علی خاں تمنّا کے کلیات میں ۱۵ رباعیاں کہی ہیں
جو مختلف اور متنوع موضوعات پر کہی گئی ہیں۔ ذیل میں تین[۳]

اے دل میری آنکھوں سے نکل مت یکلخت
ان نرم زخموں کی دید مشکل ہے سخت
معشوقوں کو ہم بھی چاہتے ہیں لیکن
تو سب سے زیادہ ہے ارے او کمبخت

کرتا ہے بناؤ تو میرے یار عبث
ہے سایہ کے بس تجھے یہ سنگھار عبث
تو خود گل نسریں ہے اپنے کو دیکھ
کنٹھے گجرے یہ لٹکن اور ہار عبث

—

جب دہر میں آشکار ہوتی ہے صبح
سو یار تجھے دیکھ ہوش کھوتی ہے صبح
اور چشم نہیں چار چشم اے ماہ لقا
تجھ بن آٹھ آٹھ آنسو روتی ہے صبح

اسد علی خاں تمنا کا تذکرہ "گل عجائب" ہمعصر ادبی شعراء کا ترجمہ پیش کرتا ہے۔ اسی طرح تمنا ہی کے ایک ہمعصر تجلی علی شاہ تجلی کا تذکرہ "تزک آصفیہ" ۱۲۰۸ھ اپنے معاصر عہد کی تہذیب و تمدن کے نقوش پیش کرتا ہے۔

"تزک آصفیہ" کے علاوہ تجلی نے ارسطو جاہ کی مدح میں مختلف و متعدد شعراء کے لکھے ہوئے قصائد اسمٰعیل یار جنگ کے مشورہ پر ایک ضخیم مجموعہ جو تقریباً سو صفحات پر مشتمل ہے۔ ۱۲۱۵ھ میں "مجموعہ فصاحت" کے نام سے مرتب کیا۔ علاوہ ازیں تجلی نے ایک دوسرا مجموعہ جس میں ان شعرا کا کلام محفوظ کیا ہے جو کہ ارسطو جاہ کی مدح میں لکھا گیا اور جو "مجموعہ فصاحت" میں شامل ہونے سے رہ گیا تھا۔ اس مجموعہ کو انہوں نے "خزینۂ سخن" کے نام سے موسوم کیا ہے۔ ڈاکٹر زور تجلی کے ان دونوں تذکروں کی ادبی و تہذیبی اہمیت کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "شاہ تجلی کے مرتبہ یہ دونوں مجموعے اس عہد کے شعراء کے نہ صرف تذکرے ہیں بلکہ معاشرت اور حالات و واقعات و سیاست کے گویا انسائیکلوپیڈیا ہیں۔ ان کے مطالعہ سے

سنہ ۱۱۹۶ھ تا سنہ ۱۲۱۸ھ کے درمیان ۲۲ سالوں کی تاریخ پیش نظر ہو جاتی ہے۔ [1]

نصیر الدین ہاشمی "دکن میں اردو" میں "تزک آصفیہ" کو "زندہ یادگار" [2] اور "دکن کی معتبر تاریخ" [3] قرار دیتے ہیں۔ پروفیسر عبد القادر سروری اپنے ایک مضمون میں شاہ تجلی کے سیرت و کردار کا بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "شاہ تجلی جن کا اصلی نام تجلی علی ہے۔ آصف جاہ ثانی کے دربار کے مورخ اور بڑے باخدا بزرگ، صوفی اور نیک سیرت عالم تھے۔ اکثر تذکرہ نویس جو ان کی شاعری کا ذکر کرتے ہیں ان کی سیرت اور باطنی اوصاف کی بڑی تعریف کرتے ہیں لیکن ان کو محض شاعر یا مورخ کہنا ان کی مختلف النوع قابلیتوں کا صحیح اظہار نہیں ہے۔ عہد آصفی

---

[1] ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور "داستان ادب حیدرآباد" صفحہ ۱۲۰ سنہ اشاعت ۱۹۸۲ء

[2] و [3] نصیر الدین ہاشمی "دکن میں اردو" صفحہ ۴۱۶

کے علماء کے مقابلہ میں شاہ تجلی دیرہ مس

حبشیوں کے مالک ہوا۔ اس میں شبہ نہیں

کہ وہ ایک سنجیدہ مورخ اور شاعر تھے لیکن

ان کی قابلیت کا اہم ترین پہلو یہ ہے کہ

وہ اچھے مصور بھی تھے اور اچھے خوشنویس

بھی۔ چنانچہ غلام حسین خاں جوہر مولف

"تجلیات مہ لقا" (ماہ نامہ) نے ان کا

ذکر اس عہد کے ممتاز خوش نویسوں

اور مصوروں میں کیا ہے۔

عہد گذشتہ کے اکثر صوفی اور

خدارسیدہ بزرگوں کی طرح شاہ تجلی کو بھی

زرگری، آہنگری اور نجاری سے طبعی رغبت

تھی خواہ اس کو اکل حلال کا ذریعہ سمجھا وقت

گذاری کا مشغلہ بہرحال وہ فنون صنعت و حرفت

کے بھی ماہر تھے ۔۔۔ " [1]

شاہ تجلی کا سال ولادت اور سال وفات معلوم نہیں۔ پروفیسر

عبدالقادر سروری " تزک آصفیہ " کی اندرونی شہادتوں سے بحث کرتے

ہوئے شاہ تجلی کا سال ولادت ۱۱۵۱ھ / ۱۱۵۲ھ متعین کیا ہے [2]

اور تجلی کا سال وفات ۱۲۱۵ھ قیاس کیا ہے۔ [3]

شاہ تجلی فارسی اور اُردو کے اچھے شاعر تھے لیکن ان کا

اردو دیوان ابھی دستیاب نہیں ہوا ہے۔ البتہ مجموعہ وضاحت میں

ان کے چند قصائد موجود ہیں۔ شاہ تجلی نے ارسطو جاہ کے فرزند

مالی میاں کے جوانمرگی پر مرثیہ لکھا ہے۔ تجلی کے قصائد کا نمونہ

ذیل میں درج کیا جاتا ہے ۔

ہیں اب کے ایک سال میں پیدا بہار دو

اک گل پہ جھوم جھوم گرے ہے ہزار دو

۱؎ عبدالقادر سروری " شاہ تجلی علی تجلی " ص ۵۱ مضمون مشمولہ " مرقع سخن "

۲؎ ایضاً ص ۵۲

۳؎ ایضاً ص ۵۶

گل کوئی شمع کوئی سمجھ بلبل و پتنگ
قرباں ہیں صبح و شام بصد اضطرار دو

سیلاں ہے بسکہ جوشِ رطوبت سے باغ میں
سرو چمن کے بیچ ستی ہو بہار دو

موج نسیم آئینۂ آبشار سے
صیقل سا صاف کر دیا زنگِ غبار دو

یہاں تک نمو کا زور ہے نکلے زمیں کو چیر
یک بیج سے گلوں کے ہیں شاخسار دو

اے مست نیم خواب یہ نرگس کے سبد میں
منظور ہو تو ہم کھڑے ہوئیں پڑے دو چار دو

لک کھول زلف مکھڑے پہ اے رشکِ مہر و ماہ
دیکھوں میں ایک صفحہ پہ لیل و نہار دو

ایسی غزل کو طرح کروں اور یوں میں
میر بیت کے صلہ میں در شاہوار دو

دینے کو نذر دستِ شہ بی اے باغباں
گلدستہ باندلیکے رنگِ گل سے تار دو

گھر گھر میں جن کی سالگرہ کا ہے انبساط
بیٹھے ہیں آج جشن میں مل شہریار دو

ایک ہے مہ کیانی و دوم رشکِ ملک
فرقِ شہ شہی کے ہیں در افتخار دو؎۱

شاہ تجلّی کے بے شمار شاگرد تھے جن میں سے شیر محمد خان ایمان اور محمد داؤد خان شہیر نے حیدرآباد کی ادبی دنیا میں خاص مقام حاصل کیا۔

امیر علی خان تمنا اورنگ آباد کی زمین سے اُٹھے تھے اور حیدرآباد آکر انہوں نے اُردو شعر و ادب کو عہدِ آصفیہ کے عہد میں پروان چڑھانے میں اہم حصہ ادا کیا اسی طرح شاہ تجلّی نے بھی اپنی تصانیف سے اُردو تذکروں کے فروغ میں اہم رول ادا کیا اور

؎۱ پروفیسر عبدالقادر سروری "شاہ تجلی علی تجلی" ص ۸۶ تا ۸۷ مضمون مشمولہ "مرقع سخن"

اپنے تذکروں کے ذریعہ اٹھارہویں صدی کے دوسرے نصف کے تہذیبی و تمدنی نقوش کو محفوظ کرنے کا اہم فرض ادا کیا ۔

لالہ لچھمی نرائن شفیقؔ بھی تمناؔ اور تجلیؔ کے ہمعصر تھے اور انہوں نے بھی اپنی نگارشات سے اردو ادب کے فروغ میں اپنا مقدور بھر حصہ ادا کیا ۔

شفیقؔ کے والد رائے منسا رام دہلی سے نواب میر قمرالدین خاں آصف جاہ اول کے ہمراہ اورنگ آباد آئے اور معزز عہدہ پر فائز ہوئے ۔ فارسی کے ادیب و شاعر تھے ۔

لالہ لچھمی نرائن، رائے منسا رام کے گھر سنہ ۱۱۵۸ھ میں پیدا ہوئے ۔ رواجِ زمانہ کے موافق عربی و فارسی کی تعلیم حاصل کی ۔ شعر گوئی کا شوق کم عمری ہی سے تھا ۔ مولانا غلام علی آزاد بلگرامی

کی صحت گردگی اختیار کی ۔ ابتدا میں صاحب تخلص اختیار کیا پھر شفیق قرار دیا ۔ فارسی اور اُردو دونوں زبانوں میں مشقِ سخن کی ہے ۔ تاریخ سے خاص ذوق تھا ۔

شفیق نے تین تذکرے ترتیب دیے ۔ فارسی شعرا کا تذکرہ " گلِ رعنا " کے نام سے مرتب کیا ۔ ۱۱۷۵ھ میں شمال اور دکن کے دو سو تیرہ شعرا کا ایک ضخیم تذکرہ " چمنستانِ شعرا " کے نام سے ترتیب دیا ۔ اس کے علاوہ ایک اور تذکرہ " شمیمِ بے رنگ " کے نام سے مرتب کیا ۔

شفیق نے مثنوی، قصیدہ، غزل، رباعی، غرض تمام اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے ۔ کلام کا نمونہ پیش ہے :

قصیدہ :

ایک زبردست ہے میرا دلی
یک قوی دل ہے میرا لیث وبیزاہ

حق و باطل ہے جدا سے جس کے
یوں عیاں جس طرح سفید و سیاہ

یعنی نواب میر احمد خاں
اسد الملک حضرت عالی جاہ

باپ جس کا نظام دولت و دیں
جد ہے جس کا جناب آصف جاہ

شفیق کی غزل کے منتخب اشعار ذیل میں درج کیے جاتے ہیں ؎

بہار آئی جنوں نے سر اٹھایا ہے خدا حافظ
نسیم صبح نے دل کو ستایا ہے خدا حافظ

—

ہمیں کنج چمن میں چھوڑ کر صیاد جاتا ہے
خدا جانے وہ ہم سے خوش ہے یا ناشاد جاتا ہے

عاشقی نے کر دیا دونوں جہاں میں نام ور
مر گئے ہیں ورنہ مجنوں سے یہاں لاکھوں کروڑ

—

اب یقیں کی یاد میں صاحب مگر روتا ہے ابر
کوکتی ہیں کوئلیں اور شور تو کرتے ہیں مور

—

ہر جہت باد صبا کے یہ قدم کا فیض ہے
مرقد بلبل پہ گل جو یوں چراغاں ہو گئے

—

قتل پر کس کے چلا ہے یہ ستم گار کہ بس
آستینوں کو چڑھا یا کھینچ کے تلوار کہ بس

—

آخری دم ہے ٹک اک دیکھ جا اے ظالم
بے طرح آج تڑپتا ہے یہ بیمار کہ بس

—

کس طرح بیمار دل کی ہم تسلی چاہیں کر آج
پڑ گئی ہے اس کی آنکھوں سیتی میخانے میں دھوم

—

کوئی گریباں چاک، بیدل کہاں لے گا صبا
کوہ میں فرہاد و مجنوں کو ہے ویرانے میں دھوم

—

پنجرے میں ہمیں نہ آنا تھا
کیا کریں یہاں کبھی آب دانہ تھا

—

اس کی جا کر گلی میں کھویا ...
اب میں جانا کہ وہاں نہ جانا تھا

—

ایک دن وہ نظر پڑا صاحب
جس لیے شب کو تلملاتا تھا

—

تب کیا چشم کو میں اے کم بخت
وصل میں اشک یہ بہانا تھا

—

اس کی تصویر آئی آنکھوں میں
یاؤں اس کے مجھے دھلانا تھا

شفیق کے دیوان میں عموماً مسلسل غزلیں ملتی ہیں جن میں ہجر و فراق کے مضامین بیان ہوئے ہیں۔ بعض غزلوں میں محبوب کا سراپا باندھا ہے۔

شفیق نے ایک مثنوی "تصویر جاناں" کے نام سے لکھی ہے، جس میں اپنے "جاناں" کے سراپا کا بیان کیا ہے۔ رضیر الدین ہاشمی نے شفیق کی ایک دوسری مثنوی "معراج نامہ"[1] کا بھی ذکر کیا ہے۔ "ساقی نامہ" کے چند شعر ملاحظہ ہوں :-

---

[1] رضیر الدین ہاشمی، "دکن میں اردو" ص ۲۰۳

ارے ساقی اے روح بخش جہاں

ارے ساقی اے جان کے تن کی جاں

ترے دیکھ کر یہ تغافل کے ڈھنگ

بھر آتی ہے چھاتی مری بے درنگ

دو پیالے مجھے دے کہ مت کھول جا

کہ ہیں بحر نوش اب بفضل خدا

دے شیشے پہ شیشے گھڑے پر گھڑے

ملا اس طرح واچھڑے واچھڑے

تجھے نا کہوں تو کہوں کس سے اب

تجھے مجھ سے اغماض کیا ہے سبب

مندرجہ بالا مثنویوں کے علاوہ شفیق نے مثنوی "میخانۂ عاشق" "مثنوی زر" اور "گھونگھی" بھی لکھی ہے۔

فارسی شعراء کا تذکرہ "مشامِ غریباں" بھی انہی کی یادگار ہے۔ علاوہ ازیں اُن کی ایک اور تصنیف "بساط الغنائم" بھی ملتی ہے جو ۱۲۱۴ھ میں لکھی گئی۔ سید محمد نے شفیق کے وفات کا سنہ ۱۲۱۴ھ کے بعد لکھا ہے۔ رضی الدین ہاشمی نے بھی "دکن میں اُردو" میں یہی سنہ تحریر کیا ہے جبکہ خالدہ یوسف نے شفیق کے شاگرد سخن کے موزوں کئے ہوئے قطعہ تاریخ کا حوالہ دے کر سنہ وفات ۱۲۲۳ھ قرار دیا ہے۔ قطعہ تاریخ ذیل میں نقل کیا جاتا ہے۔

سالِ رحلت رقم نمود سخن
وائے استادِ معانی رفت [1]
۱۲۲۳ھ

---

[1] ڈاکٹر خالدہ یوسف "اورنگ آباد میں اُردو ادب کا ارتقاء" بحوالہ "مہدار مسطوجاہ۔ علمی و ادبی خدمات" از ڈاکٹر لئیق صلاح ص ۱۲۶

جس دور کے شعراء ادباء کا ہم ذکر کر رہے ہیں اُس میں تذکرے اور مثنویاں لکھنے کا رواج عام نظر آتا ہے چنانچہ شفیق ہی کی طرح شیدا نے بھی مثنوی نگاری کی طرف خصوصی توجہ دی ۔

میر نوازش علی خاں نام اور شیدا تخلص تھا ۔ حیدرآباد ہی کے رہنے والے تھے ۔ والد کا نام میر عبداللہ تھا ۔ شہنشاہ ہند شاہ عالم کے دربار سے وابستہ تھے ۔ جہاں سے انہیں بارہ صدی منصب و خطاب خانی آصف جاہ اول کے دستخط سے عطا ہوا تھا ۔ شیدا غالباً ۱۱۶۵ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۲۰۱ھ میں انتقال کیا ۔ آصف جاہ ثانی نے جب حیدرآباد کو اپنا دارالحکومت قرار دیا تو شیدا اُس وقت میر سامان کے عہدے پر فائز تھے بعد ازاں قدیم عمارات کے نگران کار مقرر ہوئے پھر بادشاہی عاشور خانہ کے منتظم ہو گئے ۔

شیدا نہایت قادر الکلام اور پرگو شاعر تھے۔ ان کی دو ضخیم مثنویاں معروف ہیں۔ (۱) روضۃ الاطہار (۲) اعجاز احمدی

شیدا نے مثنوی "اعجاز احمدی" میں اپنی ایک اور تصنیف "گلشن ایمان" کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ "روضۃ الاطہار" شیدا کی یہ مثنوی بارہ مجلسوں پر مشتمل ہے۔ ان مجالس کا موضوع پنجتن پاک اور شہدائے کربلا کے حالات و سیرت کا بیان ہے۔ یہ مثنویاں انہوں نے ۱۱۷۳ھ میں لکھی تھی۔ اس مثنوی کو انہوں نے تین ماہ بیس یوم میں مکمل کیا تھا۔ چنانچہ ایک شعر میں خود مدت تصنیف کا بیان کیا ہے ؎

اگر ایّام تیاری کے چاہو
عدد نام تجلی کے کر نکالو

نوازش علی خاں شیدا نے مثنوی کی تاریخ تصنیف بھی مثنوی میں بیان کردی ہے ملاحظہ ہو :

ہوا جب ختم یہ مضمون ماتم :: کہا تاریخ ہاتف "مجلس غم"
۵ ۱ ۲ ۳

کیا جو ہم تم آمدنی سیں ازبر :: اگیارہ سو پیس تھے تیں بہتر

"روضۃ الاطہار" کی تصنیف سے قبل شمال میں فضلی جنوب میں ولی نے دہ مجلس کے نام سے اسی موضوع کو قلمبند کیا تھا۔ لیکن فضلی اور ولی کا ماخذ فارسی کی دہ مجلس ہے۔ شیدا نے اپنی طبیعت کی اپج اور وجدان کے سہارے واقعات کربلا کا بیان کیا ہے۔ "روضۃ الاطہار" کے دیباچہ میں خود شیدا لکھتے ہیں:

ہوا یکدن مجھے الہام از غیب :: کہ توں حسینؑ کا شیدا ہے لاریب
کتاب یک توں بنا ہندی زباں ہو :: انکھیاں عالم کی کر انجواں سیں بھیجوں
پڑا تج مرثیوں کا جگ میں یاں دھوم :: جہاں کے گلایا دل کوں جیوں موم
کمر میں اس سعادت پر بندھا جب :: کتابوں کوں منگا تاریخ سب
لکھا احوال سارا بے کم و کاست :: مدد حسینؑ سیتی کر کے درخواست

شیدا نے ایک طویل مثنوی حیات طیبہؐ کو موضوع بنا کر

"اعجاز احمدیؐ" کے مختلف مخطوطوں کے مطالعہ سے ہوتا ہے کہ شیدا

نے یہ مثنوی دو حصوں میں لکھی تھی۔ پہلی جلد میں شہید نے
آنحضرتؐ کی پیدائش سے ہجرت تک کے زمانے پر لکھا ہے
اور دوسری جلد جس کا قلمی نسخہ کتب خانہ آصفیہ میں محفوظ
ہے۔ یہ مثنوی ہجرت کے حالات سے شروع ہو کر آنحضرتؐ
کے وصال پر ہوتی ہے۔ "اعجاز الہیٰ" کی ابتداء میں حمد اور
نعت بھی موجود ہے۔

میر نوازش علی شہید نے اپنی مثنوی "اعجاز احمدیؐ" کے
دیباچہ میں اس امر کا انکشاف کیا ہے کہ انہوں نے اپنے
قصائد نعتیہ کے علاوہ آنحضرتؐ اور ائمہ علیہم السلام کے معجزات
پر مشتمل مثنوی لکھی ہے جس کا نام انہوں نے "گلشن ایمان"
اب تک نایید ہے منظر عام پر نہیں آئی ہے۔ شہید نے
فارسی میں طبع آزمائی کی ہے۔ فارسی نثر بھی وہ خوب
لکھتے تھے چنانچہ ان کی فارسی تصنیف "جامع الفوائد" کے قلمی

نسخے ملتے ہیں۔ جس کو دیکھنے سے فارسی نثر پر شیدا کی دستگاہ
کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ شیدا نے اپنی یہ فارسی تصنیف ماہ
رجب المرجب ۱۲۰۳ھ میں مکمل کیا۔

اسد علی خاں تمنا اور نوازش علی شیدا کے معاصرین
میں عاشق علی خاں ایما بھی تھے جو کہ آصف جاہ اول
نواب میر قمر الدین علی خاں کے منصبداروں میں شامل تھے۔
عربی اور فارسی میں اچھی دستگاہ رکھتے تھے۔ اردو میں بھی
طبع آزمائی کی ہے۔ خصوصاً تاریخ گوئی سے دلچسپی تھی۔
عبدالجبار خاں ملکاپوری نے "محبوب الزمن" میں انتقال سنہ
۱۱۷۲ھ[1] لکھا ہے۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو:

طبیب عشق میں پوچھا زلیخا نے علاج اپنا
کہا تجھ پر بھلا ہے سورۂ یوسف کا دم کرنا

عاشق نہیں ہے تجکو کچھ خوف معصیت کا ایما نہیں رضا ہیں کے امام ضامن اپنا

کیوں نہ گھبراوے وہ کمان ابروئی واسطے جس کے کھنچے ہیں چلے

عارف الدین خاں عاجز اپنے عہد کے ایک باکمال شاعر گزرے ہیں۔ عاجز اسد علی خاں تمنا تجلی علی تقی شفیق اور داؤد کے ہمعصر تھے۔ اورنگ آباد میں پیدا ہوئے۔ اپنی قابلیت کی بنا پر آصف جاہ اول کے دربار میں منصب بھی حاصل کیا۔ فارسی اور اردو کے اچھے شاعر تھے۔ تذکروں میں اردو اشعار ملتے ہیں۔ علاوہ ازیں ایک مثنوی "لال و گوہر" ان کی یادگار ہے۔ جس کی زبان نہایت صاف اور سادہ ہے۔ دیوان اردو بھی مرتب کیا جس کے قلمی نسخے حیدرآباد کے مختلف خانوں میں محفوظ ہیں۔ ۱۱۷۸ھ میں حیدرآباد میں انتقال کیا۔ "مثنوی ملک مصر" بھی عاجز کی قرار دی جاتی ہے لیکن اس مثنوی سے عاجز کا کوئی تعلق نہیں۔ غزل کے چند شعر ملاحظہ ہوں:

ہے عاشقوں کو پند و نصیحت سے احتیاط
مستوں کو جیسے واعظ کی صحبت سے احتیاط

اس کے ہم دامِ محبت میں پھنسے عاجز ؛؛ بال جس شوخ ستمگر کے گھنگر والے ہیں

تم بن اب آہ دل میں لگی ہے کھٹ پٹ ؛؛ آنکھوں سے اشک پل پل گرتے ہیں ٹپ ٹپ

میں وہ مجنوں ہوں کہ آباد نہ اجڑا سمجھوں ؛؛ مشت خاک اپنی اُڑا کر اسے صحرا سمجھوں

نہ پیچ و تاب ہوا ہے سے آب میں گرداب ؛؛ میری اشک کے آگے کرے ہے مجنوں رقص

تمہارے پنجۂ رنگیں کو گر چمن دیکھے ؛؛ اُڑے گلوں ستی رنگ بہار یا توں یات

سحر اس حسن کے خورشید کو جگا کر دیکھا ؛؛ ظہور حق کو دیکھا خوب دیکھا با ضیا دیکھا

الٰہی کب دل غمگیں ہمارا شاد ہووے گا ؛؛ یہ اجڑا شہر یا رب کس گھڑی آباد ہووے گا

اداسیں گر ہماری بزم میں وہ فتنہ ساز آوے

بجا کر مہر کا دف چرخ کھا کر گرے زہرا

عارف الدین عاجز کے دیوان میں آسان زمین میں

غزلیں تو ملتی ہیں ساتھ ہی سنگلاخ زمینوں میں بھی انہوں نے طبع

آزمائی کی ہے اور کامیاب رہے ہیں۔ البتہ اُن کی مثنوی

"لال و گوہر" کی بحر ہزج رواں ہے۔ جس میں روانی اور اسلوب میں سادگی اور شستہ واری ہے۔ مثنوی کا نمونہ ملاحظہ ہو:

الٰہی دے مجھے رنگیں بیانی — عطا کر مجھ کو یاقوت معانی
سخن کا اور دے میری زباں کو — دُرِ معنی سے بھر میرے بیاں کو

—

کروں میں دشت کی کیوں کر صفت کو — زباں میں کس طرح ڈالوں لغت کو
وہاں ہرگز نہ تھا پانی کا آثار — اجل کا کھیت تھا وہ دشت خونخوار
بیابانِ عدم کے تھا برابر — وہاں تھا جہاں عزرائیل کا ڈر
وہاں کی ریت ہیرے کی کنی تھی — وہاں کے کانٹے بھالوں کی انی تھی
وہاں کی باد تھی شعلہ فشاں صرصر — وہاں کی کنکری تھی مثل اخگر
کبھی سردی میں ہر پیر کانپتا تھا — کبھی گرمی سے یہ دم ہانپتا تھا

"لال و گوہر" میں قصہ اور پلاٹ بہتر انداز میں سمیٹا گیا ہے۔ عاجز نے واقعات کی جزئیات بیان کرنے میں ہنر دکھایا ہے۔ کرداروں کا کہانی میں ارتقاء ملتا ہے۔ زبان

صاف اور سادہ ہے لیکن عاجز نے تشبیہ اور استعارہ کے ساتھ ساتھ صنائع بدائع کو بھی خوب برتا ہے۔ علاوہ ازیں تلمیحات کا بیان کرتے ہوئے کہانی کو دلچسپ بنایا ہے۔ "لعل و گوہر" کا قصہ تو روایتی ہے لیکن عاجز کے فن نے اُسے اردو کی ایک مشہور مثنوی بنا دیا ہے۔

نواب میر عثمان علی خاں آصف جاہ ثانی جب اورنگ آباد سے دارالسلطنت حیدرآباد منتقل کیا اور اپنے ہمراہ اورنگ آباد کے شعراء کا قافلہ حیدرآباد لائے اُس وقت حیدرآباد شید محمد خاں ایمان کا طوطی بول رہا تھا۔

شید محمد خاں ایمان کے والد محمد عاقل خاں میر نظام علی خاں آصف جاہ ثانی کے دربار میں وقائع نگاری کی خدمت پر مامور تھے اور اخبار گوئی کا کام بھی اُن کے سپرد تھا۔ محمد عاقل خاں نے اپنے بیٹے کی تعلیم پر خاص

توجہ دی ۔ اور حیدرآباد کے علما اور فضلا کو شعر و ادب کی تعلیم کے لیے مقرر کیا ۔ ہونہار ہوا کے کئی دیے
ثابت، قدیم کے زاویے سے آراستہ ہونے کے بعد شیر محمد خاں سے شعر گوئی کی جانب توجہ دی اور اپنے
کلام کی ندرت کی بنا پر بہت جلد مشہور و معروف ہو گئے ۔ سارے واقعات ان کے ذہن میں محفوظ تھے ۔[1]
یہی وجہ تھی کہ ایمان آصفیہ دربار کے علاوہ عوام میں بھی معزز و موقر سمجھے جاتے تھے ۔

آصفیہ سلطنت کے مدار المہام اس وقت اعظم الامراء ارسطو جاہ تھے ۔ جو خود بھی علم پروری اور
شعر و شاعری میں نیز نام رکھتا تھا ۔ ایمان بھی ارسطو جاہ کے دربار سے وابستہ ہوئے اور سفر و حضر میں[2]
ہر وقت ان کے ساتھ رہتے تھے چونکہ خوش سیرت و خوش کلام تھے اسی وجہ سے احباب میں مقبول
تھے اور ارسطو جاہ کے ہر دلعزیز مصاحبوں میں ان کا شمار کیا جاتا تھا ۔ شیر محمد خاں ایمان نے
شاہ تجلی علی تجلی سے کلام پر اصلاح لی ہے ۔ تجلی اپنے تذکرہ "تزک آصفیہ" میں ایمان کو
اپنے تلامذہ میں گل سرسبد قرار دیتے ہیں ۔ لکھتے ہیں ۔[3]

"شیر محمد خان ایمان کہ گل سرسبد تلامذہ این مولف است"

لالہ سری رام نے اپنے تذکرہ "خمخانہ جاوید" میں ایمان کے بارے میں ان الفاظ میں
اظہار خیال کیا ہے :-

"ایمان سید محمد خان خلف محمد عاقل نایب

---

[1] ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور "داستان ادب حیدرآباد" ص ۳۲۵ ۔
[2] نصیر الدین ہاشمی "دکن میں اردو" ص ۵۶۵
[3] شاہ تجلی علی تجلی "تزک آصفیہ" ص ۱۲۵ ۔

نواب سکندر جاہ نظام الملک کے دورِ حکومت میں
حیدرآباد کے متوسلانِ مشاہیر میں شمار کئے جاتے تھے
اخبار نویسان ریاست کے زمرے میں تھے پر میر مگر
دکن کے حالات سے واقفیت کامل حاصل تھی۔ عروض و قافیہ
کے خوب ماہر تھے اور اکثر اسند رہیں صلح حکمت کی طرف
طبیعت کی توجہ مبذول تھی، ایک رسالہ جنگ اور مثنوی "برسات"
ان کی یادگار ہے۔ شطرنج بھی خوب کھیلتے تھے۔ امیرالامراء
وزیر اعظم کی مصاحبت میں اکثر رہتے تھے ۱۲۲۱ھ میں وہیں
انتقال کیا" [1]

لالہ سری رام نے یہاں دو امور غلط بیان کئے ہیں اول یہ کہ ایمان نواب
سکندر جاہ ثالث کے عہد حکومت میں صرف تین برس زندہ رہے۔ ایمان دراصل
نواب نظام علی خاں آصف جاہ ثانی کے عہد سے تعلق رکھتے ہیں۔ دوسری بات یہ
کہ ایمان نے صرف ایک مثنوی "برسات" نہیں لکھی بلکہ انہوں نے جملہ سات مثنویاں

---

[1] لالہ سری رام "خمخانۂ جاوید" جلد اول ص ۵۲۷

لکھی ہیں۔ جن میں سے بہترین مثنوی "برقِ تابِ یار" ہے جس کا دوسرا نام "سرِ عدالت ناصرہ" بھی ہے۔

"کلیاتِ ایمان" کے مرتب سیدہ ہاشمی حبیب لکھتے ہیں۔

"شیر محمد خاں ایمان کی شاعری کا نشو و نما نواب نظام علی خاں آصف جاہ ثانی (۱۲۱۸ھ) اور نواب سکندر جاہ آصف جاہ ثالث کے عہد میں ہوا۔ اس دور میں علی الترتیب ارسطو جاہ (۱۲۱۹ھ) اور میر عالم (۱۲۲۳ھ) وزرائے سلطنت کے جلیل القدر عہدوں پر فائز تھے ــــــ" ۱؎

ایمان نے جملہ اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ ان کے کلیات میں غزل، مثنوی، قصیدہ، رباعی کے علاوہ دوسرے اصنافِ سخن بھی موجود ہیں لیکن فطرتاً وہ ایک کامیاب غزل گو شاعر ہیں۔ ایمان کی غزل اپنے دور کی روایتی شاعری کا نمونہ ہوتے ہوئے بھی اپنے اندر استادانہ فنکاری اور شگفتگی و تازگی رکھتی ہے۔ خصوصاً زبان و بیان ایمان کے یہاں بہت صاف اور شستہ ملتی ہے۔

۱؎ سیدہ ہاشمی حبیب "کلیاتِ ایمان" ص ۱۲ سنہ اشاعت ۱۹۸۷ء

سیدہ ہاشمی حبیب لکھتی ہیں:

" ایمان کے سامنے دبستان گولکنڈہ اور دبستان بیجاپور کی شاعری کے نمونے موجود تھے۔ اورنگ آباد کے سخنوروں کے کلام سے بھی انہوں نے استفادہ کیا ہوگا اسی لئے ان کی شاعری میں اتنی پختگی صفائی نظر آتی ہے۔ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انہوں نے شمالی ہند کے شاعروں سے بھی بے حد اثر قبول کیا ہے ___ " [1]

ایمان کی غزل کے موضوعات متنوع ہیں۔ حسن و عشق، سراپائے محبوب، محبوب کی بے رخی، بے التفاتی، شیخ و ناصح کی چھیڑ چھاڑ، عشق و محبت، فراق و وصال سبھی کچھ موجود ہے۔ چند شعر دیکھیے:

غمزہ، ادا، نگاہ، تبسم، خرام سے :: میں ایک جان اپنی بچاؤں کہاں تلک

وہم فرشتے کا نہ پہنچے جہاں :: پہنچا ہے وہاں حضرت انسان جا

کبھو حرم میں کبھو دیر میں مجھے یار :: کہاں کہاں نہ لئے تیری چاہ پھرتی ہے

---

[1] سیدہ ہاشمی حبیب "کلیاتِ ایمان" ص ۵۸

تیرے گھر میں جز غم و رنج و بلا ؎ اور کچھ اے عشق سرمایہ کیا ہے

تعریف دل ربا کے سراپا کی کیا کریں ؎ ایمان ہم کو یک بیک سراپا نے غش کیا

کیوں نہ طاؤس ہو تیرے قرباں ؎ سر سے لے پاؤں تک چمن ہے تو

دل جو ہوتا تھا شگفتہ باغ میں ؎ وہ خدا جانے کدھر کو گم گئے

ایمان چلیے آپ بھی کیا انتظار ہے ؎ گلشن میں اب کے سال انوکھی بہار ہے

عرصۂ ہستی میں کچھ مختار ہیں بھی اور نہیں

سایہ آسا صاحبِ رفتار ہوں بھی اور نہیں

سو رنگ جلوہ گر ہیں اگرچہ بتانِ عالم ؎ ہم ایک تجھ کو اپنا منظور جانتے ہیں

دیر سے مطلب نہ کعبے سے غرض ؎ عاشقوں کا دین و ایمان اور ہے

ایمان نے نواب میر نظام علی خاں آصف جاہ ثانی آصف جاہ ثالث، ارسطو جاہ میر عالم کی مداح میں قصاید لکھے ہیں۔ ایمان نے سات[1] مثنویاں بھی لکھی ہیں: جن کے عنوان درج ذیل ہیں:

۱۔ برقا رتیاں (برسات نامہ) ۲۔ فراق نامہ ۳۔ مہتاب نامہ ۴۔ استغراق نامہ ۵۔ خسرو شیریں ۶۔ قیس و لیلیٰ اور ۷۔ مثنوی در تہنیہ حاصرہ

۱؎ ماخوذ از "کلیات ایمان" مرتبہ: سیدہ ہاشمی بیگم ص ۸۸

سید احتشام حسین اس کے متعلق تبصرہ لکھا ہے

اور شمالی ہند کی مثنویوں کا تقابلی مطالعہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

”شمالی اردو میں بہت ہی کم کامیاب مثنوی گوئی کی گئی میر
اثر، شوق اور نسیم اردو کے مشہور مثنوی نگار ہیں۔ ان
میں میر حسن کا درجہ بلند ہے اور یہ سب فارسی مثنویوں
کی تقلید کرتے ہیں۔ امکان یہی ہے میر حسن ہی کے معاصر تذکرہ نگاروں
کی مثنویوں پر فارسی سے زیادہ قدیم دکنی مثنویوں کا اثر
غالب ہے۔ مثنوی میں وہی شاعر کامیاب ثابت ہو سکتا
ہے جو داخلی اور خارجی دونوں طرز کی شاعری پر پوری قدرت
رکھتا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ میر ایک بلند پایہ مثنوی نگار نہ بن
سکے ان کی مثنوی نگاری میں داخلی شاعری کا عنصر غالب ہے
اور اس کی وجہ ان کی کامیاب غزل گوئی ہے۔ ہماری مثنویوں میں
منظر نگاری کی کمی عام ہے۔ چند ہی مثنویاں ایسی ہیں جن میں منظر
نگاری نظر آتی ہے۔ آج ان کی مثنویاں چھوٹی چھوٹی ہیں۔ ان کی
واقعہ یا قصہ کا بیان نہیں مگر منظر نگاری کے ساتھ واردات
دل کی داستانیں مذکور ہیں۔ زبان صاف اور طرز بیان شگفتہ ہے۔۔

... مثنوی برق تاب یا برسات نامہ ۔ میں زور کلام

زور بیان، مبالغہ اور تشبیہوں کی لطافت قابل داد ہے۔ سه

مثنوی " برق تاب " کی ابتدا کے اشعار ملاحظہ ہوں۔

عجب برسات کی ہے فصل پیاری :: کہ کالا ابر ہے عالم میں جاری

لکھوں کس رنگ سے تعریف اس کی :: کہ کاغذ خود بخود ہوتا ہے ابری

اگر صفحہ پہ کھینچوں جدول سبز :: رواں ہوتی ہے مثل موج تسنیم

مثنوی " برق تاب " میں ایمان نے " ساقی نامہ " بھی لکھا ہے۔ اس کے

دو شعر دیکھئے :

ادھر لا کشتی مے جلد ساقی :: جہاں کے ڈوبنے میں کیا ہے باقی

شتابی آ کہیں اس وقت ساقی :: ہے تیری سرد مہری لے لیا بی

شیر محمد خاں ایمان نے رسالہ ضلع جگت " گلدستہ گفتار " اور " سردار نامہ سلوک "

بھی تصنیف کیا ہے۔ شیر محمد خاں ایمان کے فن پر اظہار خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر جمیل

جالبی لکھتے ہیں :

" شیر محمد خاں ایمان پہلے دکنی شاعر ہیں جو نہ صرف

استاد وقت ہیں بلکہ دہلی کی زبان بڑے اعتماد کے

سه سید اشتیاق حسین " شیر محمد خاں ایمان " ص ۱۴۵ مضمون شمولہ " مرقع سخن "

جلد اول مرتبہ ڈاکٹر زور

ساتھ اپنی شاعری میں استعمال کرتے ہیں۔ ایماںؔ کی زبان
کا مقابلہ محمد باقر آگاہ (۱۸۰۵ء) کی زبان سے کیا جائے
تو باقر آگاہ کی دکنی اردو شمال کی زبان کے اثر سے بدل
ضرور گئی ہے لیکن اس کا لب و لہجہ وغیرہ الفاظ اور روز مرہ
و محاورہ پر دکنی کی چھاپ اب بھی نمایاں ہے لیکن ایماں
کی زبان پر کوئی دکنی اثر محسوس نہیں ہوتا بلکہ یوں معلوم ہوتا
ہے کہ دہلی کا کوئی قادر الکلام شاعر فصاحت کے دریا بہا رہا ہے۔[1]

ایماںؔ کے ایک ہمعصر مرزا جمال اللہ عشق تھے جو ولیؔ اورنگ آبادی کے
شاگرد رشید مرزا داؤد اورنگ آبادی کے گھر اورنگ آباد میں پیدا ہوئے۔
عشق کی پیدائش کا سنہ پیدائش نہیں معلوم۔ تعجب اس بات پر ہے کہ
عشقؔ نے اپنے والد کے بجائے والد کے ہمعصر شاہ غلام قادر ساؔمی کے آگے
زانوئے شاگردی تہہ کیا۔[2] "دیوان عشق" میں داؤد کا ذکر کہیں نہیں اس
کے بجائے میر دردؔ، مرزا سوداؔ اور انعام اللہ خاں یقینؔ کا ذکر و تذکرہ ملتا ہے۔
عشقؔ نے آصف جاہ ثانی کے حیدرآباد کو دارالسلطنت بنانے کے بعد حیدرآباد
کا رخ کیا اور پھر یہیں بس گئے اور ۱۱۹۵ھ میں حیدرآباد ہی میں انتقال کیا۔

---

[1] ڈاکٹر جمیل جالبی "تاریخ ادب اردو" (جلد دوم حصہ دوم) ص ۹۲۰ طبع اول لاہور

[2] مرزا جمال اللہ عشق "دیوان عشق" ص ۵ مرتبہ اکبرالدین صدیقی
سنہ اشاعت ۱۹۶۰ء

ڈاکٹر محمد اکبرالدین صدیقی نے "دیوان عشق" مرتب کیا ہے۔ عشق کے کلام کی خصوصیات کا بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"عشق کی شاعری بالکل عاشقانہ ہے۔ اس میں مضامین کا تنوع نہیں، فلسفیانہ خیالات نہیں، پند و نصائح کا عنصر نہیں۔ پورا دیوان مطالعہ کر جائیے ایہام گوئی، گل و بلبل اور عشق و عاشقی سے مملو نظر آئے گا۔ اس لیے یہ گمان ہوتا ہے کہ ایسے فرسودہ اور پامال مضمون میں عشق نے کیا تیر مارا ہوگا لیکن عشق نے ایسی فرسودگی میں بھی اپنے لئے نئی راہ نکالی ——" [1]

عشق کے دیوان میں غزل، رباعی، مثنوی موجود ہے۔ ذیل میں غزل کے چند اشعار نمونتاً درج کئے جاتے ہیں ——

کوچہ میں گلستاں کے چلا ہوں یہاں کر ؛ ہرگز وہاں سے ہم سے پھر آیا نہ جائے گا

گلستان میں نہ دکھلاتا اگر تو خال رخسار ؛ نہ نافرماں سید ہوتے نہ لالہ داغ ہو جاتا

رات گلگشت کو مہتاب کے نکلا تھا سجن ؛ ماہ میں اس کے مقابل تو ذرا نور نہ تھا

ہوس سے جانثاری کیجئے پروانہ وار اے عشق ؛ کہ ہے وہ شمع او محبوب اپنا جان جاں اپنا

---

[1] محمد اکبرالدین صدیقی (مرتب) "دیوان عشق" مرزا جمال اللہ عشق ص ۱۰
سنہ اشاعت ۱۹۶۰ء

یہ اب کی فصل گل میں دل کے سر سودا کا ساماں تھا

تھی دامنگیر وحشت اور جنوں دست و گریباں تھا

آتشیں رو تیرے آگے تاب کب لاتی ہے شمع

رشک سے تجھ حسن روز افزوں کے جل جاتی ہے شمع

گل ہے یہ شبنم نہیں پانی چھڑکتی ہے بہار ؛ پائے رنگینی لگاتی آئے اس گلشن کو آگ

خاطر سے غبار دھو گئے ہم ؛ مینا کی طرح سے رو گئے ہم

شمع پر جب بزم میں ہوتا ہے پروانہ نثار ؛ ہم سے پوچھا جائے صدقے تیرے جائے جالطف

اس ہوا میں آہ وہ ساقی نہیں ؛ ابر سا امڈا ہوا آتا ہے دل

سوئے بختیوں کا مرے یارو سنو افسانہ ؛ سرگذشت اپنی کہوں تو اسے نیند آتی ہے

خوش چشم کے فراق میں بے اختیار ہو ؛ دل چاہتا ہے جا گل نرگس کو دیکھیے

کیا خاک کہو اس میں تجلی ہو نمایاں ؛ خورشید کا جو ذرہ پرستار نہ ہووے

ان اوراق میں اٹھارہویں صدی کی ابتدائی چوتھائی کے بعد سے ختم صدی تک کے شعراء کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ وہ شعراء، وہ تذکرہ نگار ہیں جنھوں نے عہد آصفیہ میں اپنے کلام سے دکھنی دبستان کی روایت کو آگے بڑھایا ہے۔ ان شعراء کے علاوہ اور بھی شعراء و تذکرہ نگار اور مرثیہ نگار اس دور سے تعلق رکھتے ہیں ــــ ایسے شعراء میں صارم، اعظم، اقبال، محرم، عاشق

عاصیؔ، قمرؔ، حاذیؔ، رحمتؔ، ہدایتؔ، مفضلیؔ، یارؔ، قیاسیؔ، دردمند
ساقیؔ، لطفیؔ، شتابؔ، حمیدؔ، محمودؔ، ایجاد، قاسمؔ، قربانؔ، بیکلؔ،
عروجؔ، انورؔ، ثروتؔ، ضیاؔ، اسرؔ، آشفتہ، مبتلاؔ، جلالؔ، سالم
بےجانؔ، منبر وغیرہ بھی گذرے ہیں۔ جنہوں نے اورنگ آباد و
بعد حیدرآباد میں اردو شعر و شاعری کی شمع کو روشن رکھا۔
اس دور میں ہمیں لطف النساء بیگم بھی ملتی ہیں۔ جنہوں نے
اپنا دیوان ترتیب دیا تھا۔

لطف النساء بیگم نام تخلص امتیازؔ، اس کے دور کے
استاد سخن اسد علی خاں تمنّا کی اہلیہ تھیں۔ سرزمین حیدرآباد
پر ۱۱۷۶ھ میں پیدا ہوئیں۔ شاہی خاندان میں پرورش پائی۔
اسد علی خاں تمنّا سے بیاہی گئیں۔ امتیاز شاہ عطاء اللہ کی
مرید تھیں۔ حج بیت اللہ سے بھی مشرف ہوئیں۔ اپنا دیوان
۱۲۱۲ھ میں مرتب کیا۔ دیوان میں جملہ اصناف سخن میں کلام
ملتا ہے۔ "گلشن سخن" کے نام سے آٹھ ہزار شعر پر مشتمل ایک

مثنوی بھی امتیاز نے لکھی ہے۔ امتیاز نے کب انتقال کیا اس کا پتہ نہیں۔ غزل کے چند شعر ذیل میں درج کئے جاتے ہیں :

امتیاز اب تیرا لقب ہم نے :: جاں فدائے ابوتراب کیا

محو ہو دیکھ کے جلوے کو جمال ازلی :: نقد جاں دے کے خریدی میں جریدہ رہا

شہ دکن ہے آصف جاہ ثانی نامدار :: دارہ فریاد رس جس کو بنایا کردگار

دل بیتاب کو میرے نہیں آرام کہیں :: جب تلک ہو نہ ہم آغوش گل اندام ہمیں

مئے پرستاں ہیں کہ اے ساقی سرشار کہاں :: دھوم رنداں ہے کدھر بادۂ گلنار کہاں

شیشۂ دل میں ہمارے وہ پری رہتی ہے :: مثل انساں کی جیسے دیکھ دھری رہتی ہے

نہ سمجھیں کفر کو کیا ہے نہ کچھ جانے مسلمانی :: ہمیں دیر و حرم یکساں عبث ہے سب کو حیرانی

کشور عشق میں شاہی کا میرے ڈنکا ہے :: نوبت وصل کے بجانے میں کچھ دھمکا ہے

لطف النساء امتیاز کو اردو کی پہلی صاحب دیوان شاعرہ ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔

مرثیہ گوئی دکن میں عہد بہمنی سے ہوتی آئی ہے۔ دبستان گولکنڈہ، دبستان بیجاپور اور پھر دبستان اورنگ آباد میں بھی

مرثیے برابر لکھے جاتے رہے۔ درگاہ کے مرثی کا ماں

پچھلے صفحات میں کیا جا چکا ہے۔ اس عہد میں حافظ

رضی الدین رضیؔ ہاشم علیؔ قادر حیدرآبادیؔ اماؔنی قائم

نظرؔ سیدؔن مشرف اور بر باس نے مرثیے کی روایت کو

آگے بڑھایا۔ ان میں کاظمؔ قادرؔ ہاشم علیؔ اور امانی نے

اچھے مرثیے لکھے ہیں۔

عہد آصفیہ کے اس دور کی شاعری کا اجمالی جائزہ

لیتے ہوئے نصیر الدین ہاشمی نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ اس

دور سے قبل دکن میں عموماً مثنوی نگاری کا رواج

تھا لیکن ولی اورنگ آبادی کے زیر اثر اورنگ آباد اور حیدرآباد

میں غزل پر زیادہ توجہ دی گئی۔ نصیر الدین ہاشمی لکھتے ہیں:

"اس دور میں صدہا شاعر ہوئے جنہوں نے داد سخن

دی اور اپنے کلام کو یادگار زمانہ چھوڑا۔ ان

شاعروں میں بیسیوں ایسے ہیں جو دربار کے

امیر اور صاحب مال و دولت تھے جیسوں ایسے ملیں گے جو صاحب حال و قال تھے پیری مریدی ان کے گھرانے کی میراث تھی۔ کوئی رند نظر آئے تو کوئی صوفی وقت ہوگا۔ غرض ہر طبقے نے میدان شعر و سخن میں جولانی کی ہے۔ ان کی تعداد جن کے حالات دکھنی تذکروں میں مندرج ہیں تقریباً دو سو ہوتی ہے۔

اس دور سے پہلے دکن میں عام طور سے مسلسل نظم مثنوی کا رواج تھا اور ہر ایک شاعر کوئی نہ کوئی مثنوی اپنی یادگار چھوڑتا تھا لیکن ولی کے بعد ایک عام تغیر ہو گیا اور شعراء غزل کی طرف زیادہ متوجہ ہو گئے۔ ولی کی پیروی میں غزلوں کی طرف زیادہ توجہ کی گئی اور شعراء نے غزلوں کے

دواوین زیادہ سے زیادہ مرتب کرنے شروع
کیے ۔ اس کے ساتھ مثنوی قصیدہ قطعہ اور رباعی
کی بھی مشق انہوں نے جاری رکھی ۔" [1]

اس عہد میں قصائد بھی لاتعداد لکھے گئے خصوصاً ارسطو جاہ کی مدح میں جو قصائد لکھے گئے اس کی مثال شاید ہی کسی اور عہد میں مل سکے ۔ اورنگ آباد میں اردو شعراء سے متعلق تذکرے بھی اسی عہد میں لکھے گئے ۔ جس کی پاسداری بعد ازاں حیدرآباد میں بھی کی گئی اور اس طرح ہمعصر شعراء کی سوانح و کلام کو محفوظ کرنے کا اہم کام انجام دیا گیا۔ شاہ تجلی اور تمنا کے تذکرے اس سلسلے میں اہمیت کے حامل ہیں ۔

اٹھارہویں صدی میں سرزمین دکن میں نثر کی جانب بھی صوفیاء کے ملفوظات کے علاوہ مذہبی رسائل کو حضرت خواجہ بندہ نوازؒ ہی کے عہد سے لکھے جا رہے تھے ۔ حضرت برہان الدین جانمؒ نے اس طرز کا رسالہ "کلمۃ الحقائق" لکھا جیسے ڈاکٹر حسینی

---

[1] نصیر الدین ہاشمی " دکن میں اردو " ص ۳۶۸

شاہد ہے اُردو نثر کی پہلی تصنیف قرار دیا ہے۔ ۱۰۴۵ھ میں ملا وجہی نے سلطان عبداللہ قطب شاہ کی فرمائش پر اُردو کی پہلی داستان "سب رس" تمثیل میں لکھی۔ اس کے بعد تقریباً ایک صدی تک کوئی اہم نثری کارنامہ سرزمین دکن سے سامنے نہیں آیا یا یوں کہنا چاہئے کہ ابھی تک پردہ خفا میں محفوظ ہے۔

عہد آصفیہ میں نثر کی جانب کچھ توجہ دی گئی۔ اس عہد میں جو نثری تصانیف ہمیں ملتی ہیں وہ ہیں شاہ ولی اللہ خلف شاہ حبیب اللہ قادری نے فارسی سے "معرفت السلوک" اُردو میں ترجمہ کیا۔ اسی عہد میں شاہ تُراب بھی گزرے ہیں جن کے کلام کا ذکر کیا گیا۔ شاہ تُراب نے تصوف میں کئی رسالے لکھے ہیں۔ ان رسالوں میں مذہب کا پرتو زیادہ ہے۔ ادبیت بہت کم ملتی ہے۔ البتہ اسی دور سے متعلق "طوطی نامہ" کے دو ترجمے ہمیں ملتے ہیں لیکن اس کے مصنف کا علم نہیں۔

اس دور میں دکن میں (حیدرآباد دارالسلطنت) صوبہ میں نثری داستانوں پر بھی توجہ دی گئی چنانچہ اس صوبہ میں لکھی جانے دو نثری داستانوں کا پتہ چلتا ہے۔ نصیر الدین ہاشمی اس دور کی نثری داستانوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> "اس دور میں کئی نثر کی داستانیں مرتب ہوئی ہیں چنانچہ جن داستانوں کا پتہ چلا ہے وہ درج کی جاتی ہیں (۱) سنگھاسن بتیسی (۲) قصہ منظم شاہ و چندر ریکھا (۳) قصہ ملکہ زماں و کام کندلا اور (۴) قصہ کامروپ ـــــ" [1]

نصیر الدین ہاشمی نے یہاں جن نثری داستانوں کا ذکر کیا ہے اُن میں "قصہ ملکہ زماں و کام کندلہ" عہد مابعد سے تعلق رکھتی ہے کہ یہ داستان ۱۸۱۹ء میں تحریر کی گئی ہے جبکہ آصف جاہ ثانی کا انتقال ۱۸۰۳ء میں ہوا۔

داستان سنگھاسن بتیسی یا دکنی سنگھاسن بتیسی کے دو

---

[1] نصیر الدین ہاشمی، دکن میں اردو، ص ۶۵۸

مخطوطے ملتے ہیں۔ ایک کتب خانہ ادارۂ ادبیات اُردو میں موجود ہے اور دوسرا کتب خانہ سالار جنگ میں ملتا ہے۔ اس دکھنی سنگھاسن بتیسی کے مصنف یا مترجم کے نام کا مخطوطہ کے مطالعہ سے علم نہیں ہوتا۔ کتب خانہ سالار جنگ کے مخطوطہ میں مترجم کی درج ذیل صراحت ملتی ہے۔

"اول یہ کتاب چتربھج داس بیٹا سروپ چند کھتری کا فارسی زبان میں لکھ کر نام اس کا "شاہ نامہ" رکھا ہے اور بتیس ۳۲ حکایتاں بہت وضاحت اور نزاکت سے ظاہر کیا ہے۔ ہندی زبان میں اس کتاب کو "سنگھاسن بتیسی" کہتے ہیں۔ کئی شخص فارسی زبان سے آشنا نہیں ہیں۔ اس واسطے ترجمہ اس کا دکھنی زبان میں اس طرح سے لکھا گیا اب مجھ کو دانشمندان اور صاحب کمالاں سے التماس یہ ہے کہ اگر کچھ فراموشی اور خطا اس میں ظاہر ہووے اپنی عنایت سے معاف فرماویں" [۱]

---

[۱] مخطوطہ نمبر ۱۱ نثری افسانے ورق ۲ تا ۳ — مخطوطہ مخزونہ کتب خانہ سالار جنگ - حیدرآباد

سنگھاسن بتیسی دراصل سنسکرت الاصل مثنوی ہے جو کہ " وکرم چرتر " کے نام سے ملتی۔ چتر بھوج داس نے سنسکرت سے عہد شہنشاہ اکبر میں فارسی میں ترجمہ کیا اور اس کا نام " شاہ نامہ " رکھا۔ دکنی سنگھاسن بتیسی اسی شاہ نامہ کا ترجمہ ہے۔ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ لکھتی ہیں :

" چتر بھوج داس کے " شاہ نامہ " کا ایک ترجمہ دکھنی میں بھی ملتا ہے جو کتب خانہ سالار جنگ میں محفوظ ہے۔ ابھی تک " سنگھاسن بتیسی کے اس دکھنی ترجمے کا حال کسی محقق نے نہیں لکھا ہے " [1]

ڈاکٹر افضل الدین اقبال نے اپنی تصنیف " مدراس میں اُردو " میں دکھنی سنگھاسن بتیسی کے سلسلے میں یہ قیاس ظاہر کیا ہے کہ " یہ ترجمہ فورٹ سینٹ جارج کالج کے لئے ہوا تھا " [2]

---

[1] ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ " اُردو نثر کا آغاز و ارتقاء " ص ۲۹۹ مطبوعہ مجلس تحقیقات اُردو حیدرآباد

[2] ڈاکٹر افضل الدین اقبال " مدراس میں اُردو " ص ۳۹۲

دکنی سنگھاسن بتیسی کا جو مخطوطہ کتب خانہ ادارۂ ادبیات اُردو میں محفوظ ہے۔ اس میں درج ترقیمہ ملتا ہے۔

"مرقوم بست و دویم شہر صفر المظفر سنہ ۱۲۱۷ھ

م سنہ ۱۸۰۲ء"[1]

ڈاکٹر افضل الدین اقبال نے سنگھاسن بتیسی کے بارے میں یہ قیاس کیا ہے کہ یہ ترجمہ فورٹ سینٹ جارج کالج کے لیے ہوا ہے۔ اس داستان کا اُردو و ہندی (دونوں رسم الخط) میں ترجمہ فورٹ ولیم کالج کے مصنفین للولال جی اور کاظم علی جوان نے عہد شاہ جہاں میں سنہ ۱۶۴۳ء کے آس پاس سندر[2] داس کوی کے برج میں کیے گئے ترجمہ کو سنہ ۱۸۰۵ء میں ترجمہ کیا تھا جو ابھی شائع ہوا۔

للولال جی کاظم علی جوان نے سنسکرت کے

---

۱ مخطوطہ مخزونہ کتب خانۂ ادارۂ ادبیات اُردو بحوالہ تذکرہ اُردو مخطوطات جلد اول

۲ ڈاکٹر گیان چند جین "اُردو نثری داستانیں" ص ۴۳ مطبوعہ کراچی سنہ ۱۹۵۴ء

ترجمے برج سے اُردو/ہندی میں ترجمہ کیا ہے اور دکنی سنگھاسن بتیسی فارسی کا آزاد ترجمہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس دکنی ترجمہ میں ہندی کے برخلاف فارسی زبان کا زیادہ اثر ہے۔ اندازِ بیان نہایت سادہ سلیس اور عام فہم ہے۔ قصہ کی زبان روزمرہ کی بول چال ہے۔ زبان کا نمونہ ملاحظہ ہو:

"یوں نقل کرتے ہیں کہ ایک شہر عظیم الشان اور آبادان نام اس شہر کا دھارا نگر مشہور تھا اور قلعہ اوس کے نہایت خوبصورت اور دروازے بہت مضبوط تھے۔ آدمی ہر قوم کے اس شہر میں زیادہ تھے۔ جمعیت اور دولت سے محفوظ رہتے تھے۔ سونا روپا جواہر اور لعل لال موتی الماس گھوڑے اور ہاتھیوں کا شمار نہ تھا۔ بہت خوبی اور زندگانی کرتے تھے"

دکنی سنگھاسن بتیسی ہی کی طرح قصہ معظم شاہ وغیرہ لکھا

اور قصہ کام روپ کے مترجم کا نام ملتا ہے اور نہ ہی ترجمہ

کا سنہ معلوم ہوتا ہے۔ ان داستانوں کے مخطوطے کتب خانہ

سالار جنگ میں محفوظ ہیں۔ نصیرالدین ہاشمی اس دو

(۱۷۲۴ء تا ۱۸۰۳ء) کی نثر کا جائزہ لیتے ہوئے

لکھتے ہیں:

"اس دور کی نثر میں مقفیٰ عبارت کی طرز

موقوف ہو چکی تھی۔ زیادہ تر اخلاق

اور تصوف کی طرف لوگ مائل تھے مگر اس

کے ساتھ داستانوں کا بھی سلسلہ شروع

ہو گیا۔ کئی طویل داستانیں لکھی گئیں۔" [1]

o

عہد آصفیہ میں ۱۷۲۴ء تا ۱۸۰۳ء سلطنت آصفیہ

میں بنیادی حیثیت کا حامل ہے۔ آصف جاہ اول نے

آصفیہ سلطنت قائم کرنے کے بعد اُسے استحکام بخشا تھا کہ

داعی اجل نے لبیک کہا۔ اُن کے جانشین نواب میر احمد علی خاں

ناصر جنگ نے حکومت کی باگ ڈور سنبھالی۔ سلطنت کو

سیاسی، تہذیبی، علمی اور ادبی اعتبار سے عروج کی جانب

گامزن کیا ہی تھا کہ حاسدوں نے انھیں شہید کر ڈالا۔ اس

کے بعد تقریباً پندرہ ۱۵ برس کا عرصہ سلطنت آصفیہ

میں نراج و انتشار کا رہا۔ بعد ازاں ۱۱۷۶ھ میں

آصفجاہ اول کے چوتھے فرزند نواب میر نظام علی خاں

نے آصفجاہ ثانی کے لقب سے جب سلطنت آصفیہ

کی باگ ڈور سنبھالی تو جنگ و جدال کا سلسلہ ختم ہوا۔

اورنگ آباد سے حیدرآباد دارالسلطنت کی منتقلی

نے اُردو ادب کو ساز گار ماحول فراہم کیا اور

حیدرآباد قطب شاہی سلطنت کے خاتمہ کے بعد پھر ایک

رہتے اُردو ادب کی نشوونما کا اہم مرکز بن گیا۔ آصف جاہ
ثانی کے عہد میں اُن کے وزیرِ اعظم نواب ارسطو جاہ نے
شعراء کی سرپرستی اس انداز سے کی کہ مثال بن گئی۔

عہدِ آصفیہ کا یہ زمانہ یعنی آصف جاہ اول ہی
سے آصف جاہ ثانی کے انتقال کا زمانہ اُردو شعر و ادب
کی آبیاری کا زمانہ ہے۔ ولی اورنگ آبادی کے بعد
اس دور میں غزل کو فروغ ہوا اور دکھنی کا کھرا لہجہ فارسی
سے مل کر نرم ہو گیا۔ اس عہد میں اُردو شعراء سے
متعلق تذکرے بھی ترتیب دیے گئے اور نثر کی جانب
بھی توجہ دی گئی۔ آصف جاہ ثانی کے آخر عہد میں شمال کے
اُردو شاعروں نے حیدرآباد کا رخ کیا اور مشاعروں کا
بازار گرم ہونے لگا۔ بیرونی شعراء کی آمد کے ساتھ
ہی عہدِ آصفیہ میں اُردو شعر و ادب کے فروغ کو

ہندوستان بھر میں نمایاں مقام حاصل ہو۔ سلطنتِ آصفیہ
کا یہ عہد اُردو شعر و ادب کے عروج اور استقرار
میں بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے کہ اگر اس عہد میں
اُردو شعر و ادب کا نشو و نما پر جمود طاری ہو
ہو جاتا تو بہت ممکن تھا کہ سارے ہندوستان میں
اُردو ادب کو وہ عروج نصیب نہ ہوتی جو آج حاصل
ہے ——

=

باب سوم

اردو شعر و ادب بہ عہد آصف جاہ سوم
تا پنجم (۱۸۰۳ء تا ۱۸۶۸ء)

مرقع محس

عکس نخل تمیر

نواب مختلد دۂ بہ دز آصف جاہ ثـ

نواب میر نظام علی خان آصف جاہ ثانی کی وفات کے بعد ان کے دوسرے فرزند صاحبزادہ نواب
اکبر علی خان سکندر جاہ کے لقب سے آصفیہ سلطنت پر متمکن ہوئے ۔

میر اکبر علی خان ۱۱ رجب ۱۱۸۲ھ م ۱۷۷۱ء کو نہایت اعلیٰ مقام گولکنڈہ میں تولد ہوئے ۔
اپنے والد آصف جاہ ثانی کی زیر سرپرستی شاہی محلات میں تعلیم حاصل کی ۔ عربی ، فارسی کے ساتھ ساتھ شہسواری ، شمشیر
تیر اندازی ، گھوڑ سواری اور ہاتھی سواری کی تربیت حاصل کی ۔ آصف جاہ ثانی کو عہدِ طفولیت سے خاص لگاؤ تھا ۔

میر اکبر علی خان اپنے والد کے انتقال کے بعد ۲۳ ربیع الثانی ۱۲۱۸ھ م ۱۹ اگست ۱۸۰۳ء کو مسند نشین ہوئے ۔
اس وقت ارسطو جاہ صدر المہام تھے ۔ ۱۸۰۴ء میں ارسطو جاہ نے انتقال کیا ۔ سکندر جاہ نے راجہ راجندر کو
جو عہدہ پیشکاری پر فائز تھے ان کو عارضی طور پر صدر المہامی کے عہدہ پر فائز کیا ۔ اس وقت تک انگریزوں کا
عمل دخل دربار میں بہت بڑھ چکا تھا اور ریزیڈنٹ کا اصرار تھا کہ میر عالم کو صدر المہام مقرر کیا جائے ۔
سکندر جاہ نے انگریزوں کی خواہش کو رد کیا لیکن بالآخر انھیں ریزیڈنٹ کی بات ماننی پڑی اور ۱۸۰۴ء میں
میر عالم کو صدر المہام بنا دیا گیا ۔ میر عالم آصف جاہ ثالث سے زیادہ انگریزوں کے وفادار تھے ۔ راجہ چندو لال کو
ان کا پیشکار مقرر کیا گیا ۔ میر عالم نے چار سال بعد ۲۳ ذی الحجہ ۱۲۲۳ھ م ۱۸۰۸ء کو انتقال کیا ۔
آصف جاہ ثالث کی خواہش تھی کہ میر عالم کے جانشین کے طور پر میر عالم کے داماد منیر الملک کا تقرر کیا جائے ۔
لیکن انگریزی سرکار نے اس کی مخالفت کی ۔ آصف جاہ ثالث نے انگریزی سرکار کی خواہش کی پروا کیے بغیر

منیر الملک کو مدار المہام بنا دیا اور راجہ چندو لال نائب مدار المہام مقرر ہوئے۔ چندو لال آخر تک سرکار
کے بہی خواہ تھے چنانچہ نائب مدار المہام بننے کے بعد انہوں نے سلطنت آصفیہ کی طرف کوئی توجہ نہیں دی جس کی
وجہ سے سلطنت کا مالیہ بگڑنے لگا۔ فوجی اخراجات بے انتہا بڑھ گئے تھے۔ جب سکندر جاہ کو سلطنت کے مالیہ کی
حالت کے بارے میں معلوم ہوا تو انہوں نے چندو لال کو ہٹانا چاہا۔ گورنر جنرل ہند نے اس کی مخالفت کی اور واضح الفاظ میں
کہہ دیا کہ چندو لال کی خدمات سے تعلقات میں استحکام پیدا ہوتا ہے۔ سکندر جاہ نے اس مشکل دور میں چندو لال سے
بعض اوقات کا حساب طلب کیا۔ گورنر جنرل نے چندو لال کی حمایت کی اور سکندر جاہ سے کہا کہ یہ وزیر اعظم کے
کام میں بیجا مداخلت ہے۔ سکندر جاہ کو انگریزوں کے اس طرز عمل سے بہت سخت صدمہ ہوا اور وہ محل میں گوشہ
نشین ہو گئے۔ جاہ بیرونی تک دربار سے تشریف نہیں لے گئے نتیجہ یہ ہوا کہ انگریزوں کا اثر و رسوخ اور
بڑھ گیا دوسری طرف ملک کی مالی حالت مزید ابتر ہو گئی۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ حکومت انگریزوں
کی قرضدار ہو گئی۔

سلطنت آصفیہ کی اس حالت کی خبر جب مرہٹوں کو ہوئی تو انہوں نے بعض سرحدی علاقوں میں
لوٹ مار شروع کر دی۔ جب سکندر جاہ نے دیکھا کہ سلطنت کی حالت روز بروز بدتر ہوتی جا رہی ہے تو انہوں
نے انگریزوں سے مل کر مرہٹوں کی سرکوبی کا عزم کیا اور مرہٹوں کو خاطر خواہ سزا دینے کی بجائے
کو اپنا دار السلطنت پونا چھوڑ کر بٹھور کی جانب فرار ہونا پڑا۔ چندو لال نے پامر کمپنی سے
پچیس لاکھ روپیہ سودی قرض حکومت آصفیہ کے لیے حاصل کیا تھا۔ شرح سود بہت زیادہ تھی چنانچہ چار
برس میں یہ قرض ساٹھ لاکھ ہو گیا۔ انہی وجوہات کی بنا پر سکندر جاہ نے چندو لال سے استعفیٰ طلب کر لیا[1]۔

---

[1] پروفیسر ثمینہ شوکت "چندو لال شادان - حیات اور کارنامے" ص ۱۱ سنہ اشاعت ۱۹۸۳ء)۔

اور میر عالم کے نواسے منیر الملک کو مدار المہام مقرر کیا ۔

سنہ ۱۸۲۲ء م ۱۲۳۷ھ میں سکندر جاہ آصف جاہ ثالث کی اہلیہ چہیتی صاحبہ دنیا سے منتقل ہوگئیں۔ سکندر جاہ کو بے انتہا صدمہ ہوا۔ بیوی کی اس جدائی کو وہ برداشت نہ کر سکے۔ اور غم میں گھلتے چلے گئے بلکہ آخر میں دق ہوگئی۔ رفتہ رفتہ مرض نے زور پکڑا حد کو پہنچ گیا اور اسی مرض میں ۱۷ ذیقعدہ سنہ ۱۲۴۴ھ م سنہ ۱۸۲۹ء کو سکندر جاہ آصف جاہ ثالث نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ اس وقت عمر شریف ۴۳ سال تھی۔

آصف جاہ ثالث نے ۲۶ برس ۴ ماہ چھ دن حکمرانی کی۔ آپ کے انتقال کے بعد آپ کے سب سے بڑے صاحبزادے میر فرخندہ علی خان ناصر الدولہ آپ کے جانشین ہوئے ۔

سکندر جاہ آصف جاہ ثالث کے عہد میں ارباب علم و ادب اور فنون لطیفہ کے بڑے بڑے فنکار اور قدر دان حیدرآباد میں موجود تھے۔ چندو لال شاداں خود شاعر تھے اور شعر و سخن کے قدر دان بھی تھے اور ہر شب اپنے دربار میں مشاعرہ منعقد کیا کرتے تھے۔ مقامی شعرا کے علاوہ دہلی کے شعرا کو بھی انہوں نے اپنے یہاں آنے کی دعوت دے رکھی تھی چنانچہ شیخ محمد حفیظ اور شاہ نصیر دہلی سے حیدرآباد تشریف لے آئے اور چندو لال کے دربار سے وابستہ ہوگئے۔ چندو لال نے شاہ نصیر کے آگے زانوئے ادب تہہ کیا اور ان کی عالی قدر و منزلت کی۔ شاہ نصیر مستقل طور پر حیدرآباد میں قیام اختیار کیا جب شاہ نصیر نے ۱۲۵۴ھ میں انتقال کیا تو چندو لال نے شیخ حفیظ سے مشورہ سخن کیا اور انہیں اپنے دربار کا ملک الشعرا قرار دیا۔

اس عہد میں قاضی محمد علی صابر، سید محمد خان ایمان، مولوی ابو تراب، میر عنایت علی، حافظ تاج الدین جیسے ممتاز شعرا حیدرآباد میں موجود تھے۔ مہ لقا بائی چندا بھی اسی عہد میں

۱؎ غلام حسین خان "گلزار آصفیہ" ص ۲۵۱ سنہ اشاعت ۱۲۶۰ھ ۔

NAWAB NASIRUDDAWLA BAHADUR

دستخط دے دیے تھے۔ اس عہد کا ایک اہم واقعہ شاہ محمد صدیق قیس شاہ کی بیعت شیر محمد خان لوہانی کا شاعر تھے۔ سکندر جاہ آصف جاہ ثالث خود بھی ایک اچھے شاعر تھے اور فارسی میں داد سخن دیتے تھے۔

ناصر الدولہ آصف جاہ رابع میر فرخندہ علی خاں ۱۷ رمضان المبارک سنہ ۱۲۰۹ھ م ۱۷۹۴ء محلات محمد آباد (بیدر) پیدا ہوئے۔ بچپن ہی سے ناصر جنگ ناصر الدولہ خوش قسمت ہوا۔ شاہی محل میں تعلیم و تربیت پائی۔ نواب سکندر جاہ آصف جاہ ثالث کی وفات پر چونتیس ۳۴ سال کی عمر میں ۱۶ ذوالقعدہ ۱۲۴۴ھ م ۱۸۲۹ء بروز یکشنبہ تخت سلطنت پر جلوس کیا۔ نواب منیر الملک امیر الامرا و مدار المہام اور راجہ چندو لال شادان نائب مدار المہام کی خدمات پر برقرار رہے۔ ۱۸۳۲ء میں نواب منیر الملک نے انتقال کیا اور راجہ چندو لال شادان مدار المہام مقرر ہوئے۔ آصف جاہ رابع نے اپنی سالگرہ کے موقع پر انھیں راجہ راجایان کا خطاب اور منصب ہشت ہزاری اور جاگیر سے سرفراز کیا۔ چندو لال کی شاہ خرچی، زر افشانی کی وجہ سے سلطنت قرضوں میں مبتلا ہو گئی۔ ناصر الدولہ اعلیٰ تعلیم یافتہ لائق مدبر حکمراں تھے انھوں نے مدار المہام کی کارگزاری کا یہ عالم دیکھا تو ۱۸۴۳ء میں چندو لال کو معزول کر دیا اور راجہ رام بخش کو مدار المہامی کی خدمت پر مامور کیا۔ راجہ رام بخش نے ان مشکل حالات میں کچھ کر گزرنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہے آخر کار تین سال بعد مستعفی ہو گئے۔

چندو لال کے زمانے میں سرکاری خزانہ ایک طرح سے خالی ہو گیا تھا اور حکومت پر قرضوں کا بوجھ دن بدن بڑھ رہا تھا اور فوج کی تنخواہ کے لئے بھی خزانے میں رقم نہیں تھی۔ حالات کو سدھارنے کی غرض سے ۱۲ شعبان ۱۲۶۹ھ م ۱۸۵۳ء میں سالانہ اکیاون لاکھ آمدنی کے محال کا معاہدہ سرکار ایسٹ انڈیا کمپنی

ماخوذ از گلشن شوکت "مہاراجہ چندو لال شادان حیات اور کارنامے" ص ۱۸۵۔

سے سپرد کر دیا گیا۔ اس وقت سراج الملک مدار المہام کے عہدے پر فائز تھے۔

ناصر الدولہ آصف جاہ رابع سیاسی سوجھ بوجھ کے آدمی تھے انہوں نے بعد ازاں انگریزی حکومت کے دباؤ کو کم کیا لیکن آصفیہ حکومت اور انگریزی حکومت کا باہمی تعاون قائم و برقرار رہا۔ صوبہ برار کا معاہدہ ۲۰ رمئی ۱۸۵۳ء کو انجام پایا اور ۲۵ رمئی ۱۸۵۳ء کو سراج الملک نے داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ آصف جاہ رابع نے ان کے بھتیجے میر تراب علی خاں سالار جنگ اول کو مدار المہام مقرر کیا۔

سالار جنگ اول نے جب سلطنت آصفیہ کی مدار المہامی کی خدمت اپنے ہاتھ میں لی اس وقت ان کی عمر ۲۴ برس[۱] تھی۔ نوجوان وزیر کو بڑی مشکل حالات کا سامنا تھا۔ سلطنت آصفیہ اقتصادی طور پر دیوالیہ ہو چکی تھی۔ حکومت پر ساہوکاروں اور انگریز حکومت کا تقریباً ۲½ کروڑ روپیے کا قرضہ واجب الادا تھا۔ نوجوان مدار المہام نے حالات کا باریک بینی سے جائزہ لیا اور رفتہ رفتہ حالات کو سدھارنے کی سعی کرنے لگے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ ہی عرصہ بعد عوام کا اعتماد بحال ہوا۔ سلطنت کی آمدنی میں بھی اضافہ ہوا۔ سرکاری خزانے میں محاصل جمع ہونے لگا۔ اور آہستہ آہستہ حالات قابو میں آنے لگے۔ معاشی حالات کے قابو میں آنے کے بعد تہذیبی سطح پر بھی ترقی ہونے لگی۔

ناصر الدولہ کے عہد میں کئی اصلاحی کام بھی انجام دیے گئے[۲]۔ خالصہ کے استحکام کی غرض سے اور مقامی صنعت کو فروغ دینے کے لیے یہ شاہی حکم نافذ کیا گیا کہ کوئی شخص انگریزی سامان استعمال نہ کرے بلکہ اپنے ملک میں تیار کردہ اشیا ہی استعمال کریں۔ دفاتر میں بیرونی کاغذ کے بجائے حیدر

۱؎ ڈاکٹر ثمینہ شوکت "حیات امیر حیدر دلاور جنگ کی خدمات" ص ۱۸۶ مجم
۲؎ عبد الحی "مملکت آصفیہ" جلد اول ص ۱۲۹ کراچی ۱۹۴۸ء۔

دیسی کاغذ کا استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ قدیم وضع کی کاغذ سازی صنعت کی طرف بھی توجہ ہو گئی۔ جو حکومت کی سرپرستی اختیار کر گئی تھی۔ طبی مدرسے قائم کئے گئے ان میں طب پڑھاتے اور اردو میں تعلیم دیا کرتے تھیں۔

۱۲۶۱ھ م ۱۸۴۵ء میں سالار جنگ کے قریب ایک طبی اسکول حیدرآباد میڈیکل اسکول کے نام سے قائم کیا گیا[1]۔ اس اسکول کی اہم خصوصیت یہ تھی کہ یہاں طلباء کی تعلیم اردو زبان میں دی جاتی تھی۔ طلبا کو ذریعۂ طب کی کتابیں بھی اردو میں تراجم کروا کر حفظ تعلیم کی جاتی تھی۔ اس میڈیکل اسکول کے فارغ التحصیل ڈاکٹروں سے انگریز بھی متاثر تھے۔

۱۲۵۸ھ م ۱۸۴۳ء میں نواب محمد فخرالدین خان شمس الامراء ثانی نے حیدرآباد میں سب سے پہلا ہائی اسکول "مدرسہ فخریہ" کے نام سے قائم کیا[2]۔

ناصرالدولہ کے عہد میں اردو شاعری کو بے انتہا فروغ حاصل ہوا۔ حیدرآباد میں بیرونی شعراء کی آمد کا سلسلہ جاری تھا بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ شمالی ہند کے شعراء کا تانتا حیدرآباد کے دربار میں لگا ہوا تھا۔ بیرونی شعراء کی اس آمد و رفت کی وجہ سے مملکت آصفیہ میں اردو شعر و ادب پر شمالی ہند کی زبان کا اثر زیادہ ہونے لگا اور دکنی محاورے اور الفاظ میں خاطر خواہ کمی واقع ہو گیا جس کی وجہ سے زبان میں سادگی و صفائی پیدا ہو گئی تھی۔

اس دور کے چند اہم شعراء میں، محمد مرزا مرزا، حاجی سید قربان حسین قربان، شاہ معین الدین ... خاموش، میر الدین ...، راجہ مکھن لال مکھن، محمد ہدایت علی خاں ہدایت،

---

[1] غلام یزدانی راؤ و پھول راؤ "داستان آصفیہ" ص ۳۶۵ سنہ اشاعت ۱۳۲۴ھ۔

[2] ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور "مرقع سخن" جلد اول ص ۱۱۵۔

نمونۂ حسینی، دیوان جوہر، خواجہ احسن اللہ بیان، محمد حبیب اللہ ذکا مدراسی ذیل درج ہیں۔

شاہ حسین الدین شاہ خاموش[1] ٹیپو کے رفیق والا جاہیہ الملک کے بزرگ تھے۔ آپ حضرت خواجہ بندہ نواز کی اولاد میں سے تھے۔ آپ کے مرشد علاؤ الدین شاہ ملا صاحب چشتی تھے۔ شاہ خاموش نے بارہ[12] برس تک سکوت اختیار کیا جس کی وجہ سے خاموش مشہور ہو گئے بعد ازاں اسی عرف لقب کو اپنا تخلص قرار دیا۔ ناصر الدولہ کے عہد میں حیدرآباد تشریف لائے۔ دیوان کلیات دفتر قرار ملحقات سے آراستہ ہوا ہے۔

ناصر الدولہ آصف جاہ رابع کے عہد میں شاعری کے ساتھ ساتھ نثر نگاری کی جانب بھی توجہ دی گئی۔ خاص طور پر ترجموں کے ذریعہ مغربی علوم و فنون کو اردو زبان میں منتقل کرنے کا اہم فرض ادا کیا گیا۔ اس سلسلہ میں نواب شمس الامراء ثانی کی علمی خدمات خاص طور پر قابل ذکر ہیں اور اردو دنیا ان کی خدمات کو کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ آپ ایک نہایت قابل اعلیٰ تعلیم یافتہ اور علمی شخصیت کے مالک تھے اور اردو کے قدر دان و محسن تھے۔ آپ کو انجینیرنگ، ریاضی، جغرافیہ، علم ہیئت اور دوسرے علوم و فنون سے کافی دلچسپی تھی ساتھ ساتھ آپ کو غیر زبانوں مثلاً انگریزی اور فرانسیسی پر کافی عبور حاصل تھا چنانچہ آپ نے اپنے قلم سے تالیف[1] و ترجمہ کا کام انجام دیا۔ آپ نے سائنس کی لغات کا اردو میں ترجمہ کروانے کا انتظام کیا اور اس غرض کے لئے ۱۸۳۴ء میں ایک دارالترجمہ کی حیدرآباد میں بنیاد ڈالی اور ساتھ ہی ایک مطبع بھی ۱۸۳۵ء میں قائم کیا جو "سنگی چھاپہ خانہ شمس الامراء" کے نام سے موسوم تھا۔ اس مطبع میں لیتھو گرافی کا اعلیٰ انتظام تھا۔ لیتھو پریس کی

---

[1] رحمن راج سکسینہ "تذکرہ دربار حیدرآباد" صفحہ ۸ سنہ اشاعت ۱۹۳۸ء۔

کی صورت میں سائنسی ادب کے لئے جگہ نہ تھی۔[1]

شمس الامراء کو تمام ایشیائی ممالک میں یہ منفرد اعزاز حاصل ہے کہ انہوں نے ۱۲۴۲ھ[2] میں اردو میں سائنسی علوم کے ترجموں کے کام کا آغاز کیا جبکہ علی گڑھ میں سائنٹفک سوسائٹی اس کے کافی بعد قائم ہوئی۔ فورٹ ولیم کالج کلکتہ اور فورٹ سینٹ جارج کالج[3] مدراس میں اردو نثر کا باب ضرور رقم ہو گیا تھا لیکن یہ کام صرف قصہ کہانیوں تک ہی محدود تھا۔ شمس الامراء نے اس عہد میں سائنسی ادب کا اردو میں ترجمہ کروا کر اردو ترجمہ کی بے مثال نظیر قائم کی۔ شمس الامراء کے اس کارنامے کی داد دیتے ہوئے نصیر الدین ہاشمی نے دکن میں اردو میں لکھا ہے کہ "شمس الامراء امیر کبیر نے جو کتابیں ترجمہ کرائیں وہ تقریباً بائیس ہیں۔ ان میں حسب ذیل قابل ذکر ہیں ـــ

(۱) اصول علم حساب (۲) رسالہ منتخب البقر (۳) کمسٹری کا رسالہ
(۴) رسالہ کمیسٹری (۵) رسالہ خلاصۃ الادویہ (۶) نافع الامراض
(۷) ترکیب ادویہ (۸) رسالہ حیوانات (۹) شمس العلاج
(۱۰) ہندسہ بابوز (۱۱) رسالہ علم زراعت (۱۲) رسالہ زہیری ـــ[4]۔

آصف جاہ ثالث کے عہد میں اس مملکت کی اقتصادی علمی و تہذیبی ترقی کے باوجود ناصر الدولہ کو

---

[1] ڈاکٹر محمد انور الدین "حیدرآباد میں اردو کے علمی ادبی رسائل کا تنقیدی جائزہ" ص ۱۳۰

[2] نصیر الدین ہاشمی "دکن میں اردو" ص ۵۰۳

[3] ڈاکٹر محمد افضل الدین اقبال "مدراس میں اردو" ص ۱۵۱ ۔

[4] نصیر الدین ہاشمی "دکن میں اردو" ص ۵۵۳ ۔

آصف جاہ خامس

نواب میر تہنیت علیخاں فتح جنگ نظام الملک افضل الدولہ غفران مکاں ۱۲۷۳ھ ۱۲۸۵ھ

معاہدہ برار کا سخت رنج تھا اس لئے مملکت آصفیہ کا ہر فرد ہر اس معاہدہ کی وجہ سے انگریزوں کا مخالف ہو گیا تھا اور برار کی سالانہ پچاس لاکھ کی آمدنی اب انگریز حاصل کر رہے تھے۔ ناصر الدولہ نے اپنے غم کو کسی پر ظاہر ہونے نہیں دیا لیکن اس کا اثر ظاہر تھا۔ آخر کار ۲۳ ربیع الثانی ۱۲۷۳ھ م ۱۷ مئی ۱۸۵۷ء کو انہوں نے داعی اجل کو لبیک کہا۔

نواب ناصر الدولہ آصف جاہ رابع نے ۶۲ سال کی عمر پائی۔ ۲۰ سال انہوں نے حکومت کی۔ آپ کے انتقال کے بعد آپ کے فرزند میر تہنیت علی خاں بحیثیت آصف جاہ خامس کے لقب کے ساتھ تخت نشین ہوئے۔

میر تہنیت علی خاں ۱۳ ربیع الاول ۱۲۴۳ھ م ۱۸۲۷ء کو پیدا ہوئے۔ تعلیم و تربیت شاہی محلات میں انجام پائی۔ بچپن ہی میں آپ کے والد بزرگوار نے انھیں افضل الدولہ بہادر کے خطاب سے سرفراز کیا تھا۔ تعلیم و تربیت کے لیے اپنے وقت کے اہم علماء مامور کیے گئے تھے چنانچہ مولانا شجاع الدین الحسینی برہانپوری ان میں خاص حیثیت رکھتے ہیں۔ نواب شمس الامراء امیر کبیر اور مختار الملک سالار جنگ جیسے آپ کے نگران مامور کیے گئے تھے۔ چونکہ خداداد صلاحیتوں کے حامل تھے آپ علوم و فنون کے ساتھ ساتھ اصول حکمرانی سے واقفیت حاصل کی۔

نواب ناصر الدولہ آصف جاہ رابع کے انتقال کے تیسرے زیارت کے دوسرے دن ۲۴ ذیقعدہ تا اعیان ریاست ۱۲۷۳ھ بروز سہ شنبہ قبل الظہر الغنی الہیار بہ لقب آصف جاہ خامس تیس سال کی عمر میں مسند آصفیہ پر رونق افروز ہوئے۔[1]

---

[1] مرزا علی عطا لع "نواب آصف الدولہ آصف جاہ خامس" ص ۱۱ سنہ اشاعت ۱۹۴۳ء

آصف جاہ پنجم نواب افضل الدولہ بہادر نے سلطنت کی باگ ڈور سنبھالنے کے بعد مملکت
کے شعبہ جات کی جانب خصوصی توجہ دی چنانچہ سلطنت آصفیہ کی جدید حد بندی کی گئی جیسا کہ پچاس کی تھی
ہر سلطنت آصفیہ کو پانچ صوبوں، سترہ ضلعوں اور کئی تعلقہ جات میں تقسیم کیا گیا۔ اس میں برار
کا علاقہ شامل نہیں کیا گیا تھا — ہر ضلع میں ایک صوبیدار اور ہر ضلع پر ایک اول تعلقدار اور دو
دوم تعلقداروں کا تقرر عمل میں آیا تاکہ ضلع کے انتظام میں سہولت ہو۔ کئی نئے محکمے قائم کیے
گئے جیسے تعمیرات، محکمہ عدالت، محکمہ صفائی، محکمہ تعلیمات اور محکمہ ابکاری وغیرہ —
عوام کی فلاح اور ترقی پر بطور خاص توجہ دی گئی چنانچہ شفاخانہ افضل گنج تعمیر کیا گیا اور کئی مدرسے
کھولے گئے —

آصفیہ سلاطین ایک زمانے میں بطور صوبہ دار دکن خطبہ شہنشاہ دہلی کی جانب سے نافذ
و ناظر رہے ہیں — اسی وجہ سے آصفیہ حکمرانوں کے خطبہ جمعہ میں مغل شہنشاہ کا نام پڑھا
لیا جاتا تھا اور آصفیہ سلطنت میں مغلیہ سکہ ہی رائج تھا۔

ستمبر ۱۸۵۷ء میں جب انگریزوں نے دہلی پر قبضہ کر لیا اور دھوکے سے مغل شہنشاہ
بہادر شاہ ظفر کو گرفتار کیا اور ۱۸۵۹ء میں ان پر جھوٹا مقدمہ دائر کرتے ہوئے جلا وطن کیا تو سر جان
لارنس چیف کمشنر پنجاب نے بہادر شاہ ظفر پر باغی ہونے کا الزام ثابت کیا — انگریز حکومت
نے سالار جنگ کے ذریعہ افضل الدولہ سے خواہش کی کہ وہ مغلیہ سکہ کے بجائے خود اپنے سکہ
کو رائج کریں اور اسی طرح خطبہ جمعہ سے مغل شہنشاہ کا نام خارج کیا جائے اور آصف جاہ پنجم
کا نام شامل کیا جائے —

نواب افضل الدولہ آصف جاہ پنجم اس تبدیلی کے حق میں نہ تھے وہ اپنے اجداد کی پیروی
کرتے ہوئے اپنی مملکت میں ڈھلنے والے سکے کے ساتھ ساتھ خطبہ جمعہ میں مغل شہنشاہ کے نام کو برقرار
رکھنا چاہتے تھے — لیکن انگریزوں کے دباؤ کے آگے وہ کچھ نہ کر سکے اور انگریزوں کے حسب خواہش
عمل کیا۔ جو نیا سکہ رائج ہوا اس کی ایک جانب نظام الملک آصف جاہ بہادر کندہ تھا اور دوسری جانب
ملوجہ میمنت مانوس فرخندہ بنیاد حیدرآباد کندہ کیا ہوا تھا۔ اس سکے کو سکہ حالی کہا جانے لگا اسی
طرح خطبہ جمعہ سے بہادر شاہ ظفر کا نام خارج کیا گیا اور افضل الدولہ کے نام کو شامل کیا گیا —

انگریزی حکومت آصف جاہ پنجم نواب افضل الدولہ کے ان اقدامات سے بہت خوش تھی
چنانچہ ملکہ وکٹوریہ نے بھی افضل الدولہ کی دوستی اور حمایت کے اعتراف میں ۲۲ صفر ۱۲۷۸ھ کو
G.C.S.I. کا خطاب اور بعض تحفے پیش بہا جواہرات "تلوار" مرصع سپر طرہ دستبند
بلیچ منہ ہار سرپیچ جیغہ کلغی وغیرہ کے علاوہ متعدد کمخواب کے تھان اور دو شالے بھی
تحائف میں پیش کئے —

افضل الدولہ نیک سیرت رعایا پرور بادشاہ تھے۔ انہوں نے فوج کی تنخواہوں میں
اضافہ کیا اور عملی غول کے نام سے ایک نئی فوج کی تشکیل دی جس میں کسی طرح کے اصول نہیں
تھے تمام فوج کے قواعد کی پابندی نہیں تھی۔ دراصل آصف جاہ پنجم عوام کو زیادہ سے زیادہ مراعات
فراہم کرنا چاہتے تھے تاکہ عوام کی گذر بسر اچھی طرح ہو سکے۔ ۱۲۷۶ھ میں جب ہندوستان میں شدید
قحط پڑا اور غلہ و اناج ملنا دشوار ہو گیا تو نواب افضل الدولہ بہادر نے شاہی خزانے سے لاکھوں
روپیوں کا اناج خرید کر غریبوں میں مفت تقسیم کیا لہذا اس طرح انسان دوستی کا ثبوت
بہم پہنچایا ہے

افضل الدولہ کے عہد میں اردو شعر و ادب کو خوب فروغ حاصل ہوا۔ شعر و سخن کی محفلیں ہر روز آراستہ ہوتی تھیں جن میں شاعروں کی دعوت تھی۔ اس دور میں مرزا عبداللہ بیگ ہوش، میر احمد علی اکبر، میر عنایت الدین صاحب، سید احتشام علی احسن، سید اشرف جوش، بہاری لال رمز، محمد حفیظ الدین پاکر، بچو لال تمکین، انوار اللہ فضیلت جنگ، جیسے اساتذہ سخن اردو شاعری کے افق پر موجود تھے۔ بادشاہ وقت نواب افضل الدولہ آصف جاہ پنجم خود بھی فارسی میں کلام موزوں کرتے تھے۔

نواب افضل الدولہ بہادر نے ۱۳ ذیقعدہ ۱۲۸۵ھ م ۲۶ فروری ۱۸۶۹ء بروز جمعہ انتقال کیا۔ انھوں نے ۴۲ سال کی عمر پائی بارہ سال ایک ماہ بیس دن حکمرانی کر کے [illegible] و قبول انجام دیئے — آپ کے انتقال کے بعد آپ کے صاحبزادہ نواب میر محبوب علی خان آصف جاہ سادس کم عمری کے ساتھ تخت نشین ہوئے —

باب چهارم

اردو شعر وادب بہ عہد میر محبوب علی خان
آصف جاہ سادس (۱۸۶۸ء تا ۱۹۱۱ء)

اعلحضرت نواب میر محبوب علی خان غفران مکان آصفجاہ سادس

حیدرآباد پرنٹنگ ورکس

اٹھارویں صدی میں اُردو شعروادب نے اپنی بنیادوں کو مضبوط کیا۔ انیسویں صدی میں حیدرآباد میں سلطنت آصفیہ میں شمالی ہند کی طرح اُردو ادب کو برابر فروغ ملتا رہا اور حیدرآباد اُردو ادب کا ایک اہم مرکز بن چکا تھا۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کی وجہ سے مغل شہنشاہیت کا خاتمہ ہو گیا۔ اودھ کی حکومت ۱۸۵۶ء ہی میں ختم ہو چکی تھی۔ واجد علی شاہ اگرچہ فورٹ ولیم میں ادبی نشست جمائے ہوئے تھے لیکن حیدرآباد میں آصفیہ حکومت کے استحکام نے سارے ہندوستان کے ادیب و شعراء کو متوجہ کر لیا تھا۔ آصف جاہ ہی کے عہد سے حیدرآباد میں بیرونی شعراء کی آمد شروع ہو چکی تھی جس میں ۱۸۵۷ء کے بعد مزید تیزی آئی۔

آصفیہ سلطنت کے پیشکار مہاراجہ چندولال شاداں کا دربار اہل علم و ادب کے لیے محفوظ پناہ گاہ بن چکا تھا۔

۱۸۶۹ء میں آصف جاہ خامس نواب افضل الدولہ نے داعی اجل کو لبیک کہا اور ان کے صغیر سن شہزادہ میر محبوب علی خاں نے تخت سلطنت سنبھالا۔

میر محبوب علی خاں نواب افضل الدولہ کے محل واحد النساء کے بطن سے بروز جمعہ ۵ ربیع الثانی ۱۲۸۳ھ م ۱۷ اگست ۱۸۶۶ء کو پرانی حویلی میں پیدا ہوئے۔ ابھی عمر دو سال سات ماہ دس یوم تھی کہ شفقت پدری سے محروم ہو گئے اور ۲۸ فروری ۱۸۶۹ء کو تخت نشین ہوئے۔ چونکہ آصف جاہ سادس صغیر سن تھے اس لیے حکومت کا انتظام ریجنسی (Regency) کے حوالے کیا گیا اور نواب شمس الامراء عمدۃ الملک کو ایجنٹ اور مختار الملک سالار جنگ کو خود مختار صدر المہام مقرر کیا گیا۔

آصف جاہ سادس ۷ ربیع الاول ۱۳۰۱ھ م ۵ فروری ۱۸۸۴ء

کو کامل اختیارات عطا کیے گئے اور انھیں مسند نشین کیا گیا۔ جشن

تاجپوشی میں وائسرائے ہند لارڈ رپن خاص طور پر کلکتہ سے حیدرآباد

آئے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ کوئی وائسرائے نے جشن تاجپوشی میں

مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی تھی۔ تخت نشینی کے موقع

پر نواب میر محبوب علی خاں آصف جاہ سادس نے دربار کے

علماء امراء و عمائدین کو خطابات سے نوازا۔ اس تمام کی تفصیل

نصیر الدین ہاشمی نے اپنی تصنیف "المحبوب" میں سلسلہ وار

درج کی ہے۔[1]

آصف جاہ سادس ڈھائی سال کی عمر میں مالک تخت و تاج

ہوئے۔ اٹھارہ برس کی عمر میں مسند نشین ہوئے اور اس کے بعد

۲۸ سال نہایت شان و شوکت کے ساتھ حکمرانی کے فرائض

انجام دیے۔ رعایا کی فلاح و بہبود کے لیے مثالی اقدامات کیے۔

مدرسے تعمیر کیے، شفا خانے بنوائے۔ اس عہد میں ادبی انجمنیں قائم ہوئیں۔

---

[1] نصیر الدین ہاشمی "المحبوب" ص ۳۱ طبع ۱۹۹۶ء حیدرآباد

ہر بشر کے لئے موت کا ایک دن معین ہے۔ آصفجاہ سادس

نے ۳۱ راگست ۱۹۱۱ء بروز شنبہ دن کے ۱۱½ بجے مختصر سی علالت

کے بعد انتقال کیا۔ معتصم جنگ اعتصام الدولہ نے تاریخ کہی

وہ چراغ دکن بجھ گیا آج ؎

۱۹۱۱ء

مملکت آصفیہ میں ایک عرصہ سے دفتری کام فارسی

کے ساتھ ساتھ اردو میں بھی کیا جانے لگا تھا۔ آصف جاہ سادس

نے سرکاری کام اس دو عملی کو دور کرنے کی غرض سے ۱۳۰۱ھ م ۱۸۸۴ء

میں مملکت کے تمام امور کو اردو میں پیش کرنے کے احکام جاری کئے۔

رضی الدین ہاشمی اردو کو سرکاری زبان قرار دئے جانے کے محرکات

کا بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

" ۱۳۰۱ھ میں جب دیکھا گیا کہ دفتر میں دو عملی

ہو گئی ہے اور اس سلسلہ میں فارسی اور اردو

مخلوط ہوجاتی ہے اور کوئی دفتر فارسی میں مراسلت
کرتا ہے اور کوئی اُردو میں کسی ناظم عدالت کا
فیصلہ تمامتر اُردو میں ہوتا ہے تو کسی کا فارسی اور
اُردو سے مخلوط۔ اس دوعملی کو دور کرنے اور نقائص
کو مٹانے کے لیے ایک خاص گشتی ١٣٠١ھ سنہ ١٨٨٤ء
میں جاری ہوئی اور اس میں تفصیل کے ساتھ تمام
امور کا اظہار کیا گیا اور اب تمام دفاتر مکمل
طور سے اُردو میں منتقل ہو گئے۔" ؎

نواب میر محبوب علی خاں کو شاعری کا ذوق ورثہ میں ملا تھا۔
بچپن ہی سے شعر کہنے لگے۔ جب تخت نشین ہوئے تو رام پور سے نواب
مرزا داغ کو حیدرآباد آنے کی دعوت دی۔ جب داغ حیدرآباد آئے
تو انھیں آصف سادس کی استادی کا شرف بخشا گیا اور انھیں
"فصیح الملک بلبل ہندوستان جہاں استاد" کے خطابات سے
سرفراز کیا گیا۔ دو ہزار روپیہ ماہوار تنخواہ مقرر کی گئی۔

؎ نصیرالدین ہاشمی "دکن میں اُردو" ص ٥٢٦

آصف سادس نے اپنے جد آصف جاہ اول بانی مملکت آصفیہ کا تخلص "آصف" اختیار کیا۔ ابتدا میں شمس الدین فیض کے شاگرد رشید حفیظ الدین یاس سے کلام پر اصلاح لی اور جب داغ حیدرآباد آ گئے تو انھیں استادی کا درجہ عطا کیا۔

آصف کے کلیات میں جملہ اصناف سخن ملتے ہیں۔ موضوعاتی نظمیں لکھنے میں آصف کو ملکہ حاصل تھا۔ انہوں نے نظم کو سنجیدگی سے اپنایا اور اخلاقی نظمیں کہیں۔ آصف کی غزلیں داغ کا انداز لیے ہوئے ہیں۔ انہوں نے استاد کے اسلوب کو نہایت کامیابی سے اپنایا۔ رفیع الدین ہاشمی اس سلسلہ میں لکھتے ہیں:

"اخلاقی نظموں کی طرح آپ کا عاشقانہ اور دلکش غزلیات بھی قابل داد ہیں۔ اشعار کے ملاحظہ سے ہوگا کہ لطف زبان، ترکیب کی خوبی، وضاحت معنوں، محاورات روزمرہ ہر پہلو

سے لایق صاد ہیں۔ داغؔ ہی کی طرز میں آپ غزل کہتے رہے اور اس میں ایسی مشق بہم پہنچائی کہ آپ کی غزل استاد کے ٹکر کی غزل ہوتی تھی۔ کیوں نہ ہو آخر کلام الملوک ملوک الکلام ہوتا ہے ——— " ۱؎

آصفؔ کے کلام سے غزل کے چند اشعار ذیل میں درج کئے جاتے ہیں:

خون تک دل کا نہ چھوڑا رکھتے ہی سینہ پر ہاتھ

واہ واہ دردِ حنا کیا ہاتھ کا چالاک تھا

فاتحہ پڑھتے ہوئے اس نے سمیٹے دامن // جب میرا دستِ ہوس قبر سے باہر نکلا

کبھی نہ دب کے چلیں گے ہم ان سے آصفؔ // وہ شاہِ جن سہی شہریار ہم بھی ہیں

واہ اے شانِ کریمی ترے صدقے قرباں // جس گنہگار کو دیکھا وہ گنہگار نہ تھا

لائے تھے وہ رقیبوں کو میرے مزار پر // اڑ کر غبار سامنے دیوار ہو گیا

آصفؔ کا ہے یہ قول سنیں صاحبِ عبرت // احسان نہ لے ہمتِ مرداں کسی کا

وصل میں تلخ بھی دشنام مزا دیتے ہیں // کوسنے والوں کو ہم دل سے دعا دیتے ہیں۔

ان حسینوں سے کوئی خون کا دعویٰ نہ کرے
خون بہا دیتے نہیں خون بہا دیتے ہیں

مقابل یوں ہے جب حسن کی طادتو ادھر یوسف ادھر بے پردہ تو

عہد آصف جاہ سادس میں اردو شعر و ادب کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ نے اس عہد کے حیدرآبادی شعراء کے ساتھ ساتھ اُس زمانے میں شمالی ہند سے حیدرآباد آنے والے متعدد شعراء کی فہرست بھی لکھی ہے۔ اقتباس ذیل میں درج کیا جاتا ہے :

" یہ دور بھی نہایت درخشاں رہا۔ حضرت آصف جاہ سادس ۱۳۲۹ھ جو آصف تخلص فرماتے تھے خود بھی اچھے شاعر تھے اور باکمال شعراء کی سرپرستی بھی فرماتے تھے۔ ان کی علم نوازی اور قدردانِ سخن کا شہرہ دور دور تھا۔ یوں تو شمالی ہند کے باکمال شعراء کی آمد و رفت کا سلسلہ پہلے سے قائم ہو چکا

تھا لیکن اس دور میں وہ اور مستحکم ہو گیا ...
اس وقت حیدرآباد میں اچھے اچھے ذی
کمال اور صاحب فن شعراء کچھ تو دکن ہی کے تھے
اور کچھ باہر سے آئے ہوئے تھے جن کی ایک
طویل فہرست مرتب ہو سکتی ہے ... جو شاعر اس
دور میں حیدرآباد آئے (وہ ہیں) سید کاظم حسن شیفتہ
لکھنوی، سید محمد کاظم حبیب کنتوری، حیدر یار جنگ
نظم طباطبائی، شمس الحق بیکش تھانوی، فصیح الملک
داغ دہلوی، امیر احمد مینائی، ظہیر الدین ظہیر دہلوی
احسان الحق نزار دہلوی، نواب مرزا شکیب دہلوی،
سید محمد شاہ وارثی بے تنظیر، درگا پرشاد ذکا فتحپوری
نادر علی برتر قنوجی، عبداللہ خاں ضیغم لکھنوی، نجم الدین
ثاقب بدایونی، عابد مرزا بیگم لکھنوی، سید محمد ضامن
کنتوری، محمد جمال الدین اشک لکھنوی، فصاحت جنگ

جلیل مانک پوری اختر یار جنگ اختر مینائی
ابو الحمید آزاد دہلوی منیر الدین ضیاء دہلوی
امیر حسن فروغ لکھنوی مرزا بہادر یاور اور
اصغر یار جنگ اصغر وغیرہ۔" [1]

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور نے حیدرآباد آنے والے جن
شعراء کی نشاندہی مندرجہ بالا اقتباس میں کی ہے۔ اسے مکمل
نہیں کہہ سکتے۔ اس فہرست میں متعدد شعراء کے نام نہیں۔
بہرکیف عہد محبوبیہ میں سرزمین حیدرآباد میں اردو شعراء
کی ایک کہکشاں تھی۔ جس سے ساری اردو دنیا منور
ہو رہی تھی۔ آئندہ صفحات میں اس عہد کے شعراء کی
ادبی خدمات کا بیان کیا جائے گا۔

---

[1] ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور " مرقع سخن " ص ۲۳۰

الطاف حسین آزاد

آپ کا نام الطاف احمد تخلص آزاد تھا۔ آپ کی ولادت ۲۷ رجب ۱۲۸۸ھ م ۱۸۷۰ء میں سہارنپور (یو۔پی) میں ہوئی۔ آپ کے والد محمد حسین نے ابتدائی تعلیم وہیں دلوائی بعد ازاں عربی فارسی میں مہارت حاصل کرلی۔ نوجوانی میں طب کی سند حاصل کرکے دہرادون میں اپنا ذاتی مطب کھول لیا مگر زیادہ کامیابی حاصل نہیں ہوئی چنانچہ مطب بند کرکے طبیہ محبوبیہ میں حیدرآباد آگئے۔ حیدرآباد میں حکمت شروع کی۔ اچھا ادبی ذوق رکھتے تھے۔ جس کی وجہ سے ہفتہ وار اخبار "الاعظم" جاری کیا جو کچھ دن کے بعد بند ہوگیا۔ آپ کا انتقال ۱۹۴۳ء میں حیدرآباد میں ہوا۔ [1]

شاعری کا شوق جناب آزاد کو کم عمری سے ہی تھا۔ حالی کی مقدمہ شعر و شاعری سے متاثر تھے۔ اس لیے حالی ہی

---

[1] صاحب حیدرآبادی۔ جنوبی ہند میں رباعی گوئی۔ حیدرآباد ۱۹۸۶ء ص ۲

سے اصلاح سخن حاصل کی۔ حیدرآباد کی ادبی محفلوں میں اپنا کلام پڑھتے تھے۔ اس لیے مہاراجہ شادؔ کے مشاعروں میں بھی پابندی سے شرکت کرتے تھے۔ انہوں نے اپنا ایک مجموعہ "معارفِ جمیل" کے نام سے شائع کیا جو غزلیات پر مشتمل ہے۔ اس کی اشاعت کی تمامتر ذمہ داری تراب علی باز نے اٹھائی۔ آزاد کے کلام میں تمام اصنافِ سخن پائے جاتے ہیں۔ غزل، قصیدہ، نعت و حمد اور موضوعاتی رباعیات پر بھی انہوں نے آزمائی کی ہے۔ نمونہ کے طور پر غزل کے اشعار ملاحظہ ہوں ؎

پھر دل میں یاس و حسرت و ارماں کا جوش ہے
پھر دل کی آرزو ہے کہ گم کردہ ہوش ہے

یہ جلوۂ جمال یہ موسیقیِ مقال
القصہ وقت فیصلۂ چشم و گوش ہے

حالِ تلاطمِ غمِ الفت نہ پوچھئے
اک بحر ہے کہ آنکھ پر گرم جوش ہے

جاں اب بھی جسم میں ہے مگر نقش جاں جسم
سر اب بھی دوش پر ہے مگر بارِ دوش ہے

آزاد اور فکرِ پس و پیش سب غلط
آزاد فارغِ غمِ فردا و دوش ہے

موضوعاتی ۔ رحلت ممتاز

اے فرقت ہمراز قیامت ڈھادی   اے رخصت دمساز قیامت ڈھادی
سوز مخ اور اکیلا آزاد   اے رحلت ممتاز قیامت ڈھادی

ایک رباعی میں حالی اور بیدل کی موت پر ماتم کیا ہے ؎

پھر چارۂ اغلاط غزل ہی نہ ملا   پھر رفع نقائص کا محل ہی نہ ملا
پھر حسرت اصلاح بر آ ہی نہ سکی   پھر حالی و بیدل کا بدل ہی نہ ملا

گورسرن بیلی آزاد توکلی

نام گورسرن بیلی اور آزاد تخلص تھا۔ آپ کی ولادت سنہ ۱۲۷۰ھ م ۱۸۵۲ء میں اودھ میں ہوئی۔ آپ کے والد رائے راج اوج بھی شاعر تھے۔ آزاد کی ابتدائی تعلیم اودھ میں ہوئی۔ تعلیم حاصل کرنے کے بعد دیگر شعراء کی طرح "عہد محبوبیہ" میں حیدرآباد آئے۔ حیدرآباد کے کائستھ گھرانہ میں شادی کی۔ جناب آزاد کے چچا جناب بلی آلور بھی مشہور شاعر گزرے ہیں۔ آپ کی اولاد کا پتہ نہیں چلتا۔ جناب آزاد ستر سال کی عمر میں سنہ ۱۳۴۰ھ میں وفات پائی۔

شاعری میں جناب آزاد نے ضامن کنتوری سے اصلاح سخن حاصل کی۔ شاعری کا شوق بچپن سے تھا۔ آزاد نے تمام اصناف میں طبع آزمائی کی۔ ان کی شاعری کے بارے میں خود ان کے استاد سخن ضامن کنتوری لکھتے ہیں:

"آزاد آزاد ہے۔ آزاد کا کلام آزاد کے دل کی آواز ہے۔ عارض نہیں، خال نہیں، کاکل نہیں، لفظی گورکھ دھندہ نہیں۔ بیان میں ایچ نہیں حقائق کا گنجینہ ہے۔ تعلیم و ہدایت کا آئینہ ہے۔" [1]

آزاد کے دو قلمی دیوان کتب خانہ سالار جنگ میوزیم میں محفوظ ہیں۔ جناب آزاد کی شاعری میں حمد، نعت، قصیدہ، رباعی، غزل اور تمام اصناف سخن ملتے ہیں۔ ایک شعر حمد کا ملاحظہ ہو:

ہر ذرۂ کونین ہے گوہر ذات خدا کا
بے جا ہے یہاں ذکر خلا اور ملا کا

۱؎ نصیر الدین ہاشمی "دکنی ہندو اور اردو" حیدرآباد ۱۹۵۶ء ص ۱۰۱

آزاد کی غزل میں بلا کی شوخی ہے۔ نمونہ کے طور پر چند
شعر ملاحظہ ہوں ؎

ممکن نہ تھا کہ چیر کے دکھلائیں دل تمہیں
قطرہ لہو کا اک سرِ مژگاں بنا دیا

یہ بھی پھرا اُدھر جدھر کو نگاہ پھری
دل کو نگاہِ یار نے چوگان بنا دیا

جناب آزاد نے خیام کی فارسی رباعیات کا اُردو میں منظوم
ترجمہ کیا تھا ملاحظہ ہو ؎

آنکھوں میں جو اپنے رہگذر رکھتا ہے ؛ ہر شاہ و گدا اس پہ نظر رکھتا ہے
جو یان دریا غواص اور گوہر خود ہے ؛ اس بات کے تہ کی وہ خبر رکھتا ہے

دیوانِ آزاد کے مطالعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ جناب آزاد
فارسی میں بھی طبع آزمائی فرماتے تھے۔ دیوان میں حمد، نعت
اور سعدی شیرازی کی فارسی غزلوں کا اُردو ترجمہ درج ہے۔
اس کے علاوہ آپ نے کئی قصائد بھی لکھے ہیں۔ جن میں قابل ذکر
مہاراجہ کشن پرشاد شاد کی مدح میں لکھا ہوا قصیدہ کا ایک

ایک شعر ملاحظہ ہو ؎

پیش کرتے ہیں جواہر بارگاہِ شاہ میں
مثلِ موزوں جوہر اگلے کیوں کان آفتاب

اس کے علاوہ آزاد نے موضوعاتی نظمیں بھی اپنی یادگار چھوڑی ہیں جیسے چوڑیاں، بسنت، کشمیر، پھاگن، گوداوری وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے دو قطعات ملاحظہ ہوں جو دیوان کے طبع ہونے کی خوشی میں لکھے گئے ہیں —

جو جناب وائسرائے وہبی نے لکھا ہے ؎

آزاد کا دیوان جب فضلِ خدا سے چھپ گیا :: کہنے لگے نقادِ فن گنجینۂ عرفاں ہے یہ
وہبی نے سالِ عیسوی طوطی کے لب سے یہ سنا :: خمخانۂ اہلِ ادب گلدستۂ دیوان ہے یہ
۱۹۳۸ء

نواب مرزا اسد علی خاں آصفیؔ

نواب میرزا اسد علی خاں نام اور تخلص آصفیؔ تھا۔ ۷ / جمادی الاول ۱۲۷۱ھ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد غلام حسین خاں صفدر جنگ حسام الدولہ فخر الملک تھے۔ آصفیؔ ۱۲۷۸ھ میں یتیم ہو گئے۔

ان کے سر سے والد کا سایہ اٹھ گیا۔ ان کے بڑے بہنوئی نواب سالار جنگ اول نے ان کی پرورش کی اور قابل اساتذہ سے اردو، فارسی، عربی اور انگریزی تعلیم کا بندوبست گھر پر کر دیا۔ فن خوشنویسی میں بھی انہوں نے مہارت حاصل کرلی تھی۔ ۱۲۹۱ھ میں آصفی محکمۂ جاگیرات سے وابستہ ہوگئے۔ آصفی کو عمر شباب میں شعر و شاعری سے دلچسپی پیدا ہوئی اور بہت جلد اس فن میں مہارت حاصل کی۔ علم عروض میں بھی انھیں دخل تھا۔ آصفی کے قلمی دیوان میں ایک غزل ایسی ملتی ہے جس میں انہوں نے اپنا تخلص اسد باندھا ہے۔ شعر ملاحظہ ہو۔

جوانی گئی پیری آئی اسد — یہ درد جوانی ہے پیری نہیں [1]

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ابتداء میں انہوں نے اسد تخلص کیا مگر بعد میں سلطنت آصفیہ کی وفاداری کے جذبہ کے تحت

---

[1] سید عباس حسین تقوی مشمولہ "مرقع سخن" جلد دوم مرتبہ ڈاکٹر زور حیدرآباد ۱۹۳۷ء ص ۱۷۳

انہوں نے آصفی تخلص اختیار کیا۔ ان کا کلام پاکیزہ ہے۔
ان کے اشعار نصیحتوں کا مجموعہ ہیں۔ انہوں نے اس دار فانی
سے کبھی دل نہ لگایا ان کے اشعار میں دنیا کی بے ثباتی
کا بیان ملتا ہے۔ بری صحبتوں کی خرابیوں کو انہوں نے
اپنے کلام کے ذریعہ واضح کیا ہے۔ آصفی اہلبیت سے دلی
عقیدت رکھتے تھے۔ انہوں نے سلام، مرثیہ، رباعی، نوحہ
اور قصائد بھی لکھے ہیں۔ ذیل میں ان کے کلام کا نمونہ پیش
کیا جاتا ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

ایک دن خاک میں ملنا ہے ضرور :: شوکت و شان نہ دکھلائیے گا
محو تھا قصر بنانے میں بہت کچھ منعم :: کیا خیال اس کو دم نزع تھا
ہم ہوئے پیدا تو پکاری قضا :: ساختہ میرا اور تیرا ہو گیا

آصفی چونکہ خاندان اثنا عشریہ سے تعلق رکھتے تھے اس لیے
اہلبیت الاطہار سے انھیں محبت اور دلی عقیدت تھی۔ اس کا اظہار آصفی
کے ذیل کے اشعار سے ہوتا ہے۔ یہ اشعار اس واقعہ کا اظہار

کرتے ہیں جب حضرت امام حسین علیہ السلام نے مدینے سے سفر کا عزم کیا تھا۔ آصفی نے اپنے ایک مرثیہ میں اس کیفیت کی تصویر یوں کھینچی ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

گھر سے جب بہر سفر حضرت شبیر چلے :: سر کٹانے کے لئے مالک تقدیر چلے
روتے اور پیٹتے سب صاحب تطہیر چلے :: کہا صغرا نے کہ ہے ہے شہ دلگیر چلے

آصفی نے قصیدے بھی لکھے ہیں۔ ان کا ایک قصیدہ جو حضرت فاطمہ زہرا رض کی ولادت پر لکھا گیا ہے اسی کے چند شعر پیش کئے جاتے ہیں ؎

جا چکا دور خزاں باغ میں آئی ہے بہار :: پھول پیدا ہوئے ہر خار میں پھولا گلزار
ایک اک نخل پہ گلزار کے ہیں سیکڑوں پھول :: ایک اک شاخ پہ بلبل نظر آتے ہیں ہزار
گدگداتی ہے انھیں باد بہاری آ کر :: پھول اس وجہ سے ہنستے ہیں چمن میں ہر بار [1]

سید جلال الدین اشک لکھنوی

آپ کا نام سید جلال الدین حیدر اور تخلص اشک تھا۔ سادات گھرانے سے تعلق تھا۔ ان کے والد حضرت امیر شمس الدین حیدر

---

[1] سید عباس حسین نقوی مضمون مشمولہ "مرقع سخن" جلد دوم مرتبہ ڈاکٹر زور۔ حیدرآباد۔ ۱۹۳ء ص ۱۲۶

تھے۔ سلسلۂ نسب حضرت سیدنا امام جعفر صادق سے جا ملتا

ہے۔ اشک کی ولادت ۱۲۵۹ھ میں لکھنؤ میں ہوئی۔ اشک

کے والد میر شمس الدین حیدر، راجہ چندو لال شاداں کی

مدار المہامی کے زمانہ میں حیدرآباد تشریف لائے اور دربار

آصفیہ سے دو سو روپیہ ماہوار منصب سے سرفراز ہوئے۔ اشک

کی تعلیم و تربیت ان کے والد کی سرپرستی میں ہوئی۔ انہوں نے

عربی، فارسی اور اردو میں مہارت حاصل کی۔ تعلیم کے بعد اشک

کی گزر معاش دربار آصفیہ کی منصب سے ہوئی۔ آپ کو کوئی

اولاد نہیں تھی۔ آپ کا وصال ۱۱ محرم ۱۳۰۹ھ کو ہوا۔ [1]

وصال کے بعد آصفجاہ سادس نے ان کی بیوہ کو وہی منصب جاری

رکھی۔ شاعری میں اشک کو شیخ محمد بخش شہید لکھنوی سے

تلمذ حاصل تھا۔ انھیں اپنے استاد سے حد عقیدت تھی۔ آپ کا

دیوان "تاریخی دستور الشعراء" فارسی میں شائع ہوا۔ اردو

دیوان کا پتہ نہیں چلتا کہ مرتب ہوا کہ نہیں۔ اردو کلام کا

نمونہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

---

[1] غلام صمدانی خاں گوہر، "تزک محبوبیہ" جلد دوم

دفتر ہفتم۔ حیدرآباد۔ ۱۳۱۹ھ ص ۱۰

کعبہ و دیر کی رہے گردش تو یار مل جائے گا کہیں نہ کہیں
اشک خوں میں ہیں ہمارے طوفاں خیز: ڈھلکے تر ہو کے آستیں نہ کہیں

اشک لکھنوی کی ایک غزل کے چند اشعار درج کیے جاتے ہیں:

نظر آتے ہی نہیں وصل کے ساماں دل میں
حسرتیں پھاڑتے ہیں آ کے گریباں دل میں

حال کھلتا نہیں کس بات پہ یہ جھگڑا ہے
اور آپس میں لڑا کرتے ہیں ارماں دل میں

بت کافر کی طرف کھینچ رہی ہے الفت
اپنا سر پیٹ رہا ہے یہاں ایماں دل میں

کچھ عجب طرح سے فرقت میں بسر ہوتی ہے
آرزو پیٹتی ہے روتے ہیں ارماں دل میں

اشک دھیان آتا ہے اس گل کا جو مانند نسیم
حسرتوں کی مری کھل جاتی ہیں کلیاں دل میں[1]

---

[1] غلام صمدانی خاں گوہر "تزک محبوبیہ" جلد دوم دفتر ہفتم، حیدرآباد ۱۳۱۹ھ ص ۱۰

راجہ راجیشور راؤ اصغر

آپ کا نام راجیشور راؤ اور تخلص اصغر تھا۔

آپ کی ولادت رجواڑے خاندان میں ہوئی۔ اصغر والیٔ سمستان دومکنڈہ کے جاگیردار تھے۔ آپ کے والد راجہ امبایت راؤ مہا بلونت خاندانی رئیس گزرے ہیں۔ جناب اصغر کی تعلیم و تربیت شاہانہ انداز میں راجاؤں مہاراجوں کے شہزادوں کی طرح ہوئی۔ زمانے کے دستور کے مطابق اصغر نے اردو، فارسی، عربی، تلنگی اور انگریزی میں مہارت حاصل کی۔ معاشی طور پر خودمکتفی تھے۔ اس لیے علم و ادب کا شوق بہت تھا۔ راجہ صاحب اصغر شاعر بھی تھے۔ کامیاب نثر نگار بھی اور مترجم بھی تھے۔ نہ جانے ان میں کیا کیا صفات تھیں۔ عہد محبوبیہ میں آپ نے اپنی نظم و نثر کا بڑا کارنامہ چھوڑا۔[1]

ذیل میں ان کے تصانیف کی فہرست دی جاتی ہے:

۱۔ محبوب الاخلاق ۲۔ حدیقۃ الاخلاق ۳۔ گلبن دانش
۴۔ گلزار دانش ۵۔ ریاض کشف الاسرار ۶۔ ہدیۃ الملوک
۷۔ مفتاح العارفین ۸۔ تاریخ ہند ۹۔ تاریخ جہانگیری
۱۰۔ طبقات اکبری ۱۱۔ معالجات الکلب ۱۲۔ تشریح الفردوس

---

[1] زینت ساجدہ "حیدرآباد کے ادیب" جلد دوم، حیدرآباد ۱۹۶۳ء ص ۵۸

۱۳۔ انتخاب بہار دانش ۱۴۔ انتخاب انوار سہیلی

۱۵۔ کارنامہ (ترجمہ جنگ نامہ) ۱۶۔ نجم اللغات

۱۷۔ مفتاح اللغات ۱۸۔ افسر اللغات ۱۹۔ گنجینۂ لغات

۲۰۔ مجمع الالفاظ ۲۱۔ فرہنگ فارسی ۲۲۔ فرہنگ عربی جدید

۲۳۔ فرہنگ الفاظ ہندی ۲۴۔ تصحیح الاغلاط

۲۵۔ مصطلحات علمیہ انگریزی و اردو ۲۶۔ قران السعدین

۲۷۔ گنجینۂ امثال ۲۸۔ مجموعہ ضرب الامثال ۲۹۔ گلدستہ معما

۳۰۔ رامائن اردو ۳۱۔ رامائن فارسی ۳۲۔ ادھیاتمہ رامائن

۳۳۔ جہاں عبارت اردو ۳۴۔ فسانہ زہرہ فارسی

۳۵۔ فرحت کدۂ آفاق ۳۶۔ الخط العثمانی ۳۷۔ کشکول اصغر

۳۸۔ قاموس الہند ۳۹۔ نغمۂ عنادل وغیرہ وغیرہ

قابل ذکر ہیں۔ ؎۱

اصغر کی شاعری میں ہمیں حمد، نعت، نوحہ، غزل

ریختہ تمام اصناف سخن ملتے ہیں۔ نمونہ طور پر ان کے دیوان سے

حمد کے اشعار درج کیے جاتے ہیں ؎

جدھر دیکھتا ہوں اسطرف اے جان جان تو ہے
عیاں ان پر جو ہو جائے کہ ہر دل میں نہاں تو ہے

؎۱ راجہ راجیشور راؤ اصغر۔ نغمہ عنادل۔ حیدرآباد ۱۳۵۷ھ ص الف

حریم دل میں ساکن ہے مکیں لامکاں تو ہے
حجر میں ہو شجر میں ہو ترا جلوہ نمایاں ہے۔
ہوا کیا سات پردوں میں جو آنکھوں میں نہاں تو ہے
تجھی پر لوگ مرتے ہیں تجھی پر جان دیتے ہیں
برہمن دیر کو جائے نہ جائے شیخ کعبہ کو
شمیم گل تو ہی ہے اور رنگ بتاں تو ہے
کہاں تک کر سکے اصغر بیاں رنگینیاں تیری
فقط پردہ ترا ہے اور پردے میں نہاں تو ہے

اصغر کے کلام میں موضوعات کا بڑا تنوع پایا جاتا ہے۔ شاید ہی کوئی موضوع ایسا ہوگا جس پر انہوں نے قلم نہ اٹھایا ہو۔ زبان کی تحقیق سے انھیں بڑی دلچسپی تھی۔ اسی شوق میں انہوں نے لغت نگاری کی طرف توجہ دی اور ہندی اردو، اردو ہندی لغات لکھی۔ ان کی غزل کے متفرق اشعار ملاحظہ ہوں:

گل سے بلبل کی خوش بیانی پوچھو؛ ذی فہم سے لطف نکتہ دانی پوچھو
خوشبو ہر ایک رنگ کی عطر سخن میں ہے؛ ہر پھول کی بہار ہمارے چمن میں ہے

وہ مجلس ہیں کہ ہم باغ سخن میں پھول چن چن کر
بنایا کرتے ہیں گلدستہ گلرویوں کی محفل کا

دل جس کا چاہے سیر کرے آکے دو گھڑی
دروازے سب کھلے ہوئے بیت سخن کے ہیں [1]

پھرتا ہوں پھول کو گلشن میں سونگھتا
یارب گل مراد مرا کس چمن میں ہے

آصف کے بارے میں نصیر الدین ہاشمی "دکن میں اردو" میں اس طرح رقمطراز ہیں:

"راجہ راجیشور راؤ بہادر عہد محبوبیہ کے ایک پرگو مصنف ہیں۔ آپ نہ صرف ایک نثار کی حیثیت سے پیش کیے جاتے ہیں بلکہ شاعری کا بھی خاصہ ملکہ تھا" [2]

محمد عبدالحئی بازغ

آپ کا نام محمد عبدالحئی اور تخلص بازغ تھا۔ آپ کی ولادت ۱۸۶۰ء میں حیدرآباد میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم اپنے

۱؎ راجہ راجیشور راؤ آصف "نغمہ عنادل" حیدرآباد ۱۳۵۷ھ ص ۵۲
۲؎ نصیر الدین ہاشمی "دکن میں اردو" دہلی ۱۹۸۵ء ص ۶۲۵

والد حافظ محمد حسین فروغ کی نگرانی میں حاصل کی۔

تعلیم مکمل کرنے کے بعد جناب باذغ محکمۂ مالگزاری میں ملازمت اختیار کی اور اسی محکمہ سے حسن خدمت پر سبکدوش ہوئے۔ ۱۹۲۳ء میں انتقال کیا۔

باذغ کو شاعری ورثہ میں ملی آپ کے والد جناب محمد حسین فروغ قادر الکلام شاعر گذرے ہیں۔ باذغ شاعری کی اصلاح حضرت ضیاء گورکھانی دہلوی سے حاصل کرتے تھے۔ جناب باذغ کے ہمعصر شعراء میں سید تمکین کاظمی کے والد سید منتخب الدین تجلی حضرت رضی الدین کیفی ڈاکٹر محی الدین قادری زور کے والد زعیم اور غلام حسین داد گذرے ہیں۔ جناب تمکین کاظمی رسالہ نقوش (لاہور) کے شخصیت نمبر جلد اول میں لکھتے ہیں:

"عبد الحئی باذغ میرے والد تجلی، کیفی، زعیم (ڈاکٹر زور کے والد) بھی شریک ہوتے تھے۔ کبھی یہ تینوں چاروں مل کر ایک نظم پوری کرتے تھے" [1]

---

[1] تمکین کاظمی مضمون رسالہ نقوش لاہور ۱۹۵۶ء شخصیات نمبر حصہ اول ص ۱۲۷

جناب بازغ کے کلام میں تمام اصناف سخن ملتے ہیں۔ انہوں نے ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ ان کا دیوان شائع نہیں ہوا۔ مختلف رسائل اور تصنیف میں چیدہ کلام ملتا ہے۔

ایک رباعی ملاحظہ ہو:

داد و دہش و بذل عطا کا نظام ؛ کس منہ سے بیاں ہو سکے اپنا انتظام
پھیلاؤں نہ کس واسطے دامن بازغ ؛ دربار ہے دربار ہے دربار نظام [1]

بازغ کی ایک موضوعاتی غزل "تصویر شاعری" کے اشعار ملاحظہ ہوں:

یہ ما حصل الفت و عشق شعرا ہے
خاصے ہیں تنومند مگر حال برا ہے
تمثال تفاخر ہوئی رسوائی عالم
اس عشق کا سرکار سے رتبہ کیا ملا ہے
معشوق جو ہیں اشکال تو الفت ہے کہاں کی ؛ تصویر جو خالی ہے تو پھر عشق ہی کیا ہے
ابرو ہیں کمان، تیز مژہ اور نگہہ تیغ ؛ وصف رخ جاناں ہے کہ سامان وغا ہے
غنچہ دہن و گل بدن و سرو سہی قد
دلبر کا سراپا ہے اک باغ لگا ہے [2]

۱؎ صاحب حیدرآبادی "جنوبی ہند میں رباعی گوئی" تذکرہ شعراء حیدرآباد ۱۹۸۷ء ص ۲۷۹

۲؎ رسالہ صحیفہ حیدرآباد ص ۲۷

محمد نادر علی برتر

آپ کا نام محمد نادر علی اور تخلص برتر تھا۔
آپ کی ولادت ۱۲۸۵ھ میں ضلع غازی آباد (یو۔ پی)
میں ہوئی۔ برتر کے والد حیدرآباد میں ملازمت کے لیے
تشریف لائے اور محکمۂ تعلیمات میں ملازم ہو گئے۔
سلطنت آصفیہ کے صوبہ برار میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس
مقرر ہوئے۔ برتر کی تعلیم ان کے والد کی سرپرستی میں ہوئی۔
انہوں نے عربی فارسی علم حفظ اور ریاضی میں مہارت حاصل کی۔

برتر کو شاعری کا شوق بچپن سے تھا انہوں نے
مرزا حسن رضا خاں صاحب رابط دہلوی سے اصلاح سخن
حاصل کی۔ رابط دہلوی مرزا غالب کے شاگرد تھے۔ شاعری
میں ان کے دو دیوان ہیں۔ ایک مثنوی "فغان برتر" اور دوسری
"شام عشرت" شائع ہوئی۔ اس کے علاوہ برتر نے ایک
ناول "اسرار غلمت" بھی لکھا جو آپ کی جدت طبع کا انوکھا

نمونہ ہے۔ اس کے علاوہ برتر ایک رسالہ "نسیم دکن"
کے مدیر بھی تھے۔ امانت پریس کے مہتمم بھی رہے۔
آپ کے دیوان کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ آپ نے
ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی۔ ۱؎

نمونہ کے طور پر ایک رباعی درج کی جاتی ہے ؎

ہوں سب کو عزیز زندگانی کی طرح ۔ خوش وقت ہوں عہدِ نوجوانی کی طرح
میں بھی وہ جوہرِ لطیف اے برتر ۔ ہر رنگ میں مل جاؤں پانی کی طرح

آپ کا کلام صاف اور رنگین ہے۔ ذیل میں غزل کے چند شعر
درج کئے جاتے ہیں ؎

توڑ دیں عہدِ وفا یہ انھیں منظور نہیں
ورنہ انداز نزاکت سے تو کچھ دور نہیں

ان کے کوچے میں پہنچکر بھی نہ پہنچا لیکن
ضعف کے پاؤں سلامت ہیں تو کچھ دور نہیں

یہ ضد بھی کوئی ضد ہے رنگ میری ضعف کا پاکر
قیامت ہے کہ انداز نزاکت سے خفا تم ہو

۱؎ غلام صمدانی خاں گوہر، "تزکِ محبوبیہ" جلد دوم۔ حیدرآباد ۱۳۱۹ھ ص ۳۲

نہیں معلوم تمکو قدر اپنے حسن کی لیکن
کہ تجھے سمجھے ہوئے ہو جسقدر اس سے سوا تم ہو

قیامت میں بھی ہو اک دھوم بزم عیش برتری کی
مزا ہو گر سزائے جرم الفت کی جزا تم ہو

ہوئی مشق تصور سے جلا کچھ اور حیرت پر
نظر پڑتی ہے آئینہ میں بھی اس بت کی صورت پر

برا ہو بدگمانی کا غضب میں جان ہے یوں بھی
کہ وہ محجوب کیوں ہوتے ہیں دشمن کی شکایت پر ؎

مولانا سید اعظم اللہ حسینی اطہر

سید اعظم اللہ حسینی نام اور تخلص اطہر فرماتے تھے۔

آپ کی ولادت ۱۱ ربیع الثانی ۱۲۸۹ھ کو ہوئی۔ آپ کے والد سید عبداللہ حسینی افسر جاگیردار تھے۔ اطہر کے والد قادر الکلام شاعر تھے اور حیدر علی خاں حیدر سے تلمذ تھا

؎ تمکین عابدی "سخنوران دکن" حیدرآباد ۱۳۵۷ھ ص ۱۲۰

اطہر کی تعلیم و تربیت مذہبی ماحول میں ہوئی۔ آپ کے والد نے اطہر کی پہلے دینی تعلیم کا انتظام کیا اور تقریباً ۹ سال کی عمر میں آپ نے قرآن شریف کی تلاوت مکمل کر لی۔ اس کے بعد آپ کو جامعہ نظامیہ میں شریک کر دیا گیا۔ اطہر کی والدہ ۱۲۹۹ھ میں انتقال کر گئیں۔ [1] آپ کی عمر اس وقت صرف دس سال کی تھی۔ آپ کے والد ۱۳۰۱ھ میں حج و زیارت اور مقامات مقدسہ کا ارادہ فرمایا اور اطہر کو بھی اپنے ہمراہ لے گئے۔ اس طرح اطہر بھی کم عمری میں حاجی ہو گئے۔ واپس آکر آپ باضابطہ مدرسہ نظامیہ میں شریک ہو گئے اور انھیں اچھے اچھے اساتذہ سے استفادہ کا شرف حاصل ہوا مثلاً استاد سید ابراہیم صاحب۔ مولوی عبداللہ خاں اور مولوی نظام الدین صاحب وغیرہ۔ یہ اساتذہ اپنے وقت کے ماہر تعلیم کہلاتے تھے۔ تین سال تک تعلیم حاصل کرنے

---

[1] محمد فاروق حسین۔ مضمون مشمولہ "مرقع سخن" جلد دوم مرتبہ ڈاکٹر زور۔ حیدرآباد ۱۹۳۶ء ص ۲۸۵

کے بعد آپ کے والد نے ۱۳۰۳ھ میں اطہر کو انگریزی کو انگریزی تعلیم حاصل کرنے کے لیے گرامر اسکول میں شریک کر دیا۔ وہاں انہوں نے ایک سال تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد ہی سخت بیمار ہو گئے اور تقریباً چھ ماہ بیمار رہے۔ جب اطہر صحتیاب ہوئے آپ کے والد اختر علیل ہو گئے۔ علالت ایک عرصہ تک چلتی رہی آخر ۱۸ ذی قعدہ ۱۳۰۵ھ روز یکشنبہ ان کا انتقال ہو گیا۔ اطہر کو والد کے انتقال کا سخت صدمہ ہوا اور تعلیم ترک کر کے فکر معاش میں مبتلا ہو گئے اور بالآخر خزانہ عامرہ میں چالیس روپیہ ماہوار پر ملازم ہو گئے۔

اطہر کو تعلیم حاصل کرنے کا بڑا شوق تھا۔ انہوں نے ملازمت کے ساتھ ساتھ فرصت کے اوقات میں تعلیم حاصل کرنے کے ارادہ سے مولوی عبیداللہ

جاگیرداری قانونی کمیٹی میں شرکت کرلی اور قانونی سند حاصل کرلی۔ اس کے بعد آپ کا نکاح شاہ سید عنایت اللہ حسینی صاحب کی دختر سے ہوگیا۔ جن کے بطن سے دو لڑکیاں اور ایک لڑکا تولد ہوئے۔

اطہر ایک جاندار اور سخت محنت کرنے والے انسان تھے۔ انہوں نے ترقی کرتے کرتے صدر محاسبی پر ترقی پائی۔ اطہر ۱۳۲۲ ف میں سخت علیل ہوگئے۔ بیماری کی وجہ سے وظیفہ حاصل کرلیا۔ مگر پھر صحتیاب ہوگئے۔

آپ کا دائرہ احباب کافی وسیع تھا۔ اس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے انہوں نے سید حیات الحسن ناظم عدالت پربھنی کے ساتھ مل کر وکالت شروع کی۔ اچانک آپ کا جوان لڑکا تھوڑی سی بیماری کے بعد انتقال کرگیا۔ اطہر کو اس کا سخت رنج ہوا۔ اس کی وجہ سے آپ کی شاعری پر گہرا اثر پڑا۔ [1]

---

[1] محمد فاروق حسینی مضمون مشمولہ "مرقع سخن" جلد دوم مرتب ڈاکٹر زور۔ حیدرآباد ۱۹۳۷ء ص ۲۲۹

آپ نے تقریباً تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی جیسے
غزل' حمد' نظم' نعت' منقبت' قصیدہ' رباعی' ہجو وغیرہ۔
اطہر کا کلام ان کے جذبات کی ترجمانی کرتا ہے۔ اس میں شاعرانہ
محاسن فصاحت' بلاغت' شکوہ الفاظ' سادہ سلیس زبان
اور پاکیزہ خیالات ملتے ہیں۔ آپ کے کلام کا ایک مجموعہ
"باغ فردوس" کے نام سے شایع ہوا۔ نمونے کے طور پر دو[2]
شعر درج کیے جاتے ہیں ؎

کونین کا جلوہ مجھے ہر سو نظر آیا ؛؛ سب رنگ نظر آگیا جب تو نظر آیا

حق اگر پوچھتے ہو تم اطہر ؛؛ حق نعمت کبھی ادا نہ ہوا

اطہر کی غزل کے چند اور اشعار بطور نمونہ درج ذیل ہیں ؎

وہی اچھے رہے جو مر گئے پہلے اطہر ؛؛ رنج دنیا نہ غم فرقت یاراں دیکھا

اس نے وعدہ کیا ہے آنے کا ؛؛ رنگ بدلا ہے کچھ زمانے کا

تڑپتے تڑپتے بستر ہو گئی ؛؛ قیامت کی شب تھی سحر ہو گئی ؎[1]

دوسری غزل کے متفرق اشعار ذیل میں درج کیے جاتے ہیں ؎

۱؎ محمد فاروق حسین مضمون مشمولہ "مرقع سخن" جلد دوم مرتبہ ڈاکٹر زور
حیدرآباد ۱۹۳۲ء صفحہ ۲۵۷

مری صحرا نوردی دیکھ کر وحشت بھی کہتی ہے
ابھی پیروں میں گردش ہے ابھی قسمت میں چکر ہے

اکبر کے دیوان میں غزلوں کے علاوہ نظمیں بھی ملتی ہیں جن کے موضوعات اصلاح معاشرہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی رباعیات بھی کافی مشہور ہیں۔ بطور نمونہ ذیل میں ایک رباعی درج کی جاتی ہے ؎

دیکھا اس دور کا تماشا دیکھا
اپنے بیگانے سب کو جانچا دیکھا
ہر جا پایا غرض غرض کا چرچا
جس کو دیکھا غرض غرض کا دیکھا

راجہ گردھاری پرشاد باقیؔ

آپ کا نام گردھاری پرشاد اور تخلص باقیؔ تھا۔ باقیؔ کا جنم یکم رجب ۱۲۷۷ھ میں بمقام حیدرآباد ہوا۔ آپ کے والد نرہری پرشاد نواب آصفجاہ نظام الملک خاص کے

کے ہمرکاب تھے۔ انہوں نے نظام الملک کے ساتھ جب پایہ تخت حیدرآباد منتقل ہوا۔ باقی کے والد بھی حیدرآباد منتقل ہوگئے۔ شاہی سرپرستی شامل حال تھی۔ شاہی صحبت سے مالامال تھے۔ نرہری پرشاد فارسی کے اچھے شاعر تھے اسی لیے باقی نے بھی فارسی میں مہارت حاصل کرلی۔ بچپن میں فارسی کے علاوہ اُردو اور انگریزی کی تعلیم بھی حاصل کی اور نوجوانی میں (۲۲) سال کی عمر میں سرکاری محکمۂ مال میں ملازمت اختیار کرلی۔[1]

باقی کی خوش اخلاقی اور ایمانداری سے متاثر ہوکر نواب آصف جاہ خامس نے فوج باقاعدہ کی تربیت کا کام ان کے ذمہ کردیا۔ ۱۳۱۲ھ میں باقی کو حکومت آصفیہ نے "راجہ محبوب نواز ونت" کے خطاب سے سرفراز کیا۔[2]

بہت کم عمری میں شادی ہوئی مگر ان کی بیوی زیادہ دنوں زندہ نہیں رہ سکی۔ بہت جلد فوت ہوگئی جس سے انھیں ایک لڑکا اور ایک لڑکی تولد ہوئی تھی۔ اس

۱۔ نصیرالدین ہاشمی "دکھنی ہندو اور اُردو" حیدرآباد۔ ۱۹۵۸ء ص ۱۷۱

۲۔ محمد احمد مجددی مضمون مشمولہ "مرقع سخن" مرتب ڈاکٹر زور حیدرآباد۔ ۱۹۳۷ء ص ۱۶۷

کے بعد باقی نے دوسری شادی کی۔ جس سے انھیں پانچ فرزند اور پانچ لڑکیاں پیدا ہوئیں۔ جن میں راجہ نرسنگ راج عالی مشہور ہوئے۔ باقی نے طویل عمر پائی تھی۔ ستر برس اس اس دار فانی میں رہنے کے ۲۲ صفر ۱۳۱۶ھ کو داعی اجل کو لبیک کہا۔ وہ ہندو دھرم کے سخت پابند تھے۔ مذہبی رواداری ان میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ انہوں نے بہت سے مندر تعمیر کرائے۔ باقی بہت نیک سیرت انسان تھے۔ تعصب و تنگ نظری ان میں نام کو نہ تھی۔ ان سے ملنے والوں میں اکثر مسلمان تھے۔[1]

شاعری میں حضرت استاد فیضی سے اصلاح حاصل کرتے تھے۔ باقی موسیقی، خطاطی کے فن میں ماہر تھے۔ اس کے علاوہ ان کو نگوان میں بہت دخل تھا۔ نہایت اعلیٰ درجہ کے خود اپنے ہاتھ سے تیار کرکے نواب آصف جاہ سادس کے حضور پیش کرتے اور داد حاصل کرتے۔

---

[1] ڈاکٹر عقیل ہاشمی "افتخار علی شاہ فن حیات اور کارنامے" حیدرآباد ۱۹۸۰ء ص ۸۷

باقی کی تصنیفات کثرت سے ہیں جن میں فارسی نظم کے بیس دیوان ہیں اور فارسی نثر کی تین تصانیف ہیں۔ اس کے علاوہ اردو نظم و نثر کی چار تصانیف ہیں۔ آپ ہندی میں بھی عبارت رکھتے تھے۔ انہوں نے ہندی بھاشا کی چار تصانیف یادگار چھوڑی ہیں۔ ان میں کی جملہ تصانیف کی تفصیلات ذیل میں درج کی جاتی ہیں:

فارسی نظم:

(۱) میزانِ عروض (۲) یادگارِ باقی (۳) قصاید باقی (۴) مثنوی ~~(۵)~~ صنایع بدایع (۵) بہار عام (۶) میرنس نامہ (۷) تہنیات باقی (۸) ضرب الامثال (۹) مکتوب منظومہ (۱۰) زمزمہ باقی (۱۱) بھاگوت شریف (۱۲) رامائن مسیحا (۱۳) رباعیات بابرکات (۱۴) رباعیات مناجات باران رحمت (۱۵) باقی نامہ (۱۶) باغ ارژان (۱۷) مثنوی شمع نو (۱۸) منشیات باقی (۱۹) کنوز التاریخ (۲۰) کلام متفرقات ہے[1]

---

[1] غلام صمدانی خاں گوہر "تزک محبوبیہ" جلد دوم ۔ دفتر ہفتم حیدرآباد ۔ ۱۳۱۹ھ ص ۲۹

فارسی نثر :

(۱) افضل التصحیح (۲) نوشتۂ عاشیت (۳) لباجھارت
کا فارسی ترجمہ

اُردو نثر و نظم :

(۱) بیتی چرتر (سوانح عمری سوامی بھاسکر (سندرسوتی)
(۲) تحقیقات سیاق باقیؔ (۳) بقائے باقی
(۴) درد باقی و درد ساقی

اس دیوان میں خواجہ میر دردؔ کی تقریباً دو سو فارسی رباعیوں
کا اُردو ترجمہ ہے ۔

ہندی بھاشا :

(۱) تیرتھ مال ـــــ بھجنوں کا مجموعہ (۲) شنجو بران
(۳) کیشو بران (۴) بھاگوت سار

باقیؔ کی شاعری میں سلاست ، شستگی اور برجستگی نمایاں ہے ۔
ان کا زیادہ تر کلام چھوٹی بحر کی غزلوں پر مشتمل ہے :

بام پر یار کا چہرا دیکھا :: طور پر نور کا شعلہ دیکھا
دل میں دنیا کا تماشا دیکھا :: موجزن کوزہ میں دریا دیکھا
قاصد اتنا ہی کہدے مجھے :: خط کو پڑھوا کے سنا یا دیکھا
عرض کی میں نے ادھر تو دیکھو :: کہا منہ غیر کے دیکھا دیکھا

میں نے دیکھا دہن جاناں کو
باقی عنقا کو ہے گویا دیکھا

باقی کو اہلبیت سے بے حد عقیدت تھی۔ مرثیہ کے چند شعر درج ذیل میں ملاحظہ ہوں:

پاؤں میں زنجیر جب سجاد کے ڈالی گئی :: غل ہوا ایسا کہ دن میں حشر برپا ہوگیا
گھر لٹا خیمے جلے شوہر گیا بیٹے گئے :: قید خانے میں پڑی بانو یہ کیا کیا ہوگیا [۹]

نواب معین الدین خاں اقبال

نام معین الدین خاں لیکن عظیم پاشاہ کے نام سے مشہور تھے۔ تخلص اقبال تھا۔ اقبال کے والد اورنگ آباد کے رہنے والے تھے۔ اقبال کی ولادت ۱۲۵۸ھ میں ہوئی۔ آپ کے والد

۹؎ باقی "دیوان بقائے باقی" حیدرآباد ص ۷۹

سید قمر الدین حسین المعروف عزیز یا شاہ اپنے
اپنے وقت کے بہت بڑے بزرگ اور صاحب دل
شخصیت تھے۔ آپ کے اجداد میں بہت سے
حضرات زہد و تقویٰ کی وجہ سے مشہور تھے۔ اقبالؔ
کی تعلیم و تربیت اپنے والد بزرگوار کے زیر سرپرستی
ہوئی۔ مذہبی تعلیم گھر پر ہوتی رہی۔ تعلیم حاصل کرنے
کے بعد اقبال صدر بلدہ بورڈ مقرر ہوئے۔ آپ کا
خاندان مشائخ تھا۔ اس لیے انھوں نے یہ ملازمت
ترک کردی۔ نواب آصفجاہ سادس نے اقبالؔ کو
اپنے ولیعہد نواب میر عثمان علی خاں کا اتالیق
مقرر کیا۔ آپ کی اعلیٰ قابلیت سے متاثر ہوکر
آصفجاہ سادس نے انھیں ۱۳۰۱ھ میں نواب معین الدین
خاں بہادر اقبال یار جنگ[۱] کا خطاب دیا اور منصب
سے سرفراز فرمایا۔ اقبال اعلیٰ درجہ کے ادیب اور شاعر

---

۱ غلام صمدانی گوہر "تزک محبوبیہ" جلد دوم، طبقہ امراء حیدرآباد ۱۳۱۹ھ ص ۱۳

تھے - آپ کے صرف ایک فرزند سید رحیم الدین حسین عرف شاہی بادشاہ تھے .

جناب اقبال کو شاعری کا شوق پندرہ سال کی عمر سے شروع ہوا - شاعری میں اپنے والد سے اصلاح سخن حاصل کرتے تھے - آپ کا کلام نہایت صاف ہے - ان کے کلام میں شوخی پائی جاتی ہے - نمونے کے طور پر غزل کے چند اشعار ذیل میں درج کئے جاتے ہیں :

دے کے جاں لعل لب یار کا بوسہ لیں گے :: اتنی قیمت پہ بھی سودا یہ مشکل ٹھہرا
باغ جنت میں بڑے لطف سے کٹ جائیگی :: اپنا معشوق جو وہ حور شمائل ٹھہرا

گھر مرے آیا نہ وہ مہر درخشاں ابتک :: نہ ہوا اختر طالع مرا تاباں ابتک
ہے مرے قتل سے انگشت بدنداں ابتک :: بال کھولے ہوئے قاتل ہے پریشاں ابتک

نہ کیا حج نہ زیارت ہوئی اقبال نصیب
نہ مہیا ہوا بغداد سامان ابتک [1]

---

۱ غلام صمدانی خاں گوہر "تزک محبوبیہ" جلد دوم طبقہ شعراء حیدرآباد ۱۳۱۹ھ ص ۱۵

عابد مرزا بیگمؔ

آپ کا نام عابد مرزا اور تخلص بیگم تھا۔ بیگم کی ولادت ۱۸۵۷ء میں لکھنؤ میں ہوئی۔ آپ کی تعلیم و تربیت اپنے والد کی نگرانی میں کلکتہ کے مٹیا برج میں ہوئی۔ بیگم کے والد حسین مرزا نواب واجد علی شاہ کی بیگم فخر محل بیگم صاحبہ کے صرف خاص میں ملازم تھے۔ بیگم تھے تو مرد مگر ان کا حلیہ چال ڈھال لباس وغیرہ زنانی ہوتا تھا، انھوں نے ریختی کہنے میں مہارت حاصل کر لی تھی اور سارے ہندوستان میں آپ کی شہرت ریختی شاعری کی وجہ سے ہونے لگی۔ بیگم اپنا کلام آغا حجو شرف سے اصلاح سخن حاصل کرتے تھے۔

۱۳۱۵ھ میں نواب لطف علی خاں کے بیٹے نواب ابراہیم علی خاں نے پٹنہ میں مشاعرہ تو بیگم کی ریختی کلام

کا شہرہ سن کر انہیں خاص طور سے مدعو کیا۔ جناب واجد علی شاہ کے انتقال کے بعد بیگم نے بھوپال کا قصد کیا اور پھر وہاں سے سیدھے حیدرآباد تشریف لائے۔ [1]

بیگم نے حیدرآباد آتے ہی جناب مہاراجہ کشن پرشاد کے دربار سے وابستہ ہو گئیں۔ کشن پرشاد کا دربار کسی بادشاہ کے دربار سے کم نہیں تھا۔

بیگم کا کلام ریختی کے باوجود گندگی سے پاک ادبی معیارات کی ترجمانی کرتا تھا۔ انہوں نے کبھی بھی اپنی ادبی اہمیت کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ ملاحظہ ہو دو شعر ؎

دیکھتی ہوں خواب دہشتناک جب سوتی ہوں میں
فال کھلوانے کہاں جاؤں کوئی عامل نہیں

ظلم کرتا ہے میرے اوپر جو ناحق بے دھڑک
او موئے سمجھا ہے تو شاید خدا عادل نہیں

---

[1] تسکین عابدی "سخنوران دکن" حیدرآباد ۱۹۳۸ء ص ۱۲۹

بیگم کی ایک اور غزل کے اشعار ملاحظہ ہوں جو ریختی میں اعلیٰ ترین نمونہ پیش کرتے ہیں۔

بن بھی پوچھے میکے جاؤں کیونکر؟ اطاعت فرض ہے مجھ پر میاں کی
مزے میں نے اڑائے زندگی کے؟ نگوڑی صورت ہی نے خاک چھانی
نہ بار ہی مانتا ہے تو نہ جیتی؟ موئے تجھ میں ہے ہٹ دھرمی کہاں کی [1]

پنڈت راگھو بیندر راؤ جذب عالم پوری

آپ کا نام راگھویندر راؤ تھا اور تخلص جذب۔ آپ کی پیدائش ۲۰ اپریل ۱۸۹۶ء کو تعلقہ گنگاوتی ضلع رائچور میں ہوئی۔ ضلع رائچور عہد محبوبیہ میں نظام اسٹیٹ میں شامل تھا۔ جناب جذب کے والد رام راؤ نوجوانی میں فوت ہو گئے جبکہ جذب صغر سنی ہی میں تھے [2]۔ جذب کی والدہ آپ کی پرورش کے قابل نہیں تھیں، اس لیے انھیں سیتا بائی نامی ایک برہمن عورت نے

---

[1] تسکین عابدی "سخنوران دکن" حیدرآباد ۱۹۳۱ء ص ۱۲۹
[2] حفیظ قتیل "راہرو اور کارواں" حیدرآباد ۱۹۵۵ء ص ۲۶

گود لے لیا۔ آپ متبنی ماں کی زیر پرورش رہ کر
زمانے کے دستور کے مطابق راجہ رام نرسو سے فارسی
کی تعلیم حاصل کی ۔ اردو میں ادیب کامل اور فارسی
میں منشی فاضل تک تعلیم پائی ۔ زیادہ وقت پنڈتوں
کی صحبت میں رہ کر سنسکرت بھی سیکھی ۔ ۱۳۳۲ف
میں امتحان جوڈیشیل کامیاب کیا اور عالم پور میں
وکالت شروع کردی ۔ کافی عرصہ تک عالم پور
میں وکالت کرتے رہے ۔ طبسد عثمانی میں حیدرآباد
آکر مستقل سکونت اختیار کرلی اور ہائی کورٹ میں
وکالت شروع کردی ۔ آپ کے ایک فرزند پرہلاد
راؤ اور ایک دختر تھی ۔ جذب نے تقریباً (۸۰) سال
تک زندہ رہ کر ۱۹۷۳ء (۲۸ ستمبر) کو وفات پائی [1]

جذب کو شاعری کا شوق بچپن سے تھا ۔
انہوں نے سب سے پہلے ۱۹۱۱ء میں شعر موزوں کر کے

---

[1] مصلح الدین خاں "جنوبی ہند کی رباعی گوئی" حیدرآباد ۔ ۱۹۸۹ء ص ۹۶

استاد شوکت میرٹھی سے اصلاح لینے لگے۔ بعد میں حضرت امجد سے رجوع ہو گئے۔ آپ کے کلام میں تمام اصناف سخن ملتے ہیں۔ جناب جذب نے ہندو ویدانت کا بہت گہرا مطالعہ کیا تھا اسی طرح تصوف اور ویدانت کی آمیزش سے رباعی موزوں کرتے تھے۔ جذب کی رباعیات کے تین مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ جذب کے کلام میں اخلاق کی سادگی اور وعظ و نصیحت کی متانت پائی جاتی ہے۔ وہ سنسکرت کے غیر فانی خیالات کو اردو میں نظم کرتے تھے۔ نمونہ کے طور پر چند اشعار ملاحظہ ہوں

کر جاتی ہے تاثیر بروں کی صحبت :: یعنی کہ بگڑ جاتی ہے اچھی خصلت

ملتے ہی سمندر میں وہ کھارا ہوگا :: گنگا کا وہ پانی جو ہے میٹھا شربت ۱؎

جناب جذب کے کلام کا پہلا مجموعہ "ارمغان جذب" کے نام سے ادارۂ ادبیات اردو سے شائع ہوا تھا۔ اس کے علاوہ دوسرا مجموعہ "رباعیات آہنگ" کے

۱؎ نصیر الدین ہاشمی "دکنی ہندو اور اردو" حیدرآباد ۱۹۵۶ء ص ۱۰۳

نام سے ڈاکٹر حسن الدین احمد نے ۱۹۷۰ء میں
جذب کی اجازت سے شائع کیا۔

جناب جذب نے اپنی مادری زبان کنڑی
سے دیگر زبانوں کا کامیاب تجربہ کیا تھا۔ آپ کا
غیر مطبوعہ کلام ان کے صاحبزادے کے پاس محفوظ ہے۔
جناب جذب نے عمر خیام کی فارسی رباعیات کا بھی
اردو ترجمہ کیا تھا۔ ایک ترجمہ ملاحظہ ہو:

آنکھوں میں جو اپنی راہگزر رکھتا ہے ٭ ہر شاہ گدا اسی پر نظر رکھتا ہے
جویان دریا غواصی اور گوہر خود ہے ٭ اس بات کی تہ کی وہ خبر رکھتا ہے [۱]

جناب تسکین عابدی "سخنوران دکن" میں رقمطراز ہیں کہ جذب
کی سو رباعیات کا مجموعہ "رباعیات جذب" کے نام سے
نظامی پریس لکھنؤ سے شائع ہو چکا ہے۔ اس دیوان میں
سے چند مشہور رباعیات ملاحظہ ہوں:

---

[۱] نصیر الدین ہاشمی "دکنی ہندو اور اردو" حیدرآباد ۱۹۵۸ء، ص ۱۰۳

اشراف سے کم ظرف نہ پیدا ہوگا ؛ ایسا ہو جو ہیچ عمل بھی کھا ہوگا
کیا کہتے ہو اے جذب یہ انوکھی بات ؛ معدن میں گہر کے ساتھ تو شیشہ ہوگا

—

اس میں نہ پھنسو کیونکہ ہے دنیا دلدل ؛ اور اتنے نہ بھاگو کہ بسا دو جنگل
سب میں رہو اور سب سے جدا تم اے جذب ؛ مرشد نے کہا ہے یہ معمہ یوں حل ہے

جلیل حسن جلیل مانک پوری

آپ کا نام جلیل حسن اور تخلص جلیل تھا ۔ آپ کی ولادت ۱۲۸۳ھ م ۱۸۶۷ء میں مانکپور (یوپی) میں ہوئی ۔[1] اپنے والد حافظ عبدالکریم سے عربی و فارسی کا درس لیا ۔ بارہ سال کی عمر میں جلیل حافظ قرآن ہوگئے پھر علوم متداولہ کی تکمیل کے لیے لکھنؤ گئے اور وہاں علمائے فرنگی محل سے مکمل استفادہ کیا ۔ بعد تحصیل و تکمیل علم مانکپور واپس آگئے ۔

۱؎ تسکین عابدی "سخنوران دکن" حیدرآباد ۱۳۵۷ھ ص ۱۵۸

حضرت جلیل طالب علمی ہی کے زمانے سے شعر موزوں کرنے لگے تھے۔ مانکپور میں شاعری کی فضاء موجود تھی۔ ابتدائی مشق سخن کے بعد ہی مشاعروں میں شرکت کرنے لگے۔ لبعدازاں ذوق سخن کو پروان چڑھانے کے لیے امیر مینائی کے حلقۂ تلامذہ میں داخل ہو گئے۔ جناب امیر اس وقت رامپور میں تھے اور والی رامپور کے دربار سے وابستہ تھے۔ ابتداءً خط وکتابت کے ذریعہ اصلاح لی۔ کچھ عرصہ بعد جب رام پور میں امیر مینائی کی نگرانی میں "امیراللغات" کا دفتر قائم ہوا تو جناب امیر کی نظر شناس نے جلیل کو مانک پور سے رام پور طلب کیا۔ رام پور پہنچ کر جناب جلیل دفتر امیراللغات کے معتمد بنا دیے گئے۔[1]

اس وقت رام پور میں نواب حامد علی خاں فرماں روا تھے اور ان کی قدر دانی کے سبب ریاست

---

[1] علی احمد جلیلی ڈاکٹر وضاحت جنگ جلیل مقالہ پی ایچ ڈی حیدرآباد ۱۹۹۱ء ص ۹۷

رام پور دہلی اور لکھنؤ کے شعراء کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ یہاں استادانِ کامل کی صحبت میں جلیل کے جوہرِ شاعری نے خوب جلا پائی ۔ یہاں تک کہ ہمعصروں کی نگاہیں ان کی طرف اٹھنے لگیں کچھ عرصہ بعد مالی دشواریوں کے سبب امیر اللغات کا کام بند ہو گیا تو امیر مینائی نے دکن کا سفر اختیار کیا - ۱۰ر جمادی الاول سنہ ۱۳۱۸ھ م ۵ر اگست سنہ ۱۹۰۰ء کو حیدرآباد پہنچے - ان کے ہمراہ ان کے شاگرد رشید جلیل بھی تھے - جناب داغ نے امیر مینائی کی مہمان نوازی کی لیکن حیدرآباد پہنچتے ہی امیر ایسے بیمار ہوئے کہ ایک ماہ کے اندر وفات پا گئے۔ جلیل بے سروسامان ہو گئے لیکن قسمت آزمائی کے خیال سے وطن واپس نہیں گئے ۔ اس عالم غربت میں سرکشن پرشاد شاد نے جلیل کی سرپرستی کی سنہ ۱۹۰۵ء میں مرزا داغ کا بھی انتقال ہو گیا ۔ اس وقت تک جلیل مانکپوری کو جانشینِ امیر تسلیم کیا جا چکا تھا اور یہاں کے مشاعروں میں شریک ہو کر جلیل نے اپنی شناخت بنالی تھی چنانچہ شاہ آصف

سادس نے سینکڑوں اساتذۂ سخن کی موجودگی میں اپنے کلام پر اصلاح کے لیے جلیل کا انتخاب کیا اور مرزا داغ کی جگہ وہ استاد شاہ بن گئے۔ جلیل القدر القاب سے نوازے گئے۔ شاہ آصف کے انتقال کے بعد میر عثمان علی خاں تخت نشین ہوئے تو انہوں نے مشورۂ سخن کے لیے حضرت جلیل کو دربار شاہی سے وابستہ کرلیا۔ فصاحت جنگ اور امام الفن کے خطابات سے نوازے گئے۔[1]

جناب جلیل یکم صفر ۱۳۶۵ھ ۲۵ جنوری ۱۹۴۶ء کو ۸۲ سال کی عمر میں انتقال فرما گئے۔ سرکاری اعزازات کے ساتھ خطۂ صالحین میں ان کی تدفین ہوئی۔

استاد جلیل کثیر الاولاد تھے ان میں صدیق احمد اثر رئیس احمد کلیم، مونس احمد مونس، عزیز احمد جلیلی اور علی احمد جلیلی نے شاعری کی روایت کو قائم رکھا بالخصوص ڈاکٹر علی احمد جلیلی نے والد کے نام کو روشن کرنے میں بڑا اہم حصہ ادا کیا ہے۔

---

[1] ڈاکٹر علی احمد جلیلی مقالہ "فصاحت جنگ جلیل" ۱۹۹۱ء ص ۲۰۰

جلیل مانکپوری اس سلسلے کی آخری یادگار تھے جو میر و مرزا سے شروع ہوا تھا۔ ان کا تعلق لکھنؤ اسکول سے تھا۔ وہ خالص لکھنوی شاعر تھے تاہم انہوں نے اپنی ذات اور اپنی شاعری میں انیسویں صدی کے نصف آخر کے دونوں مکاتیب کی خصوصیات یکجا کرلی تھیں وہ قدیم سلسلۂ تلمذ کے تمام اور لکھنوی شاعری کی آخری یادگار تھے۔ جس طرز سخن کو انہوں نے رواج دیا وہ جرات و مصحفی کا ہے۔ جلیل کے کلام میں وہ خارجیت نکھرتی ہے جس کی جھلک مصحفی کی شاعری میں ملتی ہے جیسا کہ وہ خود فرماتے ہیں ؎

اس سخن کا جلیل کیا کہنا
مصحفی کی زبان ہے گویا

جناب جلیل کے پاس روایت کا کتنا التزام تھا اور اس روایت میں رہ کر استادی کی جو منزلیں انہوں نے طے کیں اس کا جواب ایک تو ان کی مقبولیت و شہرت ہے دوسرے ان کا وہ سارا کلام ہے۔ جو اس فنکارانہ پختگی کا احساس دلاتا

ہے۔ انہوں نے غزل میں حیات و کائنات کی گتھیاں
نہیں سلجھائیں بلکہ ان گتھیوں میں الجھنے والوں کو ایک
لطف ومسرت سماوی رقص کی دعوت دی۔ یہی ان کا
آرٹ ہے۔ انہوں نے شدت جذبات پر لطافت جذبات
کو ترجیح دی چنانچہ ان کی شاعری کا سرمایہ یہی نفاست
و لطافت ہے۔ جلیل کی شاعری پر شمس الرحمٰن فاروقی
یوں رقمطراز ہیں۔

"جناب جلیل مانکپوری پرانے استادوں کی
آخری یادگار تھے۔ قادر الکلامی کے ساتھ
شگفتگی طرزِ ادا اور مضمون آفرینی ان کے
کلام کے خاص صفات ہیں"

پروفیسر ثریا حسین (علی گڑھ) حضرت جلیل کی شاعری
پر لکھتی ہیں۔

"جلیل نے مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی
ہے مگر غزل کو بنیادی اہمیت حاصل ہے غزل

غزل کا رنگ و مزاج لکھنوی ہے جس میں
نشاط و حسن پرستی اور موسیقیت کے عناصر
غالب ہیں ۔ [1]

جلیل کی تصانیف و تالیفات کا مختصر جائزہ ۔

شاعری : غزلوں کے دیوان "تاج سخن" "جان سخن" "روح سخن"
نعتوں کا مجموعہ : "معراج سخن" مدحیہ قصاید و قطعات :
سرتاج سخن ، تاریخی قطعات
کا مجموعہ :

نثر : سوانح امیر مینائی ۔ تذکیر و تانیث ۔ معیار اردو
اردو کا عروض ۔ مکاتیب جلیل

استاد جلیل کی مختلف غزلوں سے چند اشعار درج کئے جاتے
ہیں جو زبان زد ہیں :

نگاہ برق نہیں چہرہ آفتاب نہیں ؎ وہ آدمی ہے مگر دیکھنے کی تاب نہیں
اس شان سے وہ آج پئے امتحاں چلے ؎ فتنوں نے پاؤں چوم کے پوچھا کہاں چلے
جب میں چلوں تو سایہ بھی اپنا نہ ساتھ دے ؎ جب تم چلو زمین چلے آسماں چلے

---

[1] پروفیسر ثریا حسین "جلیل کی غزل گوئی" مشمولہ "حیدرآباد میں بیرونی شعراء"
۱۹۸۹ء ص ۱۷

دیکھا جو حسن یار طبیعت مچل گئی ؛ آنکھوں کا تھا قصور چھری دل پہ چل گئی

ہم تم ملے نہ تھے تو جدائی کا تھا ملال ؛ اب یہ ملال ہے کہ تمنا نکل گئی

پینے سے کر چکا تھا میں توبہ مگر جلیل ؛ بادل کا رنگ دیکھ کے نیت بدل گئی

بات ساقی کی نہ ٹالی جائے گی ؛ کر کے توبہ توڑ ڈالی جائے گی

آتے آتے آئے گا ان کو خیال ؛ جاتے جاتے بے خیالی جائے گی

جاتے ہو خدا حافظ ہاں اتنی گزارش ہے ؛ جب یاد ہم آ جائیں ملنے کی دعا کرنا

درد سے واقف نہ تھے غم سے شناسائی نہ تھی ؛ ہائے کیا دن تھے طبیعت جب کہیں آئی نہ تھی

محبت رنگ دے جاتی ہے جب دل دل سے ملتا ہے

مگر مشکل تو یہ ہے دل بڑی مشکل سے ملتا ہے

عہد شباب چشم زدن میں گزر گیا ؛ جھونکا ہوا کا تھا ادھر آیا ادھر گیا

حسن دیکھا جو بتوں کا تو خدا یاد آیا ؛ راہ کعبے کی ملی ہے مجھے بت خانے میں

تم نے جو اپنے رخ سے پردہ اٹھا دیا ہے

تارے فلک پہ ماہ کامل کو ڈھونڈتے ہیں

دکان مے پہ پہنچ کر کھلی حقیقت حال

خراب بیچ رہا تھا وہ مے فروش نہ تھا

جلیل اچھا نہیں آباد کرنا گھر محبت کا

یہ ان کا کام ہے جو زندگی برباد کرتے ہیں

سید منتخب الدین تجلی

آپ کا نام سید منتخب الدین اور تجلی تخلص تھا۔ آپ کی ولادت ۱۲۹۲ھ م ۱۸۸۳ء میں بمقام حیدرآباد ہوئی۔ آپ کے دادا نواب سید یار جنگ بہادر بخارا سے حیدرآباد دکن تشریف لائے۔ جناب تجلی اپنے والد کے انتقال کے تیسرے روز پیدا ہوئے [1] تجلی کی والدہ نے انھیں منحوس سمجھ کر اپنی آغوش سے دور کر دیا۔ تجلی کی خالہ نے اپنے گھر لے جا کر تجلی کی پرورش کی۔ آہستہ آہستہ ماں کی ممتا پکار اٹھی۔ تجلی کو اپنی خالہ کے گھر سے واپس بلالیا گیا۔ بہت لاڑ پیار سے ان کی بسم اللہ کی گئی۔ بعدازاں مدرسہ اعزہ میں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ پھر دارالعلوم حیدرآباد میں شریک ہو گئے۔ تعلیم حاصل کرنے کے بعد تجلی نے نوجوانی میں حضرت آغا داؤد صاحب قبلہ کے ہاتھ پر بیعت حاصل کی۔ ابتداً میں تجلی صوبہ گلبرگہ میں صیغہ دار ہوئے پھر ضلع رائچور کے خزانہ دار (افسر) ہو گئے۔ نوجوانی میں تجلی نے طب کا امتحان بھی کامیاب کیا تھا۔ تجلی تجربہ قطعاً نہ تھا۔

تجلی کی نشو و نما حیدرآباد میں ہوئی۔ ۱۹۰۸ء تک وہ حیدرآباد دکن میں تھے۔ اس زمانے میں علمی و ادبی سرگرمی

---

[1] تمکین کاظمی، مضمون مشمولہ رسالہ نقوش پاکستان ۱۹۵۶ء ص ۱۲۸۸

میں خاصہ رسوخ رکھتے تھے۔ جناب تجلی کی شادی
سید عبدالرحیم اول تعلقدار کی صاحبزادی سے ہوئی۔ جناب
تجلی کثیر العیال تھے۔ انھیں دس لڑکے لڑکیاں تولد
ہوئیں لیکن بجز تین کے سب بچپن میں فوت ہو گئے۔
آپ کے بڑے لڑکے جناب سید مصباح الدین کاظمی
(قلمی نام تمکین کاظمی) مشہور ادیب و شاعر ہیں۔
دوسرے سید رفیع الدین کاظمی تیسرے سید رشید الدین
کاظمی تھے۔ تمکین کاظمی خود اپنے والد کی شخصیت اور
مزاج کے بارے میں رسالہ نقوش لاہور میں رقمطراز ہیں:

"والد صاحب کچے کان کے تھے۔ ہر ایک کی
بات کا یقین کر لیتے۔ فوراً بگڑ جاتے اور جلد
ہی من بھی جاتے۔ قلبی کیفیت اچھی تھی۔ مذہبی
آدمی تھے اس لیے مجاذیب اور مزارات کے
بڑے معتقد تھے۔ جو مجذوب مل جاتا اسے پکڑ
کر گھر لاتے، کھلاتے پلاتے، کپڑے بناتے اور
نذر دے کر رخصت کرتے تھے۔"[1]

---

[1] تمکین کاظمی: مضمون مشمولہ رسالہ نقوش لاہور۔ سنہ ۱۹۵۶ء ص ۴۸۹

تجلّی بزرگان دین سے بڑی عقیدت رکھتے تھے

ان کی ملازمت گلبرگہ میں تھی۔ اسی مناسبت سے حضرت

خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ سے بڑی عقیدت تھی۔ ان کے

گھر میں فاتحہ، نیاز، نذر بہت اہتمام سے ہوتی تھی۔ تمکین کاظمی

اس عقیدہ سے متفق نہ تھے۔ اس بنا پر تجلّی اپنے ہونہار

فرزند تمکین کاظمی سے خفا رہتے تھے۔ جب تجلّی اپنی عمر کی

آخری منزلیں طے کر رہے تھے۔ انھیں تمکین کاظمی نے

حیدرآباد لانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ اس پر تجلّی نے فرمایا

مجھے اس شرط پر حیدرآباد لے چلو۔ میں مرنے والا ہوں

وعدہ کرو کہ میری نعش گلبرگہ لاکر خواجہ صاحبؒ کے پائیں

میں دفناؤ گے۔ [1] اگر یہ شرط منظور ہو تو لے چلو ورنہ

انتظار کرو چنانچہ وہیں ۹ مہر ۱۳۳۶ف ۱۹۲۷ء (۱۹ اگست)

گلبرگہ میں انتقال کیا اور خواجہ صاحبؒ کے پائیں آسودہ

خاک ہو گئے۔

تجلّی شاعری میں داغ سے اصلاح لیتے تھے۔ جب

---

[1] تسکین عابد "سخنوران دکن" حیدرآباد ص ۱۳۵

داغ کا انتقال ہوگیا تو پھر کسی سے اصلاح لینا مناسب نہیں سمجھا۔ تجلی حیدرآباد میں "طبرمطوجیہ" کی علمی و ادبی محفلوں کے روح رواں تھے۔ ان کے ہمعصر شعراء میں ملام حسن داد، عبدالحی نازغ، رضی الدین کیفی، نادر علی برتر، قطب الدین تسلی، پاشا محی الدین وحودی، قہر علی خاں ناظم وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ؎۱

تجلی ملازمت ملنے پر گلبرگہ منتقل ہوگئے، مگر ان کی علمی سرگرمیوں میں فرق نہیں آیا۔ تجلی اعلیٰ درجہ کے خوش نویس بھی تھے اور فنون لطیفہ سے بھی شغف رکھتے تھے۔ ان کی شاعری کے چار دیوان مکمل تھے مگر زیور طبع سے آراستہ نہیں ہوئے۔ تجلی اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر موزوں فرماتے تھے۔ تمکین کاظمی نے اپنی زندگی میں والد کے چار دواوین کو یکجا کیا اور طباعت کے لئے ابوالعلائی پریس، آگرہ سے معاملہ طے کیا۔

؎۱ تسکین عابدی۔ "سخنوران دکن" حیدرآباد ۱۳۲۸ھ ص ۱۳۵

مسودہ اور ڈھائی سو روپیہ بھجوایا مگر شائع نہ ہو سکا۔ مطبع برخاست ہو گیا۔ نہ جانے مسودہ کہاں ہے۔[1] تجلی کی شاعری عشق و عاشقی سے نابلد تھی۔ مولوی آدمی تھے مشق بھی جاری نہ رکھتے۔ جی چاہتا تو روز دو دو غزلیں کہتے ورنہ مہینوں شعر کہنے کی نوبت نہ آتی۔ نہ اس موضوع پر بات کرتے۔ ان کی شاعری کا طریقہ نرالا تھا۔ پہلے قافیہ پیمائی کرتے، ان کو مصرعوں میں موزوں کرتے پھر مصرعے بہم پہنچاتے۔ اس طرح کی غزلوں میں آورد ہوتی آمد ندارد ایک آدھ شعر صاف نکلتا اور بس سارا دیوان ایسا ہی تھا۔ زندگی کے آخری ایام میں نعت کہنے لگے تھے۔

ملاحظہ ہو:

اب نہیں سوا تیرے کوئی بھی خدا اپنا ؛ آشنا وہ فرعون کا ہو گیا جو تھا ایسا

تجلی کی غزل کے اشعار بھی ملاحظہ ہوں جن میں انہوں نے تخلص استعمال کیا ہے ؎

لگا نا آگ دل کو دفن کر دینا تجلی تم ؛ نہ کرنا دل لگی پیدا کسی نا اہل انساں سے

قیامت میں جمال حق بھی ہے دیدار حضرت بھی ؛ کہ دیکھوں ابھی سے میرے دامان دل ذوق صحبت سے تجلی

عدو سے بزم میں انگشتیاں تجلی دیکھی نہیں جاتیں ؛ تمہارے گھر سے ہم اشکوں سے منہ دھو کر نکلے ہیں[2]

---

[1] تمکین کاظمی مضمون مشمولہ رسالہ نقوش لاہور ۱۹۵۶ء ص ۱۲۹۰

[2] تسکین عابدی "سخنوران دکن" حیدرآباد ۱۳۵۷ھ ص ۱۳۷

سید کاظم علی باغ

سید کاظم علی نام تخلص باغ تھا۔ تاریخ ولادت کا علم نہیں۔ سلیمان اریب اپنی تصنیف "حیدرآباد شاعر" میں رقمطراز ہیں:

"باغ کا انتقال ۱۹۴۲ء میں ہوا اور لگ بھگ ۸۰ برس عمر پائی" [1]

اس سے یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ باغ کی ولادت تقریباً ۱۸۶۲ء کے آس پاس ہوئی ہوگی۔ آپ کے والد علی گڑھ کے رہنے والے تھے اور جدِ اعلیٰ سبزہ زار سندھ سے آکر ہندوستان اکبرآباد کے ہو گئے۔ باغ کی ابتدائی زندگی آگرہ، جونپور اور رامپور میں گذری۔ شمالی ہند کی غدر کی بربادی کے بعد ریاست حیدرآباد ایک ایسی خوش حال مملکت تھی جس میں دولت کی فراوانی اور خود بادشاہ وقت شاعر اور شاعری کا قدردان تھا۔ اس لیے ہر طرف سے شاعر ادیب انشاء پرداز جوق در جوق "عہد محبوبیہ" میں دکن کی طرف کوچ کر گئے۔ باغ بھی تلاش معاش میں حیدرآباد کی راہ پر گامزن ہو گئے اور یہاں گتہ داری کا کام شروع کر دیا۔ زندگی کے آخری ایام بہت خوش حالی سے گزرے

[1] سلیمان اریب "حیدرآباد کے شاعر" ۱۹۶۲ء ص ۳۲

ان کا مکان جام باغ اندروں حیدرگھاٹ میں تھا۔ آپ کے خاندان کی دیگر تفصیلات آپ کے پوتے صاحب نظر حیدرآبادی سے دستیاب ہوئیں۔

باغ کو شاعری کا شوق بچپن سے تھا۔ داغ کے ممتاز شاگردوں میں شمار تھا۔ ان کے کلام میں ہر صنفِ سخن ملتی ہے۔ باغ کے گھر ۱۹۲۲ء سے ۱۹۲۸ء تک ہر ماہ پابندی سے مشاعرہ منعقد ہوتا تھا اور اس مشاعرے میں پڑھے جانے والے کلام کو انہوں نے رسالہ ماہوار "تاج" میں شائع کرواتے تھے۔ باغ اپنے استاد داغ دہلوی کے رنگ میں شعر کہتے تھے۔ ان کی غزلیات کا دیوان زیورِ طبع سے آراستہ نہیں ہوا۔

دنیا کی خواہشوں نے مجھے خوار کر دیا
اس زندگی نے زیست سے بیزار کر دیا
تیری نگاہِ ناز عجب کام کر گئی
احساس من کے روح کو بیدار کر دیا
کیوں کر نکلیں گی کوچۂ گیسو کی منزلیں
اللہ کس بلا میں گرفتار کر دیا

ناصح تیرے سبب سے ہوئی ترک مئے کشی
توبہ کرا کے اور گنہگار کر دیا
اے باغ وصف ابروئے خمدار نے
مقطع کو میرے مطلع انوار کر دیا [1]

دیگر غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ۔

وہ عذاب ہے وہ عذاب ہے اسی التفات کا نام ہے
وہ شباب تھا وہ شباب تھا جو بہار بن کے گزر گیا
کہیں طور کی تھی تجلیاں کہیں حسن نور کی بجلیاں
شب غم تصور یار میں میں کہاں کہاں سے گزر گیا
تیرے ناز میں جو نیاز ہے وہ نیاز حسن کا راز ہے
یہ نگاہ شرم سے جھک گئی تیرا رنگ اور نکھر گیا
نہیں تجھ سے مجھ سے مناسبت میں زوال ہوں تو عروج ہے
میں وہ حال ہوں جو بگڑ چکا تو وہ حسن ہے جو سنور گیا
کبھی پاس آ کے مٹا گئی تو امید آ کے جلا گئی
تیری عمر باغ یوں ہی کٹی کبھی جی اٹھا کبھی مر گیا [2]

---

[1] سلیمان اریب "حیدرآباد کے شاعر" حیدرآباد سنہ ۱۹۶۲ء ص ۳۴

[2] تسکین عابدی "سخنوران دکن" حیدرآباد سنہ ۱۳۵۸ھ ص ۱۱

ترک علی شاہ ترکی

نام ترک علی شاہ تخلص ترکی تھا۔ ۱۲۷۳ھ میں لاہور میں پیدا ہوئے۔ آپ کے جدِ اعلیٰ نادر شاہ کے ساتھ ہجرت سے لاہور آ گئے۔ ترکی حضرت غوث علی شاہ پانی پتی سے بیعت تھے۔ اس لیے اپنے نام کے ساتھ قلندر لکھا کرتے تھے۔ ابتدائی تعلیم مذہبی ماحول میں ہوئی۔ زندگی کا زیادہ حصہ تقریباً (۶۰) سال لاہور میں گزارا۔ بعد میں حیدرآباد آئے اور یہاں (۳۵) سال زندہ رہ کر پچانوے سال کی عمر میں ۱۳۳۷ھ م ۱۳۲۸ف میں انتقال کیا۔ آپ کی صاحبزادی بسم اللہ بیگم عصمت بھی مشہور شاعرہ گزری ہیں۔ اپنے والد سے اصلاحِ سخن حاصل کرتی تھیں [1]

ترکی کو شاعری کا شوق نوجوانی سے تھا۔ شروع میں امام بخش ناسخ، صہبائی دہلوی سے اصلاح حاصل کرتے رہے بعد میں اپنا ریختی کلام سید علی اوسط رشک کو دکھایا۔ ضرورت سے زیادہ زندہ دل یار باش بزرگ تھے۔ فارسی شاعری میں استادی کا درجہ رکھتے تھے۔ آپ کئی صاحب

---

[1] نصیر الدین ہاشمی، خواتینِ دکن کی اردو خدمات ۱۲۵۹ھ ص ۵۰

متابع ہو چکی ہیں۔ جس میں دیوان "سرمایۂ پیری" "گلبانگ ترکی" تذکرۂ سخنوران چشم دید تو قابل ذکر ہیں۔ [1]

ترکی کے شاگردوں کی فہرست طویل ہے۔ قابل ذکر ناموں میں تجلی، ناظم، شائق، امجد وغیرہ آپ کو اپنا فارسی کلام بغرض اصلاح دکھاتے تھے۔ ترکی مہاراجہ کشن پرشاد شاد کے دربار میں متوسل تھے۔ نمونہ کے طور پر ان کے اردو دیوان سے چند شعر درج کئے جاتے ہیں ؎

بدلی نہ شب وصل میں حالت مرے دل کی ؛ نکلی نہ سحر تک کوئی حسرت مرے دل کی
سن لیتے ہیں جس شب وہ حکایت مرے دل کی ؛ دھو دیتے ہیں اشکوں سے کدورت مرے دل کی
کب زیست میں جائے گی ملامت مرے دل کی ؛ نکلے گی نہ اب خاک ہی حسرت مرے دل کی [2]

رباعی: پیری میں ہوئی فکر عقبیٰ مجھکو ؛ دولت کی نہیں ہے اب تمنا مجھکو
جس دن سے ہوا ہوں میں قلندر ترکی ؛ بھاتی ہی نہیں عروس دنیا مجھکو

ترکی نے ہر صنف میں طبع آزمائی کی ہے۔ خود اپنے فارسی کلام کے تعلق سے اردو میں یہ لکھی ہے ؎ چار شعر ہیں جو کہ کل موزوں ہیچ ؛ پھول جیسے ہیں اگر یاں کا کتنا ہیچ
اور یہ کچھ نہیں تو دعوے کی کرچن ہیچ ؛ شاعری سے ہم کو کیا کام ہے دم فن ہیچ
فن یہ مشکل ہے اسے چھوڑ کے صاحب ہیچ

---

[1] تسکین عابدی "سخنوران دکن" حیدرآباد ۱۳۵۷ھ ص ۱۳۸
[2] ترکی علی شاہ "دیوان سرمایہ حیات" حیدرآباد ۱۳۳۲ھ ص ۲۳۶
[3] ایضاً ص ۲۸۵

سید جلال الدین توفیق

نام سید جلال الدین تخلص توفیق۔ ۱۲۸۱ھ میں اپنے
نانا سید ابراہیم کے مکان میں تولد ہوئے جو سکندرآباد میں
میں قیام پذیر تھے۔ توفیق کی ابتدائی تعلیم سید محمود افسوس
کے مکتب واقع کاچیگوڑہ میں ہوئی۔ پانچ سال کی عمر میں عربی و
فارسی کی کتابوں کا مطالعہ شروع کیا مولانا احمد سیالکوٹی
سے عربی اور مولانا منور میاں سے فرقۂ مہدویت کی تعلیم
حاصل کی کیونکہ آپ فرقۂ مہدویت سے تعلق رکھتے تھے۔
ملازمت کی ابتداء محکمۂ انکم ٹیکس سے کی۔ اس کے بعد
محکمۂ صدر محاسبی میں منتقل ہو گئے اور اسی محکمہ سے وظیفہ
حاصل کیا۔ توفیق پاکیزہ زندگی کے حامل تھے۔ صوم و صلوٰۃ
کے پابند اور دین اسلام کے سچے پیرو تھے۔ مذہبی شعائر کے
فریفتہ، وضع دار، نیک اطوار، حلیم الطبع، خوش اخلاق اور
آزاد مشرب برگزیدہ شخصیت کے حامل تھے[1]۔ انہوں نے
اپنی ساری زندگی رشد و ہدایت میں گزاری۔ طبیعت میں
انانیت و نخوت نام کو نہیں تھی۔ جس محفل میں تشریف

---

[1] عبدالقادر سروری "مرقع سخن" جلد اول مرتبہ ڈاکٹر زور
حیدرآباد ۱۹۳۵ء ص ۲۶۷

لاتے شمع فعل بن جاتے۔ سرکاری کام کاج کرنے کے بعد تصنیف و تالیف، شعر و شاعری و کتب کے مطالعہ میں وقت گزارتے۔ فن خطاطی کے ماہر تھے۔ تاریخ وفات "توفیق اہل بہشت" سے برآمد ہوتی ہے۔ جس کے اعداد جمع کرنے پر ۱۳۳۵ھ برآمد ہوتا ہے۔

حضرت توفیق کو شعر و شاعری کا بچپن سے ذوق تھا۔ انہوں نے ۱۷ برس کی عمر میں اپنا تخلص توفیق رکھا۔ اور اپنے والد تصدیق سے اصلاح سخن حاصل کرنے لگے۔ حضرت توفیق شاعری میں اپنے عہد کے غالب دکنی کہلاتے تھے۔ سید اشرف شمسی دیوان توفیق میں رقمطراز ہیں:

"مولانا توفیق کی لیاقت نہایت اچھی تھی اور چونکہ ان کے والد بزرگوار کو شعر و سخن سے دلچسپی تھی اور شعرائے بلدہ میں تحقیق کے اعتبار سے ممتاز سمجھے جاتے تھے۔ رات دن ان کے مکان میں شعراء کا مجمع اور شعر و سخن کا چرچا رہتا تھا" [1]

---

[1] مولانا سید اشرف شمسی۔ دیباچہ "دیوان توفیق" بار اول۔ حیدرآباد

حضرت توفیق نے شاعری اس وقت شروع کی جب حیدرآباد
میں حضرت فیض اور ان کے تلامذہ کا چرچا دور دور تک تھا
مگر توفیق اس دبستان فیض سے متاثر نہیں ہوئے۔ ان کی
اپنی انانیت نے انھیں مومن اور غالب کے کلام کی طرف
مائل کر دیا۔ اس لیے توفیق کے کلام میں غالب کا رنگ
جھلکتا ہے۔ حضرت توفیق کے کلام میں تصوف کا عنصر
بھی ملتا ہے۔

شاعری کے علاوہ حضرت توفیق کے چند نثری کار
نامے بھی ملتے ہیں جیسے:
(۱) تذکرۂ شعرا (۲) کلیات طبیعات (۳) الحقائق
(۴) السلوک (۵) رسالہ علم عروض (۶) ڈرامہ اردو
آپ کے فرزند سید امیر الدین توصیف نے "فانوس خیال"
کے نام سے آپ کے تمام کلام کو جمع کر کے ۱۹۳۶ء میں
شائع کیا۔ "فانوس خیال" میں غزلوں کے علاوہ دیگر
تمام اصناف سخن بھی ملتے ہیں۔ تصوف سے متعلق شعر

درج کیا جاتا ہے؎

یہ کہاں کے جلوے سما گئے یہ کہاں کی حیرتیں چھا گئیں
کہ ہزاروں آئینے لگ گئے ہیں سنگاہ آئینہ ساز میں

حضرت توفیق کی شاعری میں صوفی ازم کے نمونے بھی ملتے ہیں؎
جا رنگ ہوس فزوں تاثیر ملے بن جا آئینۂ دل یار کی تصویر ملے[1]

حضرت توفیق کی ایک مشہور غزل درج ذیل کی جاتی ہے؎
اس نے کہا ہستی تری میں نے کہا جلوہ ترا
اس نے کہا نیت تری میں نے کہا سودا ترا
اس نے کہا جا نامراد میں نے کہا میری اجل
اس نے کہا پھر زندگی میں نے کہا آنا ترا
اس نے کہا شام بلا میں نے کہا گیسو ترے
اس نے کہا صبح صفا میں نے کہا چہرا ترا
اس نے کہا شب کون تھا میں نے کہا توفیق تھا
اس نے کہا وہ کون تھا میں نے کہا شیدا ترا[2]

---

[1] امتہ السلام عاملہ "آصفجاہی عہد کے صوفی شعراء" مقالہ ایم فل حیدرآباد ص ۳۳۱

[2] جلال الدین توفیق "فانوس خیال" حیدرآباد ص ۱۱۶

حضرت توفیق کے کلام میں مثلث، مخمس، مسدس، رباعی قصیدہ اور قطعات بھی ملتے ہیں۔ ایک قطعہ ملاحظہ ہو ؎

ایک وہ بھی ہیں کہ ساقی کی بدولت سر پر
سارا میخانہ کا میخانہ لئے پھرتے ہیں
ایک ہم بھی ہیں خالی صفتِ دل توفیق
مے کی امید میں پیمانہ لئے پھرتے ہیں

مثلث :

بربادیوں کو میری ٹھکانے لگا دیا ؛ منظور خاک میں تھا ملانا ملا دیا
لکھ کر زمیں پہ نام کو میرے مٹا دیا

ابھرے نہ تھے کہ دیدۂ تر نے ڈبو دیا ؛ نہ پائے تھے کہ تمنا کو کھو دیا
شعلہ اٹھا نہ تھا کہ ہوا نے بجھا دیا

جناب سید موسیٰ کاظم نے عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں "توفیق حیدرآبادی حیات اور خدمات" پر ایم۔ اے کے لیے مقالہ سپرد کیا اور شائع بھی کیا ۔

سید محمد کاظم حبیب کنتوری

سید محمد کاظم نام اور تخلص حبیب تھا۔ کنتور ایک موضع تھا جو ضلع بارہ بنکی میں موجود ہے۔ آپ اسی موضع کی نسبت سے حبیب کنتوری سے مشہور و مقبول ہوئے۔ ۱۲ ذی الحجہ ۱۲۶۷ھ کو کنتور میں آپ کی ولادت ہوئی۔ بچپن میں اردو عربی اور فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ آپ کے جد اعلیٰ کا سلسلۂ نسب حضرت عباسؓ سے ملتا ہے اور حضرت سید امام موسیٰ کاظمؑ تک یہ نسبت پہنچتی ہے۔ حبیب ملازمت کی تلاش میں حیدرآباد میں آئے اور محکمۂ پولیس میں منشی کی نوکری پر فائز ہو گئے اور اسی محکمہ سے وظیفہ پر علیحدہ ہوئے۔ حبیب کنتوری کے دو فرزند تھے ایک سید محمد عباس کنتوری اور سید محمد مظفر کنتوری۔ [1]
حبیب کنتوری کو شاعری کا شوق بچپن ہی سے تھا۔ انہوں نے حضرت محمد کاظم سے اصلاح سخن حاصل کی۔ آپ کے کئی تصانیف مشہور و مقبول ہوئے۔ آپ کا ایک قلمی دیوان

---

[1] غلام صمدانی خاں گوہر "تزک محبوبیہ" جلد دوم دفتر ہفتم حیدرآباد ۱۳۱۹ھ ص ۵۱

کتب خانۂ آصفیہ میں موجود ہے۔ نمونے کے طور پر غزل کے چند شعر ملاحظہ ہوں ۔

حسن جب صورت گر ذوق خود آرائی ہوا
ہر بت بے باک گرم لاف یکتائی ہوا
دیکھ کر آئینۂ وحدت میں کثرت کا جمال
محشرستان بتاں کنج تنہائی ہوا

—

سر ہے جب تک ترے سودائی کا
شور کم ہوگا نہ رسوائی کا
کھینچنا اس کی خیالی تصویر
شغل ہے مری تنہائی کا

حضرت محمد عبدالقدیر صاحب صدیقی حسرت

نام محمد عبدالقدیر صدیقی تھا اور تخلص حسرت فرماتے تھے۔ آپ کے والد بزرگوار صلابت شاہ احمد نگر گجرات سے دکن تشریف لائے۔ دکن میں ارشاد و ہدایت کا درس دیتے رہے اور مملکت آصفیہ میں ملازمت اختیار کرلی۔ حسرت ۲۷ رجب المرجب ۱۲۸۸ھ بروز جمعہ [illegible] تولد ہوئے۔[1] آپ کا سلسلہ نسب اٹھائیس ۲۸ واسطوں سے حضرت سیدنا ابوبکر صدیق رضؓ سے جا ملتا ہے۔ آپ کی تعلیم دارالعلوم حیدرآباد میں ہوئی۔ پنجاب یونیورسٹی سے مولوی فاضل اور منشی فاضل کا امتحان کامیاب کیا۔ اس کے علاوہ منطق، فلسفہ، عربی، اردو، فارسی میں کافی عبور حاصل کرلیا۔ تعلیم مکمل ہونے کے بعد ملازمت کی دنیا میں قدم رکھا۔ ابتداء میں دارالعلوم حیدرآباد میں تقرر ہوا۔ بعد میں جامعہ عثمانیہ کے شعبہ دینیات کے صدر منتخب ہوئے۔ ملازمت ہونے کے بعد گیارہ سال تک توسیع دی گئی۔ ۱۳۴۳ف م ۱۹۳۲ء کو ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔

---

[1] محمد نورالدین صدیقی، صدیقی خوان نعما، حیدرآباد ۱۳۷۵ھ، ص ۸

حضرت کا خاندانی سلسلہ پیری مریدی سے تعلق رکھتا تھا
اس لیے آپ کبھی اپنے حلقۂ احباب میں اس طریقت کو جاری رکھا۔
آپ کو اپنے والد عبدالقادر صدیقی صاحب سے کئی سلسلۂ بیعت
حاصل تھا۔ حضرت بچپن سے ہی بزرگانِ دین سے ملاقات
کی نسبت خاص مقام حاصل ہو گیا تھا۔ حضرت حضرت کی ذات
میں علم و معرفت اور اخلاص و محبت جمع ہو گئے تھے اور وہ
دوسروں کو بھی اسی طرح کی زندگی گزارنے کی تلقین فرماتے تھے۔

آپ کی علمی ادبی خدمات پر بہت لکھا جا سکتا ہے۔
حضرت تفسیر، حدیث، عقائد، تصوف، منطق، فلسفہ، کلام
وغیرہ کے ماہر تھے۔ آپ کا مقام علماء فضلا میں نمایاں تھا۔
فن موسیقی و شعر گوئی سے بچپن ہی سے شغف تھا۔ اس کے علاوہ
بنوٹ، کشتی اور فنون حرب سے خاص دلچسپی اور مہارت
رکھتے تھے۔ حضرت حضرت عربی، فارسی، اردو اور ہندی
چاروں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ حضرت نے دینی علوم
کے ساتھ ساتھ خوش نویسی اور خطاطی میں کمال حاصل کیا۔

انگریزی میں بھی حسب ضرورت استعداد پیدا کی۔ آپ
کے اساتذہ آپ کی ذہانت کے معترف تھے انہیں تحریر
اور انشاء پردازی پر دسترس حاصل تھی۔ مو ماحسرت
کی تعلیم وتدریس کا سلسلہ صرف کالج تک ہی محدود نہ تھا
بلکہ گھر پر وہ حدیث، تفسیر، قرات اور دیگر علوم دین
کے طالب علموں کو درس دیتے تھے۔ طالب علم ان سے اہم
موضوعات پر استفسار کرتے۔ مشکل سے مشکل مسائل کو
آپ آسانی سے سمجھا دیتے۔ حسب مراتب کا خیال رکھتے۔
محبت اور شفقت میں یکساں برتاؤ ہوتا مزاج میں
انتہائی سادگی تھی۔ حج و زیارت مقدسہ سے بھی مشرف
ہوئے۔ حج میں متعدد رفقا آپ کے ساتھ تھے۔ قابل ذکر
مولانا الیاس برنی بھی تھے۔ ان سب کی تفصیلات مولانا
مولانا الیاس برنی صاحب کے سفرنامہ میں موجود ہیں۔
آپ مذہبی رہنما ہونے کی وجہ سے آپ کے
وعظ ونصیحت کا انداز بڑا دلنشین ہوتا آپ کے

---

[1] حافظ محمد مظہر دارالعلوم کے سپوت حیدرآباد ۱۹۵۴ء ص ۲۰

مکان میں حلقۂ ذکر و شغل اور محافل درس و عرفان کی ہوتا تھا۔ حضرت خواجہ میاں صاحب قبلہ سے بیعت لی

حضرت نے پہلی شادی حضرت کی چچا زاد بہن بادشاہ بیگم بنت غلام حسین صاحب سے کی موصوفہ کی رحلت کے بعد دوسری شادی عائشہ بیگم صاحبہ بنت احسان الحق صاحب کی۔ آپ کا بھی انتقال ہو گیا۔ پھر تیسری شادی فرخ بیگم صاحبہ بنت حکیم سید حبیب الرحمٰن صاحب سے عمل میں آئی۔ یہ اہلیہ صرف نو ماہ زندہ رہیں اور انتقال فرمایا۔ پھر چوتھی شادی سیدہ بی بی رابعہ مدنی بنت سید اکبر علی صاحب سے فرمائی۔ چار بیبیوں سے آپ کو چھبیس اولادیں ہوئیں۔ حضرت نے ۱۷؍ شوال ۱۳۸۱ھ م ۲۴؍ مارچ ۱۹۶۲ء کو وصال فرمایا۔

شاعری: حضرت نے مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی فرمائی [1]

---

[1] تسکین عابدی "سخنوران دکن" حیدرآباد ۱۳۵۷ھ ص ۱۶۸

۱. حمد و مدح : اس کے تحت وہ حمد و مدح ہے جو انہوں نے سلطان الوجود کی شان میں لکھی ہیں اس کے علاوہ نعت شریف۔ اس میں سب سے نبی اکرمؐ اور اولیائے اکرام کی منقبت داخل ہے ان کے اس دیوان کے حصہ کا نام " محبت " ہے ۔

۲. معیار الحق: یہ پچاس رباعیات کا مجموعہ ہے جس میں تصوف کے کسی نہ کسی مسئلہ کی تفہیم کی ہے ۔

۳. مرآۃ الحقائق: اس طویل نظم میں تصوف کے معرکتہ الآرا مسائل کو سمجھایا گیا ہے۔ جس میں سورۂ فاتحہ، معارف علم، اقسام حکماء وغیرہ درج ہیں

۴. مرآۃ الصدق: اس رسالہ میں انہوں نے قرآن و حدیث سے حضرت ابوبکر صدیقؓ کی جو فضیلت ہے ثابت کی ہے۔ یہ منظوم ہے۔ ہر شعر کے ساتھ احادیث مع ترجمہ پیش کیا ہے ۔

۵. تحفۃ المقال: آسان زبان میں تحفۃ المقال

نام سے ایک نظم لکھی ہے۔ نظم بھی سادہ و سہل ہو میں ہے کہ کمسن بچے بغیر کسی مدد کے آسانی سے خود سمجھ سکتے ہیں۔ حضرت حسرت نہ صرف شاعر تھے بلکہ مفسر قرآن ایک عالم دیندار صاحب وصف و کرامات مرشد تھے۔ آپ نے تفسیر صدیقی کے نام سے قرآن کریم کا ترجمہ عام فہم اور آسان زبان میں فرمایا۔ اس کے علاوہ لاتعداد مضامین علمی مذہبی مقالے لکھے ہیں۔ جن میں قابل ذکر حقیقت بیعت، التوحید، قول و فعل، سماع، دین فطرت، کلمہ طیبہ، ابلیس ازم، درس قرآن، شجرۃ الکون، انتخاب شاہنامہ، روح ادب وغیرہ مشہور ہیں۔ آپ کی شاعری کا نمونہ ملاحظہ ہو۔ نعت شریف کے دو شعر ؎

تم پہ ہو جاؤں میں قربان رسول عربی ؎ تم میری جان کی ہو جان رسول عربی
سواد دیدہ بن کر جائے لی ہے چشم انساں نے ؎ زمیں پر کس طرح سایہ گرے قد محمد کا

حضرت حسرت کے کلام میں تصوف کی جھلک نمایاں ہے ؎

میں جلوۂ محبوب میں محو بن کے کھڑا ہوں ؎ وہ بھی ہیں کھڑے تماشے کو آ گئے
یاد نگہہ مست میں تھا بے خبراں ؎ بے کار ہے ساغر و مینا تیرے آگے

۱؎ محمد انور الدین صدیقی خوان یغما حیدرآباد ۱۳۲۵ھ ص ۱۵

منشی شمس الدین محمد امیر حمزہ

حمزہ کا اصلی نام محمد شمس الدین تھا و عرف امیر حمزہ تھی۔ سچ پوچھئے تو "داستان امیر حمزہ" کے واعظ تھے۔ اس لئے امیر حمزہ کے نام سے مشہور ہو گئے۔ امیر حمزہ ربیع الاول ۱۲۸۶ھ میں قدمہ (ضلع نانڈیڑ) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد جناب محمد سالار حیدر ایک جید عالم اور مدرس تھے۔[1] چنانچہ امیر حمزہ کی ابتدائی تعلیم ان ہی کی نگرانی میں گھر پر ہوئی۔ حمزہ اُردو کے علاوہ فارسی کے بھی ماہر تھے۔ ان کے والد غیور طبیعت کے حامل اور اچھے شاعر بھی تھے چنانچہ حمزہ کو شاعری ورثہ میں ملی تھی وہ اپنے کلام پر والد سے اصلاح لیتے رہے۔ والد کے بعد فخرالدین معلی سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ حمزہ نے ابتدائی ملازمت محکمہ مال سے شروع کی پھر ترقی کرتے ہوئے ۱۲۹۱ھ میں محکمہ ٹپہ میں منتقل ہو گئے اور اسی محکمہ سے وظیفہ پر علحدہ ہوئے۔ سنہ ۱۳۳۷ھ میں حمزہ نے اکسٹھ سال کی عمر میں وفات پائی۔

---

[1] محمد اکبرالدین صدیقی مضمون مشمولہ مرقع سخن جلد دوم مرتبہ ڈاکٹر زور حیدرآباد
سنہ ۱۹۳۷ء ص ۱۲۷ B15

حمزہ نے کئی بلند پایہ تصانیف تخلیق کیں جیسے
تاریخ قندھار دکن تاریخ گولاس۔ وغیرہ شہید
(سوانح شاہ عنایت اللہ حسینی شہید) ۔ مکاشفات سروغیرہ
اس کے علاوہ انہوں نے کئی نثری او منظوم ڈرامے لکھے جیسے
سحر سامری غنچۂ اکبری سامر سبھا سحر سرس گل و بلبل
شرار عشق اور جوہر خنجر وغیرہ

امیر حمزہ کا محبوب مشغلہ شاعری تھا اگرچہ
ان کا نثری سرمایہ کافی ہے چونکہ شاعری ان کو ورثہ میں ملی
تھی۔ اس لیے انہوں نے مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی
فرمائی جیسے غزل قصیدہ نعت نظم اور ٹھمری وغیرہ۔ ان
کے نعتیہ کلام کا مجموعہ 'چمنستان شعراء' کے نام سے
شائع ہوا۔ جس میں قصیدے اور ٹھمریاں شامل ہیں۔
حمزہ نے نعتیہ ٹھمریاں بھی لکھیں۔ اس زمانے میں امجد علی
شائق کے بعد ہی ان کا درجہ بلند تھا۔ چمنستان حمزہ کے مجموعے
سے چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں ہے

حمد کے اشعار :

یا رب یہ سب ہے کا تیرا ۔ عالم میں ہے صلاۃ تیرا
جن جن کہ ملک جبریل یا بشر ہو ؛ سب سب کی [illegible]
گو مقام ہے تیری رہ میں ۔ مومن سے سلام تیرا ــ

نعت کے اشعار:

عشق محبوب خدا کی رہنمائی مل رہی کی ؛ مل گیا امید کے گھر سے نشان مصطفیٰ
بے خودی نے دیکھنا اللہ تک پہنچا دیا ؛ ڈھونڈنے نکلے تھے ہم گھر سے نشان مصطفیٰ

حمزہ کے یہاں ایسے اشعار بھی ملتے ہیں جس میں انہوں نے الفاظ کی تکرار سے شعر میں لطافت پیدا کی ہے ۔ مثال کے طور پر یہ شعر ملاحظہ ہو ؎

کہیں چشم سحر کو پیارے نبی کوئی تجھ سا حسین بشر نہ ملا
کہیں تیری نظر کو نظر نہ لگے تو کسی کی نظر سے نظر نہ ملا

حمزہ کو اپنے وطن سے بے پناہ لگاؤ تھا ۔ وہ اپنے قندھاری ہونے پر فخر کرتے تھے ۔ انہوں نے اپنی غزلوں اور

لــہ محمد اکبر الدین صدیقی مضمون مشمولہ "مرقع سخن" جلد دوم مرتبہ ڈاکٹر زور حیدرآباد ۔ ۱۹۳۷ء ص ۱۸۳

منظومہ مشہور ہیں۔ قصیدہ کا تذکرہ کیا ہے۔ یہ صبر
محبوب علی خاں آصف جاہ سادس کی دوستی عمر سے تو
قندھار کی زمانی ایک عرضداشت پیش کی تھی ذیل میں اس کے
چند اشعار نقل کیے جاتے ہیں ۔

اے مرے والی مرے سلطان عالی منزلت ۔ قصیدہ میں ہے ما کے کمال سے
ہے زمانے میں ترا ابر کرم سایہ فگن ۔ اک مگر محروم بس قلعہ قندھار ہے
ہو خدارا اب تو میری خستہ حالی پر نظر ۔ بس یہی اک التجا ملّۂ قندھار ہے

امیر حمزہ کی ٹھمریوں میں یا وطن دوستی کے جذبات دوستی
کے جذبات ملتے ہیں ۔ ذیل کے اشعار اس کی ترجمانی کرتے ہیں

دھیان آجاتا ہے جب اپنی سیہ کاری کا ۔ منہ تکا کرتا ہوں یا رب تری غفاری کا
ہو شفاعت سے لقب جبکہ سبک ساری کا ۔ لولاک لما ہو نہ کیوں حمزہ قندھاری کا

حمزہ کی ٹھمریاں بے حد مقبول ہوئیں ۔ تقریبات و موقعات
کی میلاد کی محفلوں میں ان کی لکھی ہوئی ٹھمریاں اکثر پڑھی جاتی تھیں
ٹھمریوں کا ایک نمونہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے

نبی جی کی کہانی ۔ جب میں دھیان میں آئی
میں نے کیا کی برائی ۔ ان سے جو دل لگائی
پیر وہ نزدیک مجھکو بلاتے نہیں
کوئی دنیا میں کیوں دل لگاتے نہیں [1]

---

[1] محمد امیر حمزہ "دیوان چمنستان حمزہ" ۱۳۲۹ھ ص ۱۳۶

نواب مرزا خاں داغ

آپ کا اصلی نام ابراہیم تھا جو ان کے والدین
نے رکھا تھا جب داغ سن شعور کو پہنچے تو انہوں نے اپنا
نام ابراہیم سے بدل کر مرزا خاں رکھ لیا ممکن ہے لال قلعہ
کی پرورش سے انہوں نے نام میں نواب بھی شامل کر لیا
اس طرح نواب مرزا خاں داغ ہو گئے۔ داغ کی ولادت
کوچۂ چاندنی چوک دہلی میں ۲۵ مئی ۱۸۳۱ء کو ہوئی[۱]
داغ کے نانا محمد یوسف سادہ کار کشمیری کی دو
صاحبزادیاں تھیں۔ ایک عمدہ بیگم دوسری وزیر بیگم
عرف چھوٹی بیگم۔ مرزا داغ چھوٹی بیگم کی اولاد تھے۔
چھوٹی بیگم کے ساتھ داغ بھی لال قلعہ پہنچ گئے۔ اس
وقت داغ کی عمر تقریباً ۱۲ سال تھی۔ یہاں انہوں
نے غلام حسین شکیب کے صاحبزادے مولوی سید
احمد حسین سے فارسی اور اردو کتابیں پڑھیں۔
اس عہد کے مشہور خوشنویس سید امیر پنجہ کش

۱۔ خلیق انجم "شخصیت اور سیرت داغ" مشمولہ "داغ حیات اور کارنامے" کامل قریشی ص ۱۶

دہلوی سے فن خوشنویسی میں مہارت حاصل کی۔ داغ بہت خوش نصیب تھے۔ انہوں نے ایسے ایسے فنون میں بھی مہارت حاصل کی جو شہزادے اور امرا حاصل کرتے ہیں۔ مرزا فخرو نے مرزا خاں کا تخلص داغ رکھا اور استاد ذوق کے تلامذہ میں شامل کردیا۔

ابھی مرزا داغ پندرہ سال کے تھے کہ ان کی خالہ زاد بہن فاطمہ بیگم سے ان کی شادی کردی گئی۔ فاطمہ بیگم نواب یوسف علی خاں کی صاحبزادی تھیں۔ داغ ابھی تلاش معاش کی جستجو میں تھے کہ دہلی میں غدر ہوگیا۔ لال قلعہ برباد ہوگیا۔ شاعرانہ محفلیں اجڑ گئیں۔ داغ رام پور کی راہ پر گامزن ہوئے۔ والی رام پور نواب یوسف علی خاں چند روز داغ کی آؤ بھگت کرنے کے بعد وفات پا گئے۔ ان کی جگہ کلب علی خاں تخت نشین ہوئے۔ داغ کی ذہانت اور مختلف فنون میں مہارت سے کلب علی خاں کافی

متاثر ہوئے اور انھیں ۱۷ اپریل ۱۸۶۶ء کو زمرہ مصاحبین میں شامل کرلیا اور کارخانہ جات فراشی خانہ اور اصطبل کی داروغگی ان کے سپرد ہوئی۔ ماہانہ ستر روپے ماہوار تنخواہ پانے لگے۔ رام پور میں داغ کے گھر ایک لڑکا احمد مرزا تولد ہوا لیکن بچپن ہی میں فوت ہوگیا۔ داغ کو اس حادثہ کا بہت رنج ہوا۔

داغ کے عشق کی داستان بھی بہت مشہور ہے۔ داغ اپنی پختہ عمر میں ایک طوائف منی جان کے عشق میں گرفتار ہوگئے تھے۔ یہ سلسلہ تقریباً تیس سال تک جاری رہا۔ داغ کے انتقال سے دو سال قبل یہ سلسلہ تلخیوں کے ساتھ ٹوٹ گیا۔

کلب علی خاں کے انتقال کے بعد ان کے فرزند مشتاق علی خاں مسند نشین ہوئے۔ انھیں شعر و شاعری سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ نواب صاحب نے داغ کو نوکری سے علحدہ کردیا یا داغ مستعفی ہوگئے یہ امر تحقیق طلب ہے۔ داغ رام پور چھوڑ کر دلی لوٹ آئے۔

ے پروفیسر سیدہ جعفر۔ مضمون "داغ حیدرآباد میں" ص۵۵

دلی میں قیام زیادہ دن نہ رہا۔ وہاں سے امرتسر، کشن کوٹ، اجمیر، آگرہ، علی گڑھ اور جے پور وغیرہ کا سفر اختیار کیا۔ پھر حیدرآباد کا رخ کیا۔ اس زمانے میں حیدرآباد علم وادب کا گہوارہ تھا۔ سارے ہندوستان کے راجہ مہاراجہ اور نوابوں کے دربار اجڑ گئے تھے۔ صرف دکن کی آصفیہ سلطنت اپنے پورے آب و تاب سے رواں دواں تھی۔ ایسے میں داغ ۱۲ر جولائی ۱۸۸۹ء میں حیدرآباد وارد ہوئے مگر دربار شاہی تک رسائی نہیں ہوئی۔ چند روز سیف الحق ادیب کے مہمان رہے[1] پھر دلی چلے گئے۔ جناب حاجی محمد ابراہیم خانساماں بشاہی سے خط وکتابت تھی۔ وہ شعر وادب کے دلدادہ تھے۔ داغ کے پرستاروں میں سے تھے۔ انہوں نے پھر داغ کو حیدرآباد آنے کی ترغیب دی۔ راجہ گردھاری پرشاد باقی اور خانساماں کو آصفجاہ سادس کا تقرب حاصل تھا۔ انہوں نے داغ کے کلام کی تعریف

---

[1] تمکین کاظمی۔ "داغ" ص ۹۹

کر کے داغ کی شہرت سے واقف کرایا اور داغ کا لکھا ہوا ایک قصیدہ بھی ان کے حضور میں پیش کیا۔ اس قصیدے کے دو شعر درج کئے جاتے ہیں ؎

میں ہوا بادیہ پیما طرفِ ملکِ دکن :: سرمۂ چشمِ غزالاں ہوئی گردِ دامن
نازنینوں کی کمر ہے کہ شاخِ لرزاں :: موجۂ رنگِ رواں زلفِ پریشاں کی شکن

داغ کو حیدرآباد آکر تقریباً ساڑھے تین سال کا عرصہ ہو گیا مگر شاہ دکن کے دربار میں حاضری کا شرف حاصل نہ ہو سکا۔ یکایک ۶ر فروری ۱۸۹۱ء کو نواب آصفجاہ سادس نے اپنی غزل بغرض اصلاح سرفراز فرمائی اور پھر اتوار کی شب کو ۹ بجے چوبدار ایک سربمہر لفافہ میں غزل لے کر داغ کے گھر پہنچا اور صبح دربار میں حاضری کا مژدۂ جانفزا بھی سنایا[1]۔ دوسرے روز علی الصبح ۲۷ر جمادی الثانی ۱۳۰۵ھ م ۷ر فروری ۱۸۹۱ء بروز دوشنبہ داغ حاضر دربار آصفجاہ سادس ہوئے۔ نذر پیش کی اور آصف جاہ کی حضور میں قصیدہ کے یہ اشعار نذر کیے ؎

---

[1] نوراللہ محمد نوری۔ "داغ دہلوی" ص ۱۱

قدمبوسی حضرت کی حاصل ہوئی ۔ بڑے شوق سے اور ارمان سے
حضوری کی تاریخ پوچھیں اگر ۔ یہ کہدو ۔ ملے داغ سلطان سے [1]
۱۳۰۸ھ

داغ کی یہ خوش قسمتی تھی کہ انھیں حضور آصف جاہ سادس کی استادی کا شرف حاصل ہوا ۔ تقریباً ۱۷ برس تک داغ سلطان وقت کے کلام کی نوک پلک درست کرتے رہے چنانچہ آصف کے کلام میں اکثر جگہ مرزا داغ کی جھلک ملتی ہے ۔ [2]

ابتدا میں داغ کی تنخواہ ساڑھے چار سو روپیہ ماہوار مقرر ہوئی ۔ تین سال تک یہی ماہوار ملتی ہے ۔ ۲۰ ربیع الاول ۱۳۰۹ھ کو ایک حکم نامہ کے ذریعہ ساڑھے پانچ سو کا اضافہ ہوا [3] اور اس کے علاوہ داغ دیگر اعزازات سے بھی نوازے گئے جیسے جہاں استاد بلبل ہندوستان نواب فصیح الملک ناظم یار جنگ اور دبیر الدولہ خطابات سے سرفراز ہوئے ۔

---

۱ عبد الجبار ملکاپوری "محبوب الزمن" جلد دوم ص ۹۱۶
۲ نور اللہ محمد نوری "داغ دہلوی" ص ۱۱۱
۳ غلام صمدانی خاں گوہر "تزک محبوبیہ" حصہ دوم ۱۳۱۹ھ ص ۴۳

داغ کی جو قدر و منزلت حیدرآباد دکن میں ہوئی شاید ہی کسی کو نصیب ہوئی ہو۔ داغ کو یہ اعزاز حاصل تھا کہ وہ شاہی اُمراء میں شامل کر لیے گئے۔ انھیں ایسا تقرب حاصل ہو گیا تھا سفر و حضر و شکار میں ہر وقت بادشاہ کے ساتھ رہتے تھے۔ اس سے داغ بھی بہت خوش تھے۔ ایک شعر میں اپنے جذبات کا یوں اظہار کیا ہے ؎

ہے لاکھ لاکھ شکر کہ اے داغ ہر طرح
آرام سے گزرتی ہے شاہِ دکن کے پاس

حیدرآباد میں داغ کا قیام تقریباً سترہ سال رہا۔ اس کے باوجود اپنا ذاتی گھر نہیں تعمیر کیا۔ کرایہ کی کوٹھی میں زندگی گزار دی۔

اب حیدرآباد دکن میں ہر چھوٹا بڑا شاعر داغ کی شاگردی کو اپنے لیے باعث افتخار سمجھنے لگا۔ داغ بھی شاگردوں کے کلام کی صرف نوک پلک درست کرتے تھے زیادہ کانٹ چھانٹ کی عادت نہیں تھی۔

داغ کے مرض الموت کی تفصیل "دبدبۂ آصفی" ۷ ذی الحجہ ۱۳۲۲ھ میں شائع ہوئی تھی۔ داغ آٹھ دن تک بستر علالت پر زندگی

پھر زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا رہے آخر ۷۴ سال
کی عمر میں ۹ ذی الحجہ ۱۳۲۲ھ کی شام داعی اجل کو لبیک کہا۔
آصفجاہ سادس کو اپنے استاد کی رحلت کا بہت ملال ہوا۔
انہوں نے شاہی اعزازات کے ساتھ تجہیز و تکفین کا حکم دیا اور
سرکاری خزانے سے تین ہزار روپے روانہ کئے۔ اس دن عید الضحیٰ
تھی۔ صبح کو داغ کی نماز جنازہ حیدرآباد کی تاریخی مکہ مسجد میں
ادا کی گئی اور یہاں سے جنازہ درگاہ یوسفین لے جایا گیا
اور ان کی رفیق حیات کی قبر کے پہلو میں جانب جنوب درگاہ
یوسفین میں سپرد خاک کیا گیا۔ شعراء نے ہزاروں تاریخیں
لکھیں ان میں "نواب مرزا داغ" سے ان کی وفات تاریخ
نکل آتی ہے۔ یہ تاریخ مشرف جنگ یاس نے نکالی ہے۔

داغ کی تمام شاعری جمالیات سے سرشار نظر آتی ہے

ہے کہاں رات کو آئینہ تو لے کر دیکھو :: اور ہوتی ہے خطا وار کی صورت کیسی
کیوں وصل کی شب ہاتھ لگانے نہیں دیتے :: معشوق ہو یا کوئی امانت ہو کسی کی
دی شب وصل موذن نے اذاں پچھلی رات :: ہائے کمبخت کو کس وقت خدا یاد آیا

داغؔ کا اندازِ بیان بے حد دل نشیں اور بند شیں نہایت برجستہ و بے ساختہ ہوتی ہیں جس سے سلاست و روانی کے ساتھ ساتھ رس اور ترنم بدرجہ اتم ہوتا ہے۔ ان کی غزلیں متصنع انداز سے خالی ہیں لیکن ان کے کلام میں وہ تمام خوبیاں ہیں جو تغزل کی جان ہیں۔ ملاحظہ کیجیے:[1]

بات تک کرنی نہ آتی تھی تمہیں
یہ ہمارے سامنے کی بات ہے

خدا کی قسم نے کھائی تھی آج
قسم ہے خدا کی مزہ آگیا

داغؔ کو تم سے یہ ہرگز کبھی امید نہ تھی
جھوٹے منہ بھی تو نہ پوچھا کہ پریشاں کیوں ہو

---

[1] خلیق انجم "شخصیت اور سیرت داغ" مضمون مشمولہ "داغ حیات اور کارنامے" کامل قریشی ص ۱۶

سید مخدوم محمد الحسینی رفعت

آپ کا نام مخدوم محمد محمد الحسینی چشتی بندہ نوازی اور تخلص رفعت تھا۔ آپ کی ولادت باسعادت ۱۲۷۹ھ میں حیدرآباد میں ہوئی۔ آپ کے جد اعلیٰ حضرت حسین شاہ ولی قبلہ ہیں۔ آپ کا سلسلۂ نسب پیری و مریدی ہے۔ آپ کی کشف و کرامات بچپن ہی سے شروع ہو گئی تھی۔ آپ کی روحانی حالت دیکھ کر عہد محبوبیہ کے اکثر علماء اور فضلاء آپ کے ہم مکتب رہتے تھے۔ دنیا سے انھیں کوئی سروکار نہ تھے۔ آپ کی وفات کے صحیح سنہ کا پتہ نہیں چلتا۔

شاعری کا شوق بچپن ہی سے شروع ہوا۔ آپ کا زیادہ تر کلام تصوف میں ڈوبا ہوا ہے۔ شاعری میں حضرت شیفتہ کنتوری سے اصلاح سخن حاصل کی۔ اس کے بعد انھیں اصلاح کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ نمونہ کے طور پر چند شعر ملاحظہ ہوں :-

انسان کو خوش کثرت وحدت میں چاہیئے تو تفرقہ حجاز و حقیقت میں چاہیے

یارب یہ التجا ہے کہ ہو خاتمہ بخیر
تیری ہی یاد بس دل رفعت میں چاہیئے ؎۱

۱؎ غلام صمدانی خاں گوہر: تذکرہ محبوبیہ، حصہ ہفتم - دفتر شعرائے نازک خیال ص ۶۸

سدانند جوگی بہاری لال رمز

آپ کا نام سدانند جوگی بہاری لال اور تخلص رمز تھا۔ آپ کے والد منشی گنولال بچپن میں دہلی سے حیدرآباد تشریف [لائے] اور استاد فیض کے تلامذہ میں شامل ہو گئے۔ رمز حیدرآباد میں سنہ ۱۲۰۰ھ میں تولد ہوئے۔ بچپن میں والد کی نگرانی میں تعلیم حاصل کرتے رہے اور اپنے والد کے استاد حضرت فیض کی فیضانیت سے سرفراز ہوتے رہے۔ رمز اپنے استاد سخن کی نسبت بے حد عقیدت رکھتے تھے۔ رمز کے تعلق سے نصیر الدین ہاشمی اپنی تصنیف "دکن میں اردو" میں یوں رقمطراز ہیں کہ حضرت فیض کے عرس کے موقع پر منعقد کئے گئے مشاعرہ میں رمز نے جب یہ شعر پڑھا تھا ؎

چو دل شد مستغرق کن ہر چہ خواہی ، کون گویم چہ رمز این کن کہ آں کن [1]

تو شعر ختم ہوتے ہی بہاری لال رمز گر پڑے اور ان کی روح پرواز کر گئی۔ رمز ایک قادر الکلام شاعر تھے۔ کثیر کلام اپنا یادگار چھوڑا ہے۔ انہوں نے فارسی اردو دونوں زبانوں میں طبع آزمائی کی۔

---

[1] نصیر الدین ہاشمی "دکن میں اردو" دہلی سنہ ۱۹۷۹ء صفحہ ۵۶۷

رفعت نے اپنے کلام میں فیض کے دوسرے شاگردوں کا بھی ذکر کیا ہے ؎

فیاض ہیں مزاج ہیں اور مقصر ہیں بزرگ ؛؛ تلمیذ فیض کے ہیں فقط اس جانب آپ سے (?)
فیاض و عصر اور تقی و مزاج و یاس ؛؛ ایسا بھی اور اک کس (?) اب کہیں نہیں

رفعت تھے تو دہلی کے مگر ان کو اپنے مادر وطن سے زیادہ دکن بہت عزیز تھا ۔ چنانچہ کہتے ہیں ؎

عاشق نہیں دنیا میں کسی رشک چمن کا ؛؛ گل خوردہ ہے میں عارض سبزان دکن کا
انداز حور خلد کا مشہور ہے مگر ؛؛ آتی نہیں اے دلبر ملک دکن کی بات

رفعت دنیاوی زندگی سے بیزار تھے ۔ اپنے کلام میں اس بات کا جا بجا تذکرہ کیا ہے ۔ نیز اپنے کلام میں اپنی زندگی کے بعض اہم واقعات کو قلمبند کیا ہے ؎

آغاز میرے عشق کا احباب لیجے سن ؛؛ تھا میں وزیر شاہ دکن کا جو کارکن
سامان عیش دہر کے سب میں لیا تھا چھین ؛؛ تھا دھیان سب ادھر کا نہ تھی اک ادھر کی دھن
اس جائے میں بھی خود ہمہ تن نور نور تھا ؛؛ خاکی وجود تک بھی گویا کوہ طور تھا
معشوق و مے بھی راگ بھی سب کچھ رہے تھا
بس آسمان دو ہی تو انگل قریب تھا [1]

۱؎ ڈاکٹر زور "مرقع سخن" جلد دوم حیدرآباد ۱۹۳۷ء ص ۱۲۰ تا ۱۲۱

رمز کے والد کا مکان حضرت فیض کے گھر کے قریب ہی تھا۔ اس لیے رمز اپنے استاد سخن حضرت فیض سے بے حد عقیدت رکھتے تھے۔ ایک شعر میں رمز لکھتے ہیں ؎

ہے فیض کے قدموں کے تلے رمز کا تکیہ :: جس جائے کہ رتبہ بیاں ہو نہیں سکتا

رمز نے اپنے استاد کے سایۂ عاطفت میں تقریباً چالیس برس گزارے اور جب حضرت فیض کا انتقال ہو گیا تو رمز کی طبیعت میں انتشار پیدا ہو گیا اور مجذوب ہو کر گوشہ نشین ہو گئے۔ یہی کیفیت تقریباً بیس ۲۰ برس رہی۔ رفتہ رفتہ حالت جذب میں اغراق ہو گیا۔ کبھی استاد کے مزار کے قریب برہنہ حالت میں چلے جاتے۔ ایک ہاتھ میں شراب کی بوتل اور دوسرے میں کتے کا بچہ لئے پھرتے تھے۔ (۶۶) سال کی عمر کو پہنچنے کے بعد اس حالت میں کمی ہونے لگی تب دوبارہ شاعری شروع کر دی۔ رمز کی باقیات میں ہم کو ایک قلمی کلیات ملتا ہے۔ جس میں سات ہزار سے زیادہ اشعار ہیں۔ ان میں غزل، رباعی، قطعات، قصاید، تاریخ تہنیت، فارسی رباعیات، فارسی قطعات، فارسی خمسے، کلام ہندی بھاشا وغیرہ ملتے ہیں۔ رمز بعض اوقات ایک رات میں سو سو اشعار کہتے تھے۔ چنانچہ کہتے ہیں ۱؎ ع

اک رات میں سو شعر تو کہنا لگا اے رمز

۱؎ نصیر الدین ہاشمی "دکن میں اردو" دہلی ۱۹۶۸ء ص ۶۶۸

غلام صمدانی خاں گوہر حیدرآبادی

آپ کا نام غلام صمدانی خاں اور تخلص گوہر تھا۔ آپ کی ولادت ۱۱ ربیع الثانی ۱۲۸۵ھ حیدرآباد میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد کی نگرانی میں فارسی اور عربی میں حاصل کی۔ انگریزی اور تلنگی سے بھی واقف تھے۔ اُردو زبان تو مادری تھی۔ آپ کے جدِ اعلیٰ غلام زمان خاں صاحب آصف جاہ ثالث کے بعد حیدرآباد آئے اور موضع سرور نگر میں رہتے تھے۔ تعلیم حاصل کرنے کے بعد گوہر محکمۂ مالگزاری میں ملازمت شروع کی۔ اسی سے وظیفہ حاصل کیا خود نوشت سوانح "تبین گوہر" خود رقم ہیں

جناب گوہر کی پہلی بیوی سے کوئی اولاد نہیں ہوئی اور ۸ محرم الحرام ۱۳۱۶ھ کو انتقال کر گئی۔ جناب گوہر اپنی پہلی بیوی کے انتقال سے قبل ۱۳۱۳ھ میں دوسری شادی شمس النساء بیگم عرف خواجہ بیگم سے عمل میں آئی۔ جن کے بطن سے ایک لڑکا غلام دستگیر خاں عرف دستگیر پاشاہ ۹ ربیع الاول ۱۳۱۷ھ تولد ہوا۔ دوسرا لڑکا ۲۳ جمادی الثانی ۱۳۲۸ھ سہ شنبہ تولد ہوا۔ اس لڑکے کا نام محبوب علی خاں رکھا فی زمانہ دونوں کا انتقال ہو گیا ہے۔

جناب گوہر "عہدِ محبوبیہ" کے نامور مورخ تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی میں تاریخ بعنوان "تزکِ محبوبیہ" جلد اول ۱۳۱۷ھ میں اور تزکِ محبوبیہ جلد دوم ۱۳۱۹ھ میں زیورِ طبع سے آراستہ کیا بہت کم اصحاب یہ جانتے ہیں کہ غلام صمدانی خاں

۱؎ غلام صمدانی خاں گوہر "تزکِ محبوبیہ" جلد دوم دیباچہ حیدرآباد ۱۳۱۹ھ ص الف

گوہر ایک کامیاب شاعر تھے۔ ان کا ایک دیوان "نظم گوہر" کے نام سے ۱۳۰۹ھ میں شائع کیا تھا مگر اب کمیاب بلکہ نایاب ہے۔ "تزک محبوبیہ" کے دیباچہ سے اخذ کردہ اشعار ملاحظہ ہو:

دیتے ہیں اپنی جان وہ غیروں کی چاہ میں ؛ بالکل نہیں سماتے ہم ان کی نگاہ میں
کھوٹا نہیں کھرا ہے ہتو نقد دل میرا ؛ دیکھو پرکھ لو جانچ لو اپنی نگاہ میں
بوسہ لیا جو اُن کا تو جھنجھلا کے یوں کہا ؛ چھوڑو ہٹو چلو کوئی دیکھے نہ راہ میں
اے دل ذرا ٹھہر کہ جواب آ ہی جائے گا ؛ قاصد کو دیر ہو گئی شاید کہ راہ میں
گوہر بتوں کی جور سے بالکل ہوا ہے تنگ ؛ شید خدا اُسے رکھو اپنی پناہ میں [۱]

جناب گوہر حیدرآبادی تھے مگر عہد محبوبیہ میں ریاست کے ضلع رائچور میں مقیم تھے۔ جو اب کرناٹک اسٹیٹ میں شامل ہے۔ ایک مصرع میں رائچور کا ذکر کس خوبی سے کرتے ہیں ملاحظہ ہو

جو حال پوچھے گوہر خانہ خراب کا ؛ کہدو کہ اب مقیم ہے وہ رائچور میں

جناب گوہر ایک مورخ اور شاعر ہی نہیں تھے انہوں نے ایک ممتاز صحافی کی حیثیت سے بھی عہد محبوبیہ میں خوب نام کمایا۔ آپ کا ایک ہفتہ وار اخبار "جلوۂ محبوب" کے نام سے شائع ہوتا تھا۔ بعد میں یہ اخبار روزنامہ میں تبدیل ہو گیا اور کچھ عرصہ بعد بند ہو گیا۔ یہ اخبار آج تلاش بسیار کے باوجود دستیاب نہیں ہوا۔

---

[۱] غلام صمدانی خان گوہر "تزک محبوبیہ" جلد دوم دیباچہ حیدرآباد ۱۳۱۹ھ صرف

مرزا نظام شاہ لبیب

آپ کا نام مرزا نظام شاہ اور تخلص لبیب تھا۔ آپ کا سلسلۂ نسب خاندان تیموریہ سے ملتا ہے۔ جناب لبیب کی ولادت سنہ ۱۸۸۳ء میں دہلی میں ہوئی۔ جب آپ (۹) برس کے ہوئے تو اپنے والد کے ہمراہ "خطۂ محبوبیہ" میں تلاش معاش میں حیدرآباد آئے۔ جناب لبیب نے حیدرآباد میں مدرسہ دارالعلوم میں تعلیم حاصل کی پھر پنجاب یونیورسٹی سے منشی عالم اور مولوی فاضل کا امتحان کیا۔ اس کے علاوہ ہندی زبان اور انگریزی سے بھی واقف تھے۔ ابتدا میں محکمۂ مال میں ملازم ہوئے۔ کچھ عرصہ ملازمت ترک کر کے "مشیر دکن" اخبار کے دفتر میں منیجر ہو گئے بعد میں ایڈیٹر بھی۔ اس کے بعد انہوں نے خود اپنا ایک مطبع محبوب پریس کے نام سے قائم کر لیا اور ایک ادبی رسالہ "افادہ" بھی شائع کرتے رہے۔ اس رسالہ میں ادبی مضامین شائع ہوتے تھے۔ (۳۵) سال کی عمر میں لبیب کے دل میں فقیری کا رجحان پیدا ہوا گیا چنانچہ اسی زمانے میں وہ اپنا گھر بار چھوڑ کر نو دس سال تک ایک حضرت شاہ صاحب کے گھر رہ گئے۔[1] جناب لبیب نے (۶۳) برس کی عمر پائی۔ آخر زمانے میں وہ حیدرآباد سے بمبئی منتقل ہو گئے۔ وہاں کینسر میں مبتلا ہو کر وہیں سنہ ۱۹۴۶ء میں انتقال کیا۔

---

[1] غلام صمدانی خاں گوہر "تزک محبوبیہ" جلد دوم دفتر ہفتم حیدرآباد سنہ ۱۳۱۹ھ صفحہ ۱۶۹

جناب لبیب کو شاعری کا شوق بچپن سے تھا۔ شروع میں استادِ سخن حضرت داغ دہلوی کو دو چار غزلیں دکھائیں۔ اس کے بعد اپنے والد مرزا خاور، آقا سید علی شوستری، مرزا مشیر الدین ضیاء اور حبیب کنتوری سے بھی مشورۂ سخن کیا۔ کسی کی باقاعدہ شاگردی نہیں کی۔

جناب لبیب ایک کامیاب شاعر گزرے ہیں۔ انہوں نے شاعری کے علاوہ نثر نگار کی حیثیت سے بھی کافی شہرت حاصل کی۔ انہوں نے مہاراجہ کشن پرشاد شاد کی فرمائش پر ۱۹۲۳ء میں کلیات حسن اجری کے قلمی نسخے کی تصحیح کی جو اسی سال شائع ہوئی۔ ۱۹۳۷ء میں مولوی عبدالحق بابائے اردو کی فرمائش پر مثنوی مولانا روم کو اردو جامہ پہنایا جو حکایات رومی کے نام سے دو جلدوں میں شائع ہوئے۔ اس کے علاوہ انہوں نے "رموز اوقاف" کے نام اردو کی علامات اوقاف پر ایک کتاب تحریر کی۔ ایک اور کتاب "سلوک قلندری" کے نام سے مرتب کی جس کے مصنف شاہ بالمیں تھے۔

جناب لبیب ۱۹۵۸ء میں پاکستان منتقل ہو گئے اور وہاں سے اپنا کلیات "آتش خزاں" کے نام سے شائع کیا جو غزل، نظم، گیت، رباعی اور قطعات وغیرہ پر مشتمل ہے۔ ان کی غزلیات میں حسن و عشق کی پابندی اور معاملہ بندی نمایاں ہے۔ ذیل کے اشعار اس بیان کی نمائندگی کرتے ہیں۔

کیا ہوئے آہ وہ دن رات سنورنے والے ۔۔ جن کی ہر آن پہ تھے سینکڑوں مرنے والے

تھے تغافل میں بھی دل لینے کے انداز میں طاق ۔۔ ڈھونڈ کر گھر دل صد چاک میں کرنے والے

اب نہ وہ شمع نہ وہ بزم نہ وہ گرمیٔ حسن ۔۔ زندہ در گور ہیں دم عشق کا بھرنے والے

خوشی ناخوشی دن گزر جائیں گے ۔۔ تری رہگزر ہی میں مر جائیں گے
نشاں زندگی کا تڑپ ہے لبیب ۔۔ مریں گے تو سب زخم بھر جائیں گے

حیدرآباد کے ایک غیر طرحی مشاعرہ (۱۹۲۳ء) میں لبیب نے ایک مشہور غزل پڑھی جس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ۔

مٹا یا اس قدر اس کے خرام ناز نے یارب ۔۔ کہ باقی ہے فقط اب داستاں ہی داستاں میری

نہیں گردش میں کچھ کم چرخ سے عمر رواں میری ۔۔ کہ ہر دم اک بہار نو دکھاتی ہے خزاں میری

تمنا ہے ماضی و مستقبل زندانیاں لیکن ۔۔ نمود ہستی فی الحال ہے اک چیستاں میری

مجھی سے اے بہار جاں فزا آباد ہے گلشن ۔۔ تری نیرنگیوں کی جان ہیں بیتابیاں میری

لبیب اس بام پر چڑھنے کی جتنی جستجو کیجے
ہوئی جاتی ہے اتنی ہی فروتر نردباں میری [1]

---

[1] "رسالہ اردو" مرتبہ عبدالحق جلد سوم اپریل ۱۹۲۳ء ص ۳۰۷

سید نوازش علی لمعہ حیدرآبادی

آپ کا نام سید نوازش علی خاں اور تخلص لمعہ تھا۔ آپ کی ولادت ۱۲۸۷ھ م ۱۸۶۸ء میں بمقام حیدرآباد ہوئی۔ جناب میر کاظم علی خاں شعلہ آپ کے والد تھے۔ اپنے والد کی نگرانی میں تعلیم حاصل کرلی۔ اردو فارسی اور انگریزی میں بھی مہارت پیدا کی۔ لمعہ علم طب سے بھی واقف تھے۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد انہوں نے محکمۂ پولیس میں ملازمت اختیار کی اور اسی محکمہ سے وظیفہ پر سبکدوش ہوئے۔ حیدرآباد میں آپ کا گھر دارالشفاء کے قریب جام باغ کے مقام پر تھا۔ آپ کی اولاد میں ایک فرزند جناب ابو المحسن سید مہدی تھے۔ آپ کا وصال (۶۰) سال کی عمر میں ۱۹۲۷ء میں ہوا۔ ؎

جناب لمعہ کو شاعری ورثہ میں ملی تھی۔ آپ کے دادا میر احمد علی خاں شہید دہلوی مشہور شاعر گزرے ہیں۔ جناب لمعہ اپنے والد شعلہ اصلاح سخن لیتے تھے۔ آپ کا کلام نہایت صاف اور شگفتہ تھا۔ ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ آپ کا ایک قلمی دیوان کتب خانہ آصفیہ میں محفوظ ہے۔ آپ نے شاعری

؎ سلیمان اریب "حیدرآباد کے شاعر" ۱۹۶۶ء ص ۳۵

علاوہ ایک منظوم اضافت رسالہ جاری کیا اور "مراۃ العروض" کے نام سے ایک کتاب قواعد شاعری پر شائع کی۔ دوسری دوسری "تسہیل المعنیٰ"، تیسری "لنگڑا شیطان"، چوتھی "معیار الاضافت"، پانچویں "جواہر الاشعار"، چھٹی "تخمیس لمعہ" ہے۔ یہ سب کی سب شائع ہو چکی ہیں۔

رباعی: پختہ جو ہوا ثمر تو خامی کے بعد ؛ عزت ملی یوسف کو غلامی کے بعد
حاصل ہوا لمعہ خضر کو آب حیات ؛ یک جرعہ ہزار تشنہ کامی کے بعد

غزل کے اشعار:

انھیں اس روز سے مشق ستم ہے ؛ شروع تھی جب ابتدا لوح و قلم کی
ترے کوچے کو جب مسند بنایا ؛ زیارت کر چکے دیر و حرم کی
مسجد کو ہم نہ جائیں گے میخانہ چھوڑ کر ؛ پیماں شکن بنیں گے نہ پیمانہ چھوڑ کر

جناب نصیر الدین ہاشمی نے اپنی تصنیف "دکن میں اردو" میں لمعہ حیدرآبادی کی ایک نظم "خودنگی اور آئینہ" درج کی ہے۔ ملاحظہ ہو:

کسی زنگی نے اک آئینہ رستے میں پڑا پایا
نظر آئی جب اس کی شکل زشت اس میں تو گھبرایا

وہ چپٹی ناک وہ نتھنے کھلے ہونٹ وہ موٹے
وہ چوڑے دانت جن پر ہو گماں غول بیاباں کا

ہوئیں یہ دیکھ کر غصے سے اسکی لال لال آنکھیں
تھا کالا کوئلہ پہلے بنا اب سرخ انگارا

لگا مار سیہ کی طرح کھانے پیچ و تاب اس دم
برائی اپنی صورت کی قصور آئینہ کا سمجھا

رہی بالکل نہ تاب ضبط جب اسکو تو گھبرا کر
زمیں پر آئینہ پٹکا چڑھا کر ناک بھوں بولا

اسی لیئے تو کسی نے راستے میں اس کو پھینکا ہے
نظر آتی ہے اس میں کیا بری ہیئت بڑا چہرا

جو اپنے عیب سے غافل ہیں ان کی یہی حالت
خدا سے کم ہو اس سے بتائے عیب جو ان کا [1]

---

[1] نصیر الدین ہاشمی "دکن میں اردو" دہلی ۱۹۷۸ء ص ۶۱۷

بعد کی تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ نوازش علی خاں لمعہ اپنے والد کے انتقال کے بعد نظم طباطبائی سے رجوع ہوئے اور اپنے کلام پر اصلاح حاصل کرنے لگے۔ [1]

لمعہ نے اپنے کلام میں صنف غزل کے علاوہ رباعیات بھی کثرت سے لکھی ہیں۔ نمونے کے طور پر یہاں دو رباعیاں درج کی جاتی ہیں۔

رباعی ۱: دنیا مردار اہل دنیا کلاب
کرتے ہیں خوشامد امیر و نواب
اے لمعہ کبھی کسب توکل کو نہ چھوڑ
پہنچاتا ہے رزق سب کو رب الارباب

رباعی ۲: رو دھو کے لڑکپن کا زمانہ گزرا
ایام شباب کو بھی جوں توں کاٹا
پیری میں گرا پہاڑ سر پر ایسا
ہم جھک گئے لمعہ بار یہ اٹھ نہ سکا

---

[1] صاحب حیدرآبادی: دکن میں رباعی گوئی، حیدرآباد ص ۲۱۷، ۲۱۸

مہاراجہ سر کشن پرشاد شاد

آپ کا نام کشن پرشاد اور تخلص شاد تھا۔ آپ کی پیدائش ۱۸ر شعبان ۱۲۸۰ھ م ۲۸ر جنوری ۱۸۶۴ء کو جوالا بی بی کے بطن سے ہوئی۔ آپ کی زائچہ کے حساب سے نجومی نے آپ کا نام پرشوتم داس رکھا۔ مگر آپ کے نانا مہاراجہ نریندر پرشاد نے اپنے نواسہ کا نام کشن پرشاد رکھ دیا اور آپ اسی نام سے مشہور ہوئے۔ کشن پرشاد کا خاندان راجہ ٹوڈرمل (وزیر اکبر اعظم) سے ملتا ہے۔ شاد اپنے والد راجہ ہری کشن کی اکلوتی اولاد تھے۔ آپ کا سلسلہ نسب سورج بنسی کھتری خاندان سے ملتا ہے۔ آپ کے پرنانا راجہ چندو لال مدار المہام بعہد سکندر جاہ گزرے ہیں۔ آپ کے نانا نریندر پرشاد نے آپ کی تعلیم پر خاص توجہ دی چنانچہ آپ عربی فارسی اور اُردو کے علاوہ انگریزی میں بھی اچھی دسترس رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ آپ نے سنسکرت کی تعلیم درگا پرشاد سے حاصل کی۔ سیاق کا علم مراری لال سے اور خطاطی رائے بچو لال سے حاصل کی۔ اس کے علاوہ آپ نے تیر اندازی، بنوٹ اور شہسواری

کی تعلیم بھی حاصل کی تھی اور گرمکھی کا علم گرو نانک شاہ
سے حاصل کیا تھا۔[1] آپ ہندی زبان سے بھی بخوبی واقف
ہندی میں بھی شعر کہتے تھے۔

مہاراجہ کشن پرشاد شاد نے پیشکاری کے عہدہ
سے اپنی ملازمت شروع کی اور ترقی کرتے کرتے صدر اعظم
جیسے جلیل القدر عہدہ سے نوازے گئے۔ شاد کو ۱۳۲۰ھ
م ۱۹۰۳ء میں حکومت برطانیہ کی طرف سے سی۔آئی۔ای
کا خطاب عطا کیا گیا تھا۔ پھر جارج پنجم کی سالگرہ کے
موقع پر جی۔سی۔آئی۔ای کا خطاب عطا کیا گیا تھا۔ نواب
میر محبوب علی خاں آصف جاہ سادس کے عہد میں آپ
مدار المہام پر فائض رہے اور جب میر عثمان علی خاں
نے عنان سلطنت ہاتھ میں لی تو انہوں نے ۲۵ رجب
۱۳۳۰ھ م ۱۹۱۲ء کو دے دیا اور سیاسی زندگی سے
سبکدوشی اختیار کرلی۔ سبکدوشی کے بعد شاد نے گھر
پر باقاعدہ علم و ادب اور شعر و سخن کی محفلیں منعقد
ہونے لگیں۔ شاد کا دربار ایک بادشاہ کے دربار
سے کسی طرح کم نہ تھا۔ آپ کے دربار میں ہر وقت

---

[1] حبیب ضیاء ڈاکٹر "کشن پرشاد شاد" حیدر آباد ص ۲۵۱
۱۹۷۸ء

شعراء ہند کا کثیر اجتماع موجود رہتا۔ روزآنہ محفل سخن
سجائی جاتی تھی۔

سرکشن پرشاد شاد نے سات شادیاں کی تھیں
پہلی تین بیویاں ہندو تھیں۔ جن کے نام یہ ہیں (۱) رانی دھروپتی
بائی عرف تہنیت محل (۲) رانی کشٹا بائی عرف مبارک محل
(۳) رادھا بائی عرف راحت محل بعد میں چار شادیاں مسلمان
خواتین سے انجام پائی (۱) لسین بیگم شاد محل (۲) غوثیہ بیگم
مسرت محل (۳) آفتاب بیگم فرحت محل (۴) رحیمہ بیگم
عشرت محل۔ آپ کی کل اولادیں پندرہ لڑکے اور اکیس
لڑکیاں سات محلات سے تولد ہوئے [1]

شاد کے مذہب کے بارے میں کافی اختلاف پائے
جاتے ہیں۔ اگر سچ پوچھا جائے تو آپ پکے ہندو تھے مگر
مسلمان عقیدہ سے کافی متاثر تھے۔ قرآن شریف کی
آیات روانی سے پڑھتے تھے۔ بزرگان دین سے بے پناہ
عقیدت تھی۔ آپ کا طرز زندگی مسلمانوں کی طرح تھا۔
حضرت خواجہ حسن نظامی سے انہیں بیعت حاصل تھی۔
اپنی تمام زندگی میں شاد نے کبھی بھی مسلمان ہونے کا

---

[1] حبیب ضیا ڈاکٹر "سرکشن پرشاد شاد" حیدرآباد ۱۹۷۸ء ص ۲۹

اعلان نہیں کیا ۔ اپنے حسب نسب سے کھتری ہونے پر فخر کرتے تھے ۔ ان کے ایک شعر سے ہندو ہونے کا ثبوت ملتا ہے ؎

کفر کافر کو بھلا شیخ اسلام بھلا
ہم تو ہیں آپ بھلے اپنا دل آرام بھلا [1]

شاد اپنی مختلف نظموں میں اپنے مسلک کی وضاحت کی ہے ۔ ذیل میں "پریم درپن" نظم کے دو شعر نقل کئے جاتے ہیں

میں ہوں ہندو میں مسلمان ؟ ہر مذہب ہے میرا ایمان
شاد کا مذہب شادی جانے ! آزادی آزاد ہی جانے

مہاراجہ کشن پرشاد اپنے طور طریقہ لباس رہن سہن سے پکے مسلمان معلوم ہوتے تھے مگر ان کے دل میں بت پرستی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی ۔ شاد جس محفل میں شریک ہوتے ایسے گھل مل جاتے کہ لوگ انھیں اپنے عقیدہ کا ہی تصور کرتے مگر ایسا کچھ نہیں تھا ۔ وہ ایک پکے بت پرست تھے ۔ مگر ساتھ ساتھ دوسرے مذاہب سے بے پناہ عقیدت رکھتے تھے ۔ مہاراجہ شاد سرکاری مصروفیات کے بعد ادبی محفلوں میں رنگ جماتے تھے ۔

---

[1] کشن پرشاد شاد "جذبات شاد" حیدرآباد ص

انہیں مشاعروں کا بہت شوق تھا - ان کا دربار بھی ایک اچھا خاصہ
بادشاہ کے دربار سے کم نہیں تھا - ہر وقت آپ کے دربار میں شعراء
اہل ہنر اور اہل قلم موجود رہتے - آپ کے ادبی خدمات کو ہم دو حصوں
میں آسانی سے تقسیم کرسکتے ہیں - (۱) حصۂ نظم دوسرا حصۂ نثر

حصۂ نظم :

مہاراجہ شاد کے ذوق شعری کا جھکاؤ کسی خاص صنف سخن کی طرف نہیں تھا بلکہ شروع ہی سے ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کرتے رہے - جہاں انہوں نے غزل، قصیدہ اور مرثیہ جیسی قدیم اصناف سخن میں اپنا کمال دکھایا - وہیں تخمیس بھی لکھی اور مثنویاں بھی - شاد ابتداء اپنا کلام آصف جاہ سادس کو دکھلاتے تھے - جب داغ حیدرآباد تشریف لائے تو استاد آصف کے ساتھ شاد بھی داغ سے اصلاح سخن شروع کردی - مہاراجہ شاد نے موضوعاتی نظمیں بھی لکھیں - جیسے (۱) من لسترا (۲) مجموعہ مناجات (۳) نظم روپیہ (۴) نغمۂ مستانہ (۵) درس محبت (۶) جذبۂ قوی ــــ یہ سب اردو نظموں کے مجموعے ہیں - اس کے علاوہ فارسی میں (۱) آئینۂ عقیدت (۲) پیمانہ عقیدت (۳) ایمان شاد بھی موجود ہے - یہ سب کلام آپ کی زندگی ہی میں زیور طبع سے آراستہ ہوچکا ہے

تھا اور شاد کو غزل سے فطری لگاؤ تھا۔ وہ اپنے سرکاری مصروفیات سے وقت نکال کر شعر و شاعری کرتے تھے۔ شاد کی غزلوں کے چار دیوان موجود ہیں (۱) باغ عتاد (۲) نکلرۂ رحمت (۳) نغمۂ شاد (۴) بیاض شاد[1]۔ اس کے علاوہ آپ نے قصیدہ گوئی میں بھی مہارت حاصل کی۔ انہوں نے کئی قصیدے اپنی یادگار چھوڑے ہیں۔ جیسے "قصیدہ در تہنیت میر عثمان علی خان" (۲) قصیدہ در مدح آصف جاہ سادس (۳) قصیدہ آصف جاہ سادس کی سالگرہ کے موقع پر لکھا گیا۔ قصیدہ کے علاوہ شاد نے مثنویاں بھی کہیں جیسے (۱) نسیم سحر (۲) عرض حال (۳) مریم درین (۴) جلوۂ کرشن (۵) خارشاد (۶) بزم توحید وغیرہ ان کی یادگار مثنویاں ہیں۔ اس کے علاوہ ایک مسدس "آشوب عظیم" نام سے ۳۷ بندوں پر مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ مرثیہ گوئی میں بھی مہاراجہ شاد مہارت رکھتے تھے۔ آپ حضرت امام حسین رضؓ سے عقیدت رکھتے تھے۔ اس لیے انہوں نے ۲۷۶ اشعار پر مشتمل ایک طویل مرثیہ ماتم حسین رضؓ کے نام سے لکھا۔ آپ نے 'نوحۂ شاد' کے نام سے ایک نوحہ لکھا جو حضرت امام حسین رضؓ کی شہادت پر لکھا گیا ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے اُمراء دکن کی موت پر بھی "نوحہ شمس الملک" کے نام سے لکھا اور انہوں نے اپنے فرزند کے فوت ہونے پر ایک نوحہ "آصف پرشاد"

---

[1] عبدالجبار ملکاپوری "محبوب الزمن" جلد اول حیدرآباد ۱۳۲۹ھ ص ۵۸۶

لکھا جو ۱۶۷ اشعار پر مشتمل ہے۔ یہ ایک انتہائی درد انگیز نوحہ ہے۔ نمونہ کے طور پر چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں۔

جی میں آتا ہے خوب سر پیٹوں ؛؛ مار کے دھاڑیں خوب سا روؤں
مرغ بسمل کی طرح تڑپیں خوب ؛؛ خاک پہ گر کے ہاتھ لوٹوں خوب
جیب و داماں کو اپنے خاک کروں ؛؛ خاک کو لے کے اپنے سر پہ ملوں
خودکشی کا خیال آتا ہے ؛؛ غم کلیجے کو کھائے جاتا ہے
جی بہلتا نہیں ہے اب گھر میں ؛؛ رہ نوردی کا ہے جنوں سر میں
رات دن اس کا ہی تصور ہے ؛؛ مثل آئینہ کے تحیر ہے

مہاراجہ شاد کے دیوان میں رباعیات اور قطعات بھی ملتے ہیں۔ جیسے (۱) صبح امید (۲) شگوفہ بہار (۳) نذر سلطان ہند (۴) رباعیات شاد (۵) آئینہ عقیدت (۶) ~~آئینہ~~ ارمغان زیبا (۷) گلبن تاریخ (۸) نذر شاد وغیرہ۔ نمونہ کے طور پر ایک رباعی درج کی جاتی ہے ۔

دیتا ہے دعا دل سے یہ شوال کا ماہ
سرسبز ہے باغ دکن تیرا شاہ
پامال عدو ہوں تیرے سبزہ کی طرح
تو سرخرو اور شاد رہے آصف جاہ

مہاراجہ شاد ہندی کے قادرالکلام شاعر تھے۔ انہوں نے عربی رسم الخط میں ٹھریاں، کہانیاں، بھجن، خیال اور بارہ ماسے مختلف دھنوں میں لکھی ہیں۔ ان کے ہندی کلام کے دو مجموعے "نغمۂ شاد" اور "ترانۂ شاد" کے نام سے شایع ہوئے۔ یہ شاعری برج بھاشا میں کہی گئی ہے اور تمام شعری رعایات بھی برج بھاشا ہی سے لی گئی ہیں۔ مہاراجہ شاد کا یہ کلام راقم الحروف کے موضوع سے خارج ہے چونکہ یہ برج بھاشا میں ہے۔

مہاراجہ شاد کی تصنیفات کا دوسرا حصہ نثر میں ہے جہاں شعر و شاعری میں مہاراجہ شاد کہنہ مشق شاعر تھے وہیں انہوں نے نثری میدان میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ ان کے مضامین اور مقالہ نگاری کو اردو ادب کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ شاد غور و فکر کرنے والے حساس انسان تھے۔ ان کے ہاں زندگی کا ایک خاص تصور تھا۔ ان کے مسلک میں بڑی وسعت بھی تھی۔ مہاراجہ شاد نے انشائیہ کا کوئی نمونہ نہیں چھوڑا حالانکہ ان کے تخیل کی جولانی سے اچھی انشائیہ نگاری کی توقع کی جا سکتی تھی۔ ان کے نثری تخلیقات میں "فریادِ شاد" اور "جذباتِ شاد" دو ایسی تخلیقات ہیں جن میں انشائیہ کی خصوصیت نمایاں پائی جاتی ہیں۔ "جذباتِ شاد" کی ابتدائی صفحات میں مہاراجہ نے اپنی شخصیت اپنے عقیدے اور اپنے تصورات کو پیش کیا ہے۔

سید کاظم علی خاں شعلہ

آپ کا نام میر کاظم علی خاں اور تخلص شعلہ تھا۔

آپ کی ولادت ۱۲۵۲ھ میں دہلی ہوئی ان کے والد کا نام میر احمد خاں المخاطب منیر الشعراء تھا۔ شعلہ اپنے والد کے ساتھ حیدرآباد تشریف لائے۔ بچپن میں عربی فارسی اور اُردو میں مہارت حاصل کی۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد اپنے والد بزرگوار کے عہدہ پر فائز ہوئے۔

شاعری میں حضرت شاہ نصیر دہلوی سے اصلاح کلام حاصل کیا۔ آپ کی اصلاح کے بعد شعلہ نے پھر کبھی اور سے اصلاح سخن حاصل نہ کی۔ شعلہ ایک پرگو اور نادر شاعر تھے۔ شاگردوں کی تعداد کثیر ہے۔ جن میں تاریخ داں جناب غلام صمدانی خاں گوہر آپ کے شاگرد ہیں۔ شعلہ کا چھپن (۵۶) سال کی عمر میں ۱۳۰۸ھ میں انتقال ہوا۔ آپ کے کلام میں سلام، رباعی، مرثیہ، قطعات وغیرہ ملتے ہیں۔ فن تاریخ گوئی میں شعلہ کو کمال حاصل تھا۔ انہوں نے اپنے کلام کی اشاعت کو اہمیت نہیں دی۔

آپ کے تین بیٹے (۱) سید علی نقی (۲) سید نوازش علی اور تیسرے سید قادر علی تھے۔ ان میں صرف سید نوازش علی المعروف مشہور صاحب دیوان شاعر گزرے ہیں۔ ذیل میں بطور نمونہ شعلہ کے کلام کے چند اشعار درج کئے جاتے ہیں۔

دکھا دیں آپ گر سے اپنا اگر چمن میں دہن ؛ چھپائے غنچہ دہن اپنا پیرہن میں دہن
ہوس میں بوسۂ لب اگر کرونگا میں ؛ تو بعد مرگ رہے گا کفن میں دہن [1]
زبان خامہ کی ہوگئی شعلہ ؛ ہوا جو باز میرا وصف پنجتن میں دہن

"دکن میں اردو" سے شعلہ کی ایک غزل ذیل میں درج کی جاتی ہے

گر وصل بھی ہو جاتا اک بار تو کیا ہوتا
دامن مجھے قاتل کا دامان قضا ہوتا
وہ شوق شہادت ہے سو بار اگر مرتا
قاتل ہی کی جانب کو لاشہ بھی پھرا ہوتا
اس شعلہ مہجور کی شب کو جو کہیں زلفیں
سورہ کو دخاں کی دم اے شعلہ کیا ہوتا [2]

---

[1] غلام صمدانی خاں گوہر "تزک محبوبیہ" جلد دوم دفتر ہفتم حیدرآباد ۱۳۲۹ھ ص ۹۰

[2] نصیر الدین ہاشمی "دکن میں اردو" دہلی ۱۹۷۸ء ص ۵۷۵

حضرت آغا محمد داؤد صاحب صحوؔ

نام آغا محمد داود تھا صحوؔ تخلص فرماتے تھے۔ آپ کے والد آغا محمد حیدر ضلع نظام آباد کے متوطن تھے۔ قطب شاہی عہد میں منصب سے سرفراز ہوئے اور جاگیر بھی پائی۔ آپ کا تعلق سلسلۂ پیری مریدی سے تھا۔ مولانا شاہ محمد حسن کے سلسلۂ بیعت میں داخل ہوئے جو آپ کے والد آغا محمد حیدر کے پیر و مرشد تھے۔ حضرت داؤد صاحب صحوؔ اہل دل صاحب نظر شاعر تھے[1]۔ وجاہت خاندانی تھی۔ شاہی منصب کے باوجود آپ ذکر و عبادت اور ریاضت کی طرف زیادہ متوجہ رہتے تھے۔ سولہ سال کی عمر میں اپنے والد کے مرشد حضرت محمد حسن محمود ابوالعلائی کے ہاتھ پر بیعت حاصل کرلی۔ دو سال تک مسلسل ذکر و عبادت میں رہنے کے بعد جذب غالب ہوگیا۔ لباس کا خیال تھا نہ غذا کی فکر۔ اس کیفیت میں مقامات طریقت طے ہونے لگے۔ بالآخر حضرت پیر و مرشد نے خلافت سے سرفراز کیا۔ آپ پابند صوم و صلواۃ تہجد گزار ذاکر تھے۔ آپ کے کشف و کرامات کی شہرت دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ جب نواب میر محبوب علی خاں آصفجاہ سادس کو اس بات کی اطلاع ہوئی

---

[1] امۃ السلام مقالہ "آصفجاہی دور کے صوفی شعراء" ص ۱۹۵

تو آپ بھی ان کے عقیدت مندوں میں شامل ہوگئے۔ شاہ آصف
نے آپ سے متاثر ہوکر ان کی شان میں ایک قصیدہ بھی لکھا تھا جو
آپ کے "دیوان محبوب" میں ملتا ہے۔ حضرت صحوؔ کو مذہبی کتب کے
مطالعہ کا بڑا شوق تھا۔ اکثر رسائل معرفت و حقیقت مطالعہ میں
رہتے۔ جس کی بدولت انھیں فن تصوف میں کامل عبور تھا۔[1]
اپنے پیر و مرشد کی صحبت اور فیضانِ نسبت نے اس چنگاری کو
ہوا دے کر شعلہ بنا دیا۔ رفتہ رفتہ ریاضت کا غلبہ اس قدر
شدید ہوا کہ دنیا اور خلائق سے بے زار ہوکر وجد و جلال میں گوشہ
نشین ہوگئے۔ باوجود اس کے معتقدین کثرت سے آتے رہتے۔ جس
کسی پر نگاہ لطف و کرم کی وہ فیضیاب ہوگیا۔ آپ کے فقر کا یہ حال
تھا کہ مدتوں روٹی اور بے نمک دال پر بسر کرتے لیکن غربا اور مساکین
کو بہتر سے بہتر کھانا کھلاتے۔

حضرت آغا داؤد صحوؔ کا مذاقِ سخن بہت اعلیٰ اور معیاری تھا۔
شاعری سے فطری لگاؤ تھا۔ حضرت صحوؔ فارسی اور اردو زبان میں شعر
کہتے تھے۔ ۱۳۳۲ھ میں آپ کی شاعری کا دیوان "دیوان صحوؔ" کے نام
سے شائع ہوا۔ استاد جلیل مانکپوری نے دیوان صحوؔ کی اشاعت پر جو
اشعار موزوں کئے اسی سے اندازہ ہوتا ہے کہ تخیل کی گرمی اور طبیعت کا

۱۔ ڈاکٹر مستقیل ہاشمی "سید افتخار علی وطن" حیدرآباد ص ۱۵

کا تقدس اور عشق حقیقی کے جذبے ان کے شاعرانہ رجحانات کو مخصوص رنگ میں رنگ دیا تھا چند شعر دیوان صحو سے ملاحظہ ہوں۔

پہچانتے نہیں ہیں ابھی تک وہ آپ کو ؎ جھگڑا ہی تو گبر و مسلمان میں رہ گیا
وحشت کو میری دیکھ کے گھبرا گیا ہے وہ ؎ دست جنوں بھی چاک گریباں میں رہ گیا

مخمس :

بے وسیلوں کا رسیدہ ہے عراقی ساقی ؎ تیرے میخانے پہ حاضر ہے شرابی ساقی
عرض کچھ کر نہیں سکتا ہے خرابی ساقی ؎ اس بلانوش کو تلچھٹ ہی ہے کافی ساقی
بھر دے مجھکو میں جو شیشے میں ہے باقی ساقی

حضرت صحو کی ایک ٹھمری کے چند شعر ملاحظہ ہوں

من والے پیا پیارے ؎ مجھے لاگی نجریا توری رے
ایک تو سینا مد ماتے ؎ دوجے نینا باندھی کٹاری رے

حضرت صحو ایک صوفی شاعر تھے اس لئے ان کے کلام میں زیادہ تر تصوف ہی ملتا ہے۔ ان کے دیوان میں چند غزلیں ہیں ان میں سے دو اشعار ملاحظہ ہوں

وحشت کو میری دیکھ کے گھبرا کے رہ گیا ؎ دست جنوں بھی چاک گریباں میں رہ گیا
ہرگز یقین نہ ہو گا مری بات کا اسے ؎ کیا ہو گیا صحو کو ہنسی ہاں میں رہ گیا [1]

---

[1] نصیر الدین ہاشمی "دکن میں اردو" نئی دہلی ۱۹۷۸ء ص ۵۷۰

مرزا بہادر علی صفیؔ حیدرآبادی

نام مرزا بہادر علی اور تخلص صفیؔ تھا۔ ولادت حیدرآباد میں ہوئی۔ عہد محبوبیہ کے نوجوان شاعر تھے۔ آپ کا ایک دیوان ۱۳۴۰ھ[1] میں حیدرآباد سے شائع ہوا تھا۔ تلاش بسیار کے باوجود دستیاب نہ ہو سکا۔ صاحب حیدرآبادی اپنی تالیف "جنوبی ہند میں رباعی گوئی" لکھتے ہیں کہ صفیؔ کا ایک مجموعہ زیر نظر ہے۔ جس میں ۱۳۷ رباعیات ہیں۔ اس کا مقدمہ نظم طباطبائی نے لکھا ہے۔

جناب صفیؔ اردو اور فارسی کے کامیاب شاعر تھے۔ آپ کے کلام میں تمام اصناف ملتے ہیں[2]۔ رباعیاں ملاحظہ ہوں۔

کر سکتے ہیں کب وصف رقم تیرا ؎ بے جاں بھی جو ہیں بھرتے ہیں وہ دم تیرا
آنکھوں میں ہیں پوشیدہ نظر کی صورت ؎ اللہ اللہ کیا ہے عالم تیرا

بندے کو کسی غنی کا محتاج نہ کر ؎ دنیا میں کسی ولی کا محتاج نہ کر
حاجت ہے صفیؔ کی یہی اے رب کریم ؎ تو اپنے سوا کسی کا محتاج نہ کر

اولاد اگر کسی کی قسمت میں نہیں ؎ جینے کا مزہ اسے حقیقت میں نہیں
رنگین ہے اس پھول سے دنیا کا چمن ؎ یہ پھل وہ ہے جو باغ جنت میں نہیں[2]

؎۱، ؎۲ صاحب حیدرآبادی "جنوبی ہند میں رباعی گوئی" ۱۹۸۶ء ص ۱۶۴، ۱۶۵

محمد عبدالجبار خاں صوفی ملکاپوری

آپ کا نام محمد عبدالجبار خاں اور صوفی تخلص تھا۔ آپ کی ولادت ۱۲۵۰ھ میں ملکاپور ضلع برار میں ہوئی۔ آپ کی تعلیم و تربیت اپنے والد کی نگرانی میں ملکاپور میں ہوئی۔ ملازمت کے لئے عہد محبوبیہ میں حیدرآباد آئے۔ ان کی علمی قابلیت کے مدنظر حکومت نے انھیں مدرسہ اعزہ میں عربی اور فارسی کا معلم بنا دیا۔ جناب صوفی ملکاپوری نے اپنی نوکری کے ساتھ ساتھ علمی و ادبی خدمات کی جس کو اہل دکن کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔ عبدالجبار خاں صوفی نے مدرسہ اعزہ ہی سے وظیفہ حاصل کیا۔ اس کے بعد دکن کی تاریخ لکھ کر عہد محبوبیہ میں گراں قدر کارنامہ انجام دیا جس کی تفصیلات بعد میں آئیں گی۔ عبدالجبار خاں کی وفات ۱۳۴۳ھ م ۱۹۲۵ء میں میں حیدرآباد میں ہوئی۔ [۱]

عبدالجبار خاں صوفی ادبی دنیا میں نامور مورخ کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ انھوں نے اپنی زندگی تاریخ دکن کی تحقیق و تلاش

---

[۱] زینت ساجدہ "حیدرآباد کے ادیب" جلد دوم حیدرآباد ۱۹۶۲ء، صفحہ ۹۰

کیلئے وقف کردی تھی اور برسوں کی عرق ریزی کے بعد "محبوب التواریخ" کا سلسلہ مرتب کیا جو پانچ جلدوں پر محیط ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے محبوب الوطن، تاریخ سلاطین بہمنی، محبوب الزمن (تذکرہ شعرائے دکن) اور اسی کے ساتھ محبوب المنن (تذکرۂ اولیائے دکن) لکھ کر اُردو کی بڑی خدمت انجام دی۔

جناب تمکین کاظمی رسالہ نقوش لاہور میں رقمطراز ہیں:

"مولوی صاحب کا اصل کارنامہ تاریخ دکن ہے۔ دکن کا تاریخی مواد نہایت مبہم اور منتشر ہے مگر مولوی صاحب نے بڑی عمدگی سے اُسے فراہم کیا اور مرتب کیا ہے" [1]

آگے لکھتے ہیں۔ حیدرآباد کے بڑے بڑے لوگ مثلاً تلاوت جنگ صدرالمہام مال نواب رستم جنگ ناظم کروڑ گیری نواب غازی یار جنگ وغیرہ مولوی صاحب کے شاگرد تھے

---

[1] رسالہ نقوش، شخصیات نمبر جلد دوم مضمون تمکین کاظمی لاہور ۱۹۵۶ء ص ۱۲۶۶

جن کی شاگردی پر مولوی صاحب ناز فرمایا کرتے تھے۔

تمکین کاظمی کے والد منتخب الدین تجلی بھی صوفی صاحب کے شاگرد تھے۔ مولوی صاحب کے پاس نایاب کتابوں کا بڑا ذخیرہ تھا جو طغیانی میں تلف ہو گیا۔ مختصر یہ کہ صوفی صاحب بڑی خوبیوں کے بزرگ عالم تھے اور اپنے زمانے کے قابل لوگوں میں سے تھے۔ بیس پچیس کتابوں کے مسودے یادگار چھوڑے ہیں۔ بعض نقادوں نے جناب صوفی کو دکن کا آزاد کہا ہے۔ انہوں نے دکن کے بیسیوں شاعروں کو گمنامی سے بچایا اور ان کے حالات اور کلام کو اپنی تصانیف میں محفوظ کر دیا۔ اگرچہ شاعری میں خود انہوں نے بڑا نام پیدا نہیں کیا لیکن تحقیق و تلاش سے حیدرآباد کے شاعروں پر جو مواد جمع کیا ہے۔ وہ اتنا وافر ہے کہ اس سے ماخذ کا کام لیا جاتا ہے۔

سید محمد ضامن ۔ ضامن کنتوری

آپ کا نام سید محمد ضامن اور تخلص ضامن تھا۔
آپ کی ولادت ۶ ذی الحجہ ۱۲۹۰ھ م ۱۸۷۳ء بمقام کنتور (بارہ بنکی) میں ہوئی۔ آپ اپنے والد سید محمد کاظم حبیب کنتوری کے ہمراہ حیدرآباد آئے اور یہیں مستقل سکونت اختیار کرلی۔
ضامن کی تعلیم و تربیت اپنے والد کی نگرانی میں ہوئی۔ انہوں نے عربی، فارسی، اردو اور انگریزی کی تعلیم حاصل کی اور عہد محبوبیہ میں بگی خانہ سرکار آصفیہ میں ملازم ہوگئے اور وہیں سے وظیفۂ حسن خدمت حاصل کیا۔ آپ کی وفات ۱۳۳۰ھ میں حیدرآباد میں ہوئی۔

ضامن کنتوری کو شاعری ورثہ میں ملی تھی۔ آپ کے والد حبیب کنتوری قادرالکلام شاعر تھے۔ ضامن اپنے کلام پر اپنے والد ہی سے اصلاح لیتے تھے۔ انہوں نے اردو اور فارسی میں اپنا کلام چھوڑا ہے۔ ضامن کا اردو دیوان شایع ہوگیا ہے۔ انگریزی زبان میں بھی

مہارت رکھتے تھے۔ انہوں نے لارڈ ٹینی سن کی مشہور نظم "انوک آرڈن" کا ترجمہ "شہیدِ وفا" کے نام سے بہت عمدہ کیا ہے۔[1] مثنوی کے چند شعر درج کئے جاتے ہیں۔

دل کو ہر طرح سے سنبھالا ٭ امید سے غم کو اس نے ٹالا
لیکن جب اور ذکر آیا ٭ پلٹا کچھ گفتگو نے کھایا
انوک کرنے لگا نصیحت ٭ جیسی ہے سپاہیوں کی عادت
اللہ کا آسرا بتایا ٭ تعلیم و رضا کا ذکر لایا

ضامن کا کلام بہت پرمغز اور معنی آفریں ہوتا تھا۔ انہوں نے اپنی غزل میں معاملہ بندی کو بڑی خوبی سے رقم کیا۔ غزل کے کچھ شعر ملاحظہ ہوں ؎

عمر بھر اپنے کئے پر آپ ہی رونا پڑا ٭ داغ بدنامی کو اشک سے دھونا پڑا
ہو برا اغراض کا لینا پڑا احسانِ خلق ٭ بھاگتے تھے جس سے آخر وہ بوجھ ڈھونا پڑا

قطعہ:

عید کا دن ہے عداوت ہی سے کہدو واعظ ٭ کہ ہوا آج ہے خونِ جگر جامِ شراب
ساتھ دل کے گئیں سب دل کی امنگیں ضامن ٭ ہو بس سیرِ گل و سبزہ نہ سرِ جامِ شراب

---

1 نصیر الدین ہاشمی "دکن میں اردو" دہلی ۱۹۸۵ء، ص ۶۴۲

شاعری کے علاوہ جناب ضامن بریلی سے ایک رسالہ "لسان الملک" بھی جاری کیا۔ اس کے ایڈیٹر بھی ضامن ہی تھے۔ حیدرآباد میں آپ کے شاگردوں کا حلقہ بہت وسیع تھا جن میں کئی قابل ذکر ہیں۔ [1]

جناب ضامن کے ترجموں اور تالیفات کی فہرست درج ذیل ہے۔

(۱) فارسی کلیات کا ترجمہ سیزنگ مقال (۲) ارتنگ خیال (فارسی کلام) (۳) طریق سعادت (نثر) (۴) بالک پھلواری (چھوٹے بچوں کے لیے نظمیں تحریر کی ہیں) (۵) قواعد کنتوری (۶) عبرت کدۂ سندھ (تاریخ سندھ) (۷) ارمغان فرہنگ (یہ انگریزی کے مشہور شعراء کا تذکرہ ہے جس کو اردو زبان میں منظوم کیا گیا ہے) (۸) شہید وفا (یہ ٹینی سن کی نظم انیک آرڈن کا منظوم ترجمہ ہے۔ (۹) ایلی آوارۂ وطن (یہ انگریزی کے شاعر گولڈ اسمتھ کی نظم "ٹراولر" کا منظوم ترجمہ ہے۔

---

[1] صاحب حیدرآبادی "دکن میں رباعی گوئی" حیدرآباد۔ ۱۹۸۹ء ص ۱۴۲

ذیل میں ضامن کی غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں

تم لاکھ چھپو حسن چھپایا نہیں جاتا ؛ رسوائے جہاں ہو گئے پردہ نہیں جاتا
ہم سمجھے تھے اے دوست یہ ہو گی میں خوراک ؛ کیا شکر ہے کعبہ کو رستہ نہیں جاتا
آہنگ طرب چھیڑ یہ ہے شاد کی محفل ؛ کیا بات ہے ضامن ترا رونا نہیں جاتا

آخر میں ضامن کی ایک رباعی جو رسالہ "لسان الملک"
جنوری ۱۹۲۲ء میں شائع ہوئی ۔ ملاحظہ ہو ۔

رباعی

آنکھیں کہتی ہیں حسن فطرت دیکھو ؛ ہر رنگ میں نیرنگی قدرت دیکھو
حیرت کا اشارہ ہے ادھر تو آؤ ؛ لو آئینہ میں ہو بہو اپنی صورت دیکھو

جناب ضامن کنتوری نے ایک مشاعرے میں بڑی
اچھی غزل پڑھی تھی اس کے چند اشعار درج ذیل ہیں ۔

یہ اندیشہ ہے حق کہکر نہ جائے مفت جاں میری
کرو اقرار جاں بخشی تو گویا ہو زباں میری
عجب کیا گر بنے وہ بزم عشرت حلقۂ ماتم
زباں تیری ہو اے افسانہ گو اور داستاں میری
بہار رنگ رخ ایسا نہ ہو کافور ہو جائے
کسی سے کیوں کوئی حدیث خونچکاں میری [1]

---

[1] عبدالحق : رسالہ اردو جلد سوم اپریل ۱۹۲۳ء ص ۳۰۷

ضامن کنتوری نے کلام غالب کی طویل شرح لکھی تھی جو کہ سات جلدوں پر مشتمل ہے۔ یہ شرح کلام غالب حال تک غیر مطبوعہ تھی۔ اب پروفیسر رفیع صاحب نے بڑی جستجو سے ضامن کنتوری کے فرزند سے اس شرح کے مسودے حاصل کر لیے ہیں اور اس شرح کو مرتب و شائع کر رہے ہیں اگر یہ شائع ہو جائے تو وہ کلام غالب کی ایک اور بہترین شرح منظر عام پر آئے گی۔

o

محمد عبداللہ خاں ضیغم لکھنوی

آپ کا نام محمد عبداللہ خاں اور ضیغم تخلص تھا۔ آپ کی ولادت ۱۲۷۸ھ م ۱۸۶۱ء میں بمقام لکھنؤ ہوئی۔ بچپن میں اپنے والد کی سرپرستی میں عربی، فارسی اور اردو کی تعلیم حاصل کی۔ نوجوانی میں ملازمت کی تلاش میں حیدرآباد آئے اور سررشتۂ راجہ رایاں امانت ونت کی پیشی میں ملازم ہو گئے۔ (۸۸) روپیہ تنخواہ ملتی تھی۔ ایک کرایہ کا مکان کولہ واڑی میں حاصل کیا اور وہیں قیام پذیر ہو گئے۔ ضیغم کے دو فرزند تھے ایک غلام قمرالدین صفی اللہ خاں دوسرے غلام حسن نعیم اللہ خاں۔ ضیغم کی وفات ۱۳۲۵ھ میں حیدرآباد میں ہوئی۔[1]

ضیغم کو شاعری کا بچپن سے تھا۔ انہوں نے اپنے کلام پر حکیم نواب نیاز احمد خاں ہوش بریلوی سے اصلاح لی۔ ضیغم ایک قادرالکلام شاعر تھے۔ آپ کا کلام ہر صنف سخن میں ملتا ہے جیسے غزل، مرثیہ، رباعی، قطعات، نعت اور حمد وغیرہ۔ انہوں نے اپنا ایک قلمی دیوان

---

[1] غلام صمدانی خاں گوہر، تزک محبوبیہ، جلد دوم، شعرائے ناز کتاب، ۱۳۱۹ھ

یادگار چھوڑا ہے جو کتب خانۂ ادارۂ ادبیات میں
محفوظ ہے۔ جب ہم ضیغم کے کلام پر نظر ڈالتے ہیں تو
ان کے کلام کے مقابلہ میں ان کی گمنام زندگی کو
دیکھ کر افسوس ہوتا ہے اور یہ احساس شدت سے
پیدا ہوتا ہے کہ حیدرآباد آکر ضیغم لکھنوی نام و نمود
کی خواہش سے دور اردو ادب کی خاموش خدمت انجام
دیتے رہے جو بجائے خود ان کا اپنا انعام تھیں۔

ضیغم کے کلیات کے مطالعہ سے ایک اور
پہلو سامنے آتا ہے کہ انہوں نے غزل میں اپنے بزرگوں
کے کلام کا رنگ بھر دیا ہے۔ ان کے طرز سخن کی تقلید
شاعری کا صحیح معیار سمجھی جاتی تھی۔ ان کے دو ضخیم
قلمی کلیات کتب خانہ ادارہ ادبیات میں محفوظ ہیں۔

ان کی غزل کے چند شعر بطور نمونہ درج کئے جاتے ہیں۔

پنہاں کرے نہ زیست کا کشتہ ترا ہو کرتا؟ حسرت ہے یہ اے دامن شمشیر کسی کی
کس ناز سے کہتے ہیں وہ آکر شب وعدہ! اچھی تھی گھڑی لڑ گئی تقدیر کسی کی
دل تھام کے ہاتھوں سے جو تم ہو گئے مضطر
یاد آگئی کیا ضیغم دلگیر کسی کی [1]

---

[1] عبداللہ خاں ضیغم "گلدستہ جشن آصفیہ" حیدرآباد ۱۳۲۹ھ ص۱۱

ضیغم نے شعرائے محبوبیہ کا ایک تذکرہ مرتب کیا تھا جو "یادگار ضیغم" کے نام سے ۱۳۰۳ھ میں شائع ہوا۔ اس میں تقریباً ڈھائی سو شعراء کا مختصر کلام ملتا ہے۔ کتب خانہ سالار جنگ میں محفوظ ہے۔

نظم طبا طبائیؔ

نظم طبا طبائی کا اصلی نام سید علی حیدر اور تخلص نظم تھا۔ نظم نے اپنی شاعری میں حیدر تخلص بھی بعض دفعہ استعمال کیا ہے۔ نظم ۱۷ صفر ۱۲۷۰ھ ۱۸ نومبر ۱۸۵۳ء کو لکھنؤ میں میں پیدا ہوئے۔ انہیں مختلف زبانوں جیسے اردو فارسی عربی اور انگریزی وغیرہ پر کافی عبور حاصل تھا۔ اس کے علاوہ انہیں فلسفہ، منطق، سائنس اور علم نجوم سے بھی دلچسپی تھی۔ نظم سادات گھرانے میں پیدا ہوئے۔ والدہ سر سالار جنگ بہادر کی بیٹی تھی۔ نظم ۸۲ سال کی عمر پائی۔ ان کا انتقال حیدرآباد میں ۱۹۳۳ء کو ہوا۔ تدفین حضرت موسیٰ قادری کے

دائرے میں عمل میں آئی۔ نظم طباطبائی نواب واجد علی شاہ

کے رشتہ کے نسبتی برادر تھے۔ واجد علی شاہ کے آس پاس

کے ماحول کے زیر اثر نظم نے اپنی عمر کے ۳۷ سال اودھ

میں گذارے۔ ۱۸۸۶ء میں پہلی مرتبہ تفریح کی غرض سے

حیدرآباد تشریف لائے۔ اس وقت حیدرآباد کے چیف

جسٹس سید افضل لکھنوی نے نظم کی قابلیت سے متاثر

ہوکر انہیں حیدرآباد میں قیام کے لیے مجبور کیا۔ مگر وہ

نہ مانے اور کلکتہ چلے گئے۔ اسی سال واجد علی شاہ

کا انتقال ہوگیا اور نظم بے روزگار ہوگئے۔ ملازمت

کے لیے پریشان تھے۔ اسی اثناء میں حیدرآباد کے ایک

مدرسہ میں عربی کے استاد کی جگہ خالی ہوئی۔ نظم اس

ملازمت کے لیے کلکتہ سے حیدرآباد آنے ہی والے تھے

کہ جسٹس سید افضل حسین کا تار ملا۔ جس میں انہوں

نے نظم کو حیدرآباد آنے کی دعوت دی اور درخواست

کی کہ اُن کے فرزند سید حسین کے اتالیق کی حیثیت سے

ماہانہ ایک سو روپیہ قبول فرمائیں چنانچہ نظم ۱۸۸۷ء

میں دوبارہ حیدرآباد آئے اور تاحیات یہیں قیام فرمایا ۔

نظم طباطبائی حیدرآباد آنے کے کچھ ماہ بعد مدرسہ اعزا میں عربی کے استاد مقرر ہوئے ۔ ۱۸۹۰ء میں کتب خانۂ آصفیہ کے پہلے مہتمم بنائے گئے ۔ ۱۸۹۱ء میں مدرسۂ عالیہ کے عربی و فارسی کے استاد کے عہدہ پر مامور ہوئے اور ۱۸۹۷ء تک یہاں اپنی خدمات انجام دیں ۔ ۳۱ر اکتوبر ۱۸۹۷ء کو ان کا تبادلہ نظام کالج میں ہوا ۔ یہاں وہ عربی، فارسی کے لکچرار کی حیثیت سے اپنے فرائض انجام دیے ۔ ۷ر اکتوبر ۱۹۰۸ء کو اسی کالج میں اُردو کے پروفیسر کے عہدہ پر ترقی ہوئی ۔ ۶ر جون ۱۹۱۷ء کو نظام کالج سے مدرسہ خاص منتقل کئے گئے ۔ جہاں وہ شہزادگان دکن کو عربی تعلیم دینے لگے ۔ ۱۰ر جولائی ۱۹۱۸ء کو ان کا تبادلہ دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ کیا گیا ۔ ۱۶ر اکتوبر ۱۹۱۹ء اُنہیں وظیفہ حسن خدمت پر علیحدہ ہو جانا چاہئے تھا لیکن ان علمی قابلیت اور دارالترجمہ میں ان کی شدید ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے کئی بار اُن کی ملازمت توسیع کی جاتی رہی، بالآخر وہ ۱۱ر جولائی ۱۹۲۶ء کو دارالترجمہ سے سبکدوش ہوئے ۔

۲۱ مئی ۱۹۱۷ء کو آصف سابع نے نظم طباطبائی کو ان کی گزشتہ خدمات کے صلہ میں حیدر یار جنگ کے خطاب سے نوازا۔

نظم طباطبائی کی دو طویل نظمیں ملتی ہیں۔ ایک تو نعت خواں قصیدہ ہے۔ دوسری "ساقی نامہ شقشقیہ" ہے۔ نعت خواں قصیدہ میں بعثت نبوت سے غلبہ اسلام کی داستان ہے۔ اس میں مجاہدین کا ذکر ہے اور یہ "جنگ حنین" پر ختم ہوئی ہے۔

قصیدۂ بعثت سے لئے گئے چند شعر ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

اٹھیں باگیں بڑھے توسن کھچیں تیغیں چلے نیزے
کڑے جوشن چنیں زرہیں دم رزم صف آرائی
وہ نیزوں کا لچک جانا کمانوں کا وہ بل کھانا
وہ سوفاروں کی ہچکی اور کبادہ کی وہ انگڑائی [1]

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ "ساقی نامہ شقیقیہ" مسدس حالی کی طرح مسلمانوں کے مذہبی و قومی شعور میں انقلاب بیدار کرنے کے ارادہ سے

[1] "نظم طباطبائی" از ڈاکٹر اشرف رفیع ص ۲۵۶

کبھی ہو گی۔ اس میں برطانوی حکمرانوں کے شراب نوشی اور شراب
کی تجارت اور اُن کی اخلاقی گراوٹ کو پیش کیا گیا ہے۔ بطور
نمونہ ذیل میں چند اشعار نقل کیے جاتے ہیں۔

سیکھا انگریزی کا تو علم و ادب ٭ اور ہیں اپنی زبان سے جاہل سب
ذوق تقریر سے نہیں آگاہ ٭ سبک تحریر سے نہیں آگاہ
ہوئے سودے کی نثر سے آگاہ ٭ نہیں سودا کی نظم سے کچھ راہ
پڑھ کے انگریزی نوکری جو ملی ٭ آ گئی کیا لیاقت علمی
تم نے سمجھے نہیں مطالب علم ٭ تم نے دیکھے نہیں ہیں طالب علم [1]

نظم نے کئی نظمیں لکھیں ان میں "خطاب اہل اسلام" اسی طرح وطن
کی خیر مناتے ہیں، ہندوستان کی سیفو میڈم سروجنی وغیرہ قابل ذکر
ہیں۔ اس کے علاوہ نظم کے کلام میں انگریزی نظموں کے اُردو تراجم
بھی ملتے ہیں۔ ان میں "گور غریباں" جو تھامس گرے کے مرثیہ
ELEGY کا ترجمہ ہے قابل ذکر ہے۔ نظم نے شکسپیئر کے منظومات
کا اُردو میں ترجمہ کیا ہے۔

---

[1] نظم طباطبائی، ڈاکٹر اشرف رفیع ص ۲۸۰

"گورغریباں" کے دو بند ذیل میں پیش ہیں۔

نظر آتے نہیں کتنے مزاروں پر تو کیا غم ہے
چراغاں اور صندل اور گل و ریحاں نہ ہو تو کیا
نہیں نگمیرہ اور کمخواب کی چادر تو کیا غم ہے
جو خوش آہنگ کوئی قاری قرآں نہ ہو تو کیا
ہر اک کے درد دکھ سے اس کو رشتہ اور مطلب
سوا کفن تو یاری کی نہیں تو اشکباری کی

نظم طباطبائی نے گرے (GRAY) کی ایک اور نظم "اوڈ ان اسپرنگ" کا ترجمہ "زمزمۂ فصل بہار" کے عنوان سے کیا ہے۔

۱۹۰۶ء میں نظم نے نواب میر محبوب علی خاں آصف جاہ سادس کے جشن چہل سالہ پر ایک قصیدہ لکھا ہے۔ اس میں رباعیوں کی ترتیب مسمط ربع کے اصول پر کی گئی ہے اور ہر رباعی کے چوتھے مصرع میں نفس مضمون کو پر زور انداز میں پیش کیا ہے۔ قصیدہ کے چند بند پیش کیے جاتے ہیں۔

پھیلا ہوا عالم میں عجب نور ہے آج ؛ رشک شب شب دیجور ہے آج
کیا جوش و سرور چشم پر نور ہے آج ؛ ہے آخر ماہ چاند بھر پور ہے آج
ساون کا سماں ہے نغمہ ہائے تر سے ؛ جب تار پہ مضراب پڑے مینہ برسے
جی زاہد خشک کا نہ کیوں کر ترسے ؛ رشک رگ ابر تار طنبور ہے آج
ہے چار منارہ سے تجلی و نمود ؛ موسیٰ کی زباں پہ طور و طور ہے آج

نظمؔ طباطبائی کی غزلیات تقریباً (۵۰) سال کے طویل عرصہ پہ محیط ہیں ۔ ۱۸۸۶ء سے قبل لکھی ہوئی غزل کو انہوں نے مٹیا برج کے مشاعرہ میں داغ کے ساتھ پڑھی تھی۔ ان کے کلام میں طرز غالب سے مماثلت ملتی ہے۔ میرؔ اور نظمؔ کا ماحول ایک دوسرے سے جدا ہے لیکن میرؔ کے اسلوب میں نظمؔ نے اشعار کہے ہیں مثلاً

میرؔ کی غزل ؎

فقیرانہ آئے صدا کر چلے ؛ میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے

میرؔ کی اس غزل کی اتباع میں جو غزل نظمؔ نے بھی لکھی اس کے چند اشعار پیش ہیں ۔

بشان نکہت گل ساتھ ہم ہوا کے چلے ؛ ہے آشنا وہ جو کہنے پہ آشنا کے چلے
نمود رعشۂ پیری ہوا اجل آئی ؛ چراغ صبح تھے گویا کہ جھلملا کے چلے
کبھی جو آگئے تکیہ پہ ہم فقیروں کے ؛ دعائیں سن کے چلے کوسنے سنا کے چلے

نظم طباطبائی نے حضرت داغ کے رنگ میں بھی کئی غزلیں لکھی ہیں ۔ ایک غزل کے چند شعر بطور نمونہ پیش کیے جاتے ہیں ۔

کس لیے پھرتے ہیں یہ شمس و قمر دونوں ساتھ ؎ کس کو یہ ڈھونڈتے ہیں برہنہ سر دونوں ساتھ

مجھ کو حیرت ہے شب عیش کی کوتاہی پر ؎ یا خدا آئے تھے کیا شام و سحر دونوں ساتھ

کیسی یا رب یہ ہوا صبح شب وصل چلی ؎ بجھ گیا دل مرا اور شمع سحر دونوں ساتھ [1]

اس کے علاوہ نظم طباطبائی نے جن دیگر شعراء کی اتباع میں غزلیں لکھی ہیں ۔ ان میں قابل ذکر سودا، ناسخ، آتش، ظفر وغیرہ ہیں ۔ ان کے کلام کے مطالعہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے تہذیب کی شائستگی کو اہمیت دی ہے ۔ عشقیہ کلام کا کوئی شعر تہذیب کے حدود سے باہر نہیں جاتا ۔ ان کا محبوب خوش اطوار، شائستہ اور پارسا نظر آتا ہے ۔ جیسے ؎

وہ برہم ہو گئے زلفیں ذرا رخ سے جو سرکائیں ؎ خطا گر اور کچھ ہوتی نہیں معلوم کیا ہوتا

چنانچہ نظم طباطبائی نے اکثر محبوب سے مخاطبت میں احتیاط برتی ہے اور محبوب کے حسن کی تصویر کشی میں زیادہ تر تشبیہات سے کام لیا ہے ۔ اس

---

[1] "نظم طباطبائی" ڈاکٹر اشرف رفیع ص۳۵۹

کی جانب سے جو بھی رنج و غم سہنا پڑا۔ اس کے اظہار میں بھی انہوں نے تہذیب و متانت کو ملحوظ رکھا ہے ؎

میں نہ کہتا تھا گلشن میں نہیں جانی حضور ؛ نالۂ بلبل سے آخر درد جگر پیدا ہوا

نظم طبا طبائی کے کلام میں تصوف کی جھلکیاں بھی ملتی ہیں۔

نظم طبا طبائی نے لکھنؤ کی بربادی اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی۔ اس کے ماضی اور حال کی تہذیب کا نقشہ انہوں نے اپنی ایک غزل میں کھینچا ہے جس کے چند اشعار درج ہیں ؎

ڈھونڈتا ہے اب کسے لے کر چراغ آفتاب ؛ کیوں مٹایا اے فلک تونے نشان لکھنؤ

لکھنؤ جن سے عبارت تھی ہوئے وہ ناپدید ؛ ہے نشان لکھنؤ باقی نہ شان لکھنؤ

اب نظر آتا نہیں وہ جمع اہل کمال ؛ کھا گئے اُن کو زمین و آسمان لکھنؤ

حیدرآباد آنے کے بعد بھی نظم سے لکھنؤ کی محفلیں بھلائی نہ گئیں۔ ذیل کے اشعار اس کی ترجمانی کرتے ہیں ؎

وہ محفل ارباب صفا ہوگئی برہم ؛ ان لوگوں میں باقی ہے اب اک نظمِ حزیں اور

نظم طبا طبائی نے بنیادی طور پر شاعری کو اپنایا لیکن ان کا

اُردو نثر میں بھی قابل لحاظ کام موجود ہے ۔ ان کے تصانیف
میں قابل ذکر ذیل میں درج کیے جاتے ہیں :

(۱) تلخیص عروض خوانی (۲) شرح دیوان غالب (۳) شرح دیوان امرالقیس (۴) مسائنس (۵) اشعار انتخاب (۶) ادب الکاتب والشاعر (۷) اُردو میں علم کیمیائی اصطلاحات (۸) مالک الدولہ صولت (۹) مشا برج کے سبع ستارے (۱۰) شہاب الدولہ درخشاں (۱۱) اشر (۱۲) ایک وزن عروض کی تحقیق (۱۳) آفتاب سے خطاب (۱۴) محفل میں ناچ (۱۵) امراؤالقیس (۱۶) طرف شاعر عرب (۱۷) تاریخ طبری (ترجمہ)

نظم صاحب دیوان شاعر ہیں ۔ ان کا دیوان "دیوان طباطبائی" یعنی "صورت تغزل" کے نام سے ۱۹۳۳ء میں حیدرآباد سے شائع ہوا ۔ یہ دیوان ۳۲۲ صفحات پر مشتمل ہے ۔
نواب میر محبوب علی خاں آصف جاہ سادس کے دور کے اس شاعر و ادیب کے تعلق سے پروفیسر منصور حسین خاں اپنے ایک مضمون میں یا لکھتے ہیں :

"وہ عربی فارسی کے جید عالم اور اُردو شعر کے رمز شناس تھے اور انگریزی نظموں کے کامیاب ترین مترجم بھی۔ ایک طرف وہ روایت پسند غزل گو تھے تو دوسری جانب ایک انقلاب آفریں نظم گو شارح بھی" [1]

نظم طباطبائی نے ۱۸۹۹ء میں دیوانِ غالب کی شرح لکھی۔ اس سے قبل عبد العلی والہ مدراسی، شوکت میرٹھی اور عبد الواحد واحد فرزند والہ کی شرحیں شائع ہوئی تھیں۔ نظم نے ان تمام شرحوں کو سامنے رکھکر اپنی شرح ترتیب دی اور حق تو یہ ہے کہ کلامِ غالب کی تفہیم کا حق ادا کیا ہے۔ شرح میں نظم نے کلامِ غالب پر چند اعتراضات بھی کیے ہیں لیکن یہ سب کچھ "چھیڑ خوباں" کے تحت آتا ہے۔ نظم طباطبائی کی شرحِ کلامِ غالب کی آج بھی سب سے اعلیٰ اور بہتر شرح سمجھی جاتی ہے۔

---

[1] مضمون "تعارف" از پروفیسر مسعود حسین خاں (نظم طباطبائی) مصنفہ ڈاکٹر اشرف رفیع ص ۱۳،۱۴

صاحبزادہ نواب میر وزیر علی خاں وزیر

صاحبزادہ نواب میر وزیر علی خاں خانوادۂ آصفیہ
سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے والد نواب میر یار جنگ بہادر
تھے جو نواب اسکندر جاہ آصفجاہ ثالث کے پوتے تھے اور
نواب صمصام الملک کے فرزند تھے۔ نواب وزیر علی خاں
عام طور پر وزیر علی پاشاہ کے نام سے مشہور تھے۔ ان
کا تخلص وزیر تھا۔ ان کو میر احمد علی اثر سے شرف تلمذ
حاصل تھا۔ وزیر ۱۲۶۸ھ میں پیدا ہوئے اور ۲۲ شوال ۱۳۲۹ھ
کو وفات پائی۔ درگاہ حضرت برہنہ شاہ صاحب، بلدہ
حیدرآباد میں مدفون ہیں۔ نواب میر محبوب علی خاں آصفجاہ
سادس نے وزیر کو سرفراز جنگ، آصف الدولہ، آصف
یار الملک کے خطابات اور اعزازات سے نوازا تھا۔[1]
وزیر کی تعلیم اسی زمانے کی واحد درسگاہ دارالعلوم
میں ہوئی۔ انھیں عربی، فارسی میں ید طولیٰ حاصل تھا۔

---

[1] میکش، مضمون "صاحبزادہ میر وزیر علی" مشمولہ "مرقع سخن" جلد دوم ص ۱۵۵

علمی و ادبی محفلوں میں ان کو بڑی عزت حاصل تھی۔ شعراء دکن سے انھیں بے پناہ عقیدت تھی۔ وزیر نے اپنے قلمی دیوان کو "چمنستان سخن" کے نام سے منسوب کیا تھا۔ "مرقع سخن" جو ڈاکٹر محی الدین قادری کا مرتب کردہ ہے۔ اس میں شامل ایک مضمون کے مطابق وزیر کا یہ دیوان ۶۱۵ صفحات پر مشتمل ہے۔ [1]

وزیر کے کلام میں غزلوں کے علاوہ نظمیں اور رباعیات بھی ملتی ہیں۔ ان کی غزلوں میں بے پناہ پختگی سلاست، شوخی اور بلند خیالی نمایاں ہے۔ غزل کے چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں جس میں ان خصوصیات کی جھلک ملتی ہے۔

مجھ سوا خوار کو رکھتا ہے ہوا کے اوپر
کیا یہ دستور ہے فقروں میں اڑانا تیرا

آنکھ بھی عشق کی تھا حسن و جوانی پہ غرور
میری نظروں میں ہے وہ آنکھ لڑانا تیرا

---

[1] سکیش د مضمون) صاحبزادہ نواب میر وزیر علی خاں مشمولہ "مرقع سخن" جلد دوم ص ۱۵۵

رہبر کو اپنے ہاتھ سے رہزن بنالیا ؛ بیٹھے بٹھائے دوست کو دشمن بنالیا

شاہ دکن کے لیے ان کے دل میں جاں نثاری کے جذبات
موجود تھے - ذیل کے اشعار ان کے جذبات کی ترجمانی کرتے ہیں

اے شہنشاہ زمن کیوں نہ ثنا خواں ہو وزیر
حیدرآباد دکن کا ہے ترے سر سہرا

—

قیامت تک رہے نام نشاں سرکار عالی کا
زمیں سرکار کی ہو آسماں سرکار عالی کا

نواب میر محبوب علی خاں آصف سادس کی شادی
کے موقع پر وزیر نے ایک سہرا لکھا تھا اس کے چند
اشعار پیش ہیں :

دیکھوں سر پر ترے محبوب دلاور سہرا
عالم افروز و درخشندہ خوشتر سہرا
رشتہ تار شعاعی سے عجب حسن کے ساتھ
گوندھ کر لایا ہے خورشید منور سہرا

بزم عالم میں ہے ایک ایک بشر کے لب پر
ہو مبارک تجھے اے رشکِ سکندر سہرا

وزیر کو تاریخ گوئی میں بھی مہارت حاصل تھی
بعض تاریخوں میں برجستگی و بے ساختگی پائی جاتی ہے۔
انھوں نے کئی تاریخی قطعات کہے ہیں۔

وزیر نے رباعیاں بھی لکھی ہیں۔ اکثر رباعیاں
اولیاء اللہ اور بزرگان دین کی شان میں ملتی ہیں۔

وزیر کی نظموں میں جہاں نظام شاہ سے بے پناہ عقیدتمندانہ
جذبات کا اظہار ملتا ہے۔ وہیں مہاراجہ سرکشن
پرشاد سے مخلصانہ تعلقات بھی ظاہر ہوتے ہیں جیسے:

شاد کرتی ہے ہر اک دل کو وزارت شاد کی
دھوم ہے گلزار عالم میں مبارکباد کی
یہ خبر سن کر دل احباب شاداں ہو گئے
مستقل راجہ کشن پرشاد دلواں ہو گئے

وزیر نے ایسی کئی نظمیں لکھی ہیں جن میں حضور اکرم صلعم
اہل بیت اظہار اور کئی بزرگان دین کی مدح اور ان
سے عقیدت کا اظہار کیا گیا ہے۔ ان کی نعتوں میں سے
چند شعر بطور نمونہ پیش کئے جاتے ہیں :

نعت : ہے سینہ بے کینہ مرا کوئے محمد
ہر سانس سے آتی ہے بوئے مدینہ

مرثیہ : یوں رقم کیا ہم نے وصف داستان اہل بیت
لا بیاں کہتے ہیں جس کو ہے بیان اہل بیت

قصیدہ : نہ بھولیں گے کبھی ہم راہ حق کی
ہمارے رہنما ہیں غوث اعظم

منقبت : اسرار حق دیں کو اعجاز لب سخن کو
الہام غیب جانا گویا کلام خواجہ

وزیر کے دیوان میں مخمس بھی ملتے ہیں نمونہ
کے طور پر ایک مخمس کا ایک بند درج کیا جاتا ہے ۔

ہے نا قدروں کے ہاتھ میں فکرِ سخن عبث

ساقیٔ نو نہیں تو شراب کہن عبث

رونق فزا جو روح نہ ہووے یہ تن عبث

تکلیف باغ دیتا ہے بے گلبدن عبث

—

لہرا رہی ہے مجھکو ہوائے چمن عبث

—

ہ

عزیز جنگ ولا

عزیز جنگ ولا کا اصلی نام احمد عبدالعزیز اور
تخلص ولا تھا۔ آپ نوائط خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔
ولا کی ولادت ۱۲ ربیع الاول ۱۲۷۲ھ میں ضلع نیلور
میں ہوئی۔ آپ کے والد مولوی نظام الدین اور جد اعلیٰ
مولوی اویسی عربی الاصل نوائطی شافعی تھے۔

نواب سر سالار جنگ اول وزیر اعظم دکن
نے مولوی نظام الدین کو ضلع نیلور جو اس وقت مدراس
کے صوبہ میں تھا۔ وہاں سے حیدرآباد دکن لے آئے اور
عدالت کے نائب ناظم کے عہدہ پر فائز کیا۔ اس
زمانہ میں ولا کی عمر ۹ سال تھی۔ ولا کی تعلیم و تربیت
حیدرآباد میں ہوئی۔ ولا نے جناب حبیب ذکا نیلوری
جو مرزا غالب کے شاگرد تھے اور مولوی سید علی کامل
لکھنوی، معنیؔ، راقمؔ، افضل اور سنجر طہرانی سے درس
حاصل کیا۔ ولا کو فن عروض میں کمال حاصل تھا۔

قانون کی تدوین کے صلہ میں سلطنت آصفیہ نے انہیں
عزیز جنگ بہادر کا خطاب عطا کیا۔ اس کے علاوہ
وائسرائے ہند کی جانب سے انہیں مزید اعزازات ملے
علمی قابلیت کے صلہ میں شمس العلماء اور عوامی خدمات
کے صلہ میں خان بہادر کا اعزاز ملا۔ ولاؔ نے سررشتۂ عدالت
سے اپنی ملازمت کا آغاز کیا۔ کچھ عرصہ بعد سررشتہ مال
گزاری میں منتقل ہو گئے۔ آگے چل کر ولاؔ صدر محاسبی میں
اکونٹنٹ جنرل بھی مقرر ہوئے اور اس کے بعد محکمۂ مالگزاری
میں مددگار معتمد کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ ان کی قابلیت
کے مد نظر رکھ کر حکومت آصفیہ نے انہیں کلکٹر کے عہدہ
پر مامور کیا اور آپ بحیثیت کلکٹر وظیفہ حسن خدمت پر
سبکدوش ہوئے۔ آپ کی اولاد میں چار لڑکے ہیں جن
کے نام یہ ہیں: (۱) مولوی غازی الدین احمد (۲) محی الدین
احمد (۳) علی الدین احمد (۴) رکن الدین احمد۔ [1]

---

[1] عزیز جنگ ولا "تاریخ نوائط" جلد اول ص ۱۲۱

سلطنت آصفیہ کے ایک قادر الکلام شاعر اور صاحب طرز ادیب گزرے ہیں۔ انہوں نے مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی۔ حضور اکرمؐ کے سراپا مبارک فارسی اور اردو میں تحریر کئے۔ اردو سراپائے مبارک میں جو اشعار پیش کئے ہیں ان میں نادر تشبیہات و استعارات کثرت سے ملتے ہیں۔

وقار الملک مشتاق حسین کی وفات پر ولاؔ نے جو مرثیہ لکھا ہے وہ بھی کافی جگر سوز درد انگیز ہے۔ اس کے مطالعہ سے ان کے قومی وعلمی ملی درد کا اندازہ ہوتا ہے۔

وہ کہتے ہیں ؎

مٹایا اے فلک جن جن کو تو نے اہل دانش کو
ہمیشہ خانہ بربادی ہے داخل تیری عادت میں
نہ سر سید رہے باقی نہ محسن قوم کا مہدی
نذیر احمد پڑے سوئے ہیں تنہا اپنی تربت میں

ولاؔ کے کلام میں بے شمار بلند پایہ اشعار پائے جاتے

ہیں۔ جس میں حسن و عشق کے مکالمات دلچسپ انداز
میں ملتا ہے۔ ایسے اشعار کی بھی ان کے کلام میں کمی
نہیں۔ جس میں حسرت و یاس اور قنوطی خیالات
پائے جاتے ہیں۔ ذیل میں ان خصوصیات کے شعر
درج کئے جاتے ہیں۔

سمجھ کر رہا فراق میں اس کے دل حزیں؟ شب ہی میں سو گئے تھے چراغ سحر سے ہم
ہم رو رہے تھے بزم میں جب چل رہا تھا دور؟ اشکوں کو دل نے بادۂ احمر بنا دیا
غم سے بھر آئی آنکھ تو پینے لگے ہم اشک؟ ضبط الم نے آنکھ کو ساغر بنا دیا[1]

مومن کی مشہور غزل "تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو" کی زمین میں
ولا نے ایک غزل کہی تھی۔ جس میں حسن و عشق کے مکالمے
نہایت دلکش پیرائے میں پیش کئے ہیں۔ وہ شعر ملاحظہ ہوں[2]

سوا ذکر وعدۂ وصل کا تو کہا کریا دنہیں ذرا
میں کبھی نہ چھوڑونگا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

حیدرآباد دکن ولا کو بے پناہ محبت و عقیدت تھی جس

---

[1] نصیرالدین ہاشمی "دکن میں اردو" نئی دہلی ۱۹۷۸ء ص ۵۷۹

کا اظہار وہ بڑے فخر سے کیا کرتے تھے ذیل کے اشعار میں اس جذبہ کی ترجمانی ملاحظہ فرمائیے ؎

دلی سے کچھ غرض نہ ہمیں لکھنؤ سے کام ٪ ملک دکن ولاؔ ہے وطن اپنے یار کا
گو لکھنؤ کی سیر میں محو سرور ہیں ٪ رہ رہ کے مجھ کو آتی ہے اپنے دکن کی یاد

ولاؔ شاعر کے علاوہ بہت بڑے نثر نگار تھے۔ ان کے نثری و شعری تصانیف کی کافی طویل فہرست ہے۔ ولاؔ اگر شاعر نہ بھی ہوتے تو ان کی نثری خدمات اس قدر وسیع ہیں کہ اردو ادب میں جب بھی تاریخ لکھی جائے گی ان کے کارناموں کا سنہری الفاظ میں ذکر کیا جائے گا۔ ذیل میں ان کی تصانیف کے نام درج کئے جاتے ہیں۔

(۱) منتخب الہام (۲) خزینہ (۳) عمدۃ القوانین (۴) اعظم العملیات (۵) تاریخ عزیزہ (۶) آصف اللغات (فارسی) (۷) کلیات نظم ولاؔ (۸) تاریخ نوائط (۹) مجموعہ احکام مال (۱۰) قوانین مالگزاری (۱۱) شرح قانون مال (۱۲) شیرازہ دفاتر (۱۳) محبوب السیر (۱۴) عطیات سلطانی (۱۵) سیرت دکن (۱۶) ترکاری کی کاشت (۱۷) کاشت انگور (۱۸) غرائب الجمل (۱۹) مصطلحات دکن (۲۰) التانیث والتذکرہ (۲۱) معیار فصاحت (۲۲) فارسی کلیات (۲۳) اردو کلیات۔ وغیرہ۔

محمد امداد حسین عازم

آپ کا نام محمد امداد حسین اور تخلص عازم تھا۔ آپ کی ولادت ۱۲۸۱ھ م ۱۸۶۴ء اورنگ آباد میں ہوئی۔ آپ کے جد اعلیٰ محمد اکبر حسین شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے ہمرکاب تھے۔ جب اورنگ زیب اورنگ آباد تشریف لائے، اُس وقت عازم کے جدِ اعلیٰ دہلی سے اورنگ آباد منتقل ہو گئے۔ پھر یہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ جناب عازم کے والد محمد شریف الحسن سلطنت آصفیہ میں فوج کے ملازم تھے۔ جناب عازم کی پرورش والد بزرگوار ہی کی نگرانی میں ہوئی۔ جناب عازم کے والد عہد محبوبیہ میں جب حیدرآباد منتقل ہو گئے۔ اس وقت عازم کی بھی سکونت مستقل طور پر حیدرآباد میں ہو گئی۔

جناب عازم کو ان کے والد نے بچپن ہی سے اچھی تعلیم دلوائی اور قابل صورت بنا کر منتقل کیا۔ یہاں عازم نے محکمۂ پولیس میں ملازمت اختیار کی اور اسی محکمہ سے وظیفہ حاصل کیا۔ والد کی وجاہت کی وجہ سے عازم کا بھی شمار امراء میں ہونے لگا۔ چنانچہ امراء کے بچوں کی

طرح اپنے لڑکے ولایت حسین کو مدرسہ اعزہ میں تعلیم دلوائی۔ اس زمانے میں صرف امراء کے بچوں ہی کو مدرسۂ اعزہ میں تعلیم حاصل کرنے کا حق تھا۔ عاؔزم نے (۶۰) سال کی عمر میں ۱۳۳۹ھ میں وفات پائی۔ [1]

عاؔزم کو شاعری کا شوق شروع ہی سے تھا۔ حیدرآباد منتقل ہونے کے بعد انہوں نے باضابطہ شاعری شروع کی۔ وہ اپنا کلام مرزا قربان علی بیگ سالک دہلوی تلمیذ غالب کو بغرض اصلاح دکھاتے تھے۔ عاؔزم نے شاعری کی تمام اصناف میں طبع آزمائی کی۔ ان کا کلام نہایت معیاری ہوتا ہے۔ زبان کی بندش، جملوں کا استعمال اور اشعار کی ترتیب کوئی ان سے سیکھے۔ ان کے کلام کا ایک قلمی نسخہ کتب خانۂ آصفیہ میں محفوظ ہے۔ جس میں تمام اصناف ملتے ہیں۔ نمونہ کے طور پر چند اشعار درج کیے جاتے ہیں

ناصح تو ہم سے باعث خود رفتگی نہ پوچھ ؛ کیا جانے دیکھ آئے ہیں اس انجمن میں کیا
اللہ بخشے پوچھ نہ عاؔزم کی لاغری ؛ احباب کہہ رہے ہیں دھرا ہے کفن میں کیا
غش آ گیا کبھی کبھی سنبھلا کبھی گرا ؛ حالات کچھ عجیب ترے خستہ جاں کے ہیں
سر پہ کفن ہے ہاتھوں میں خنجر ہے خون کا ؛ عاؔزم کہو تو آج ارادے کدھر کے ہیں

---

[1] غلام صمدانی گوہر "تذکرۂ محبوبیہ" جلد دوم "شعرائے نازکتاں" ص ۱۱۵

صاحبزادہ عالمگیر محمد خاں عالم

آپ کا نام عالمگیر محمد خاں اور تخلص عالم تھا۔ خاندان کا سلسلہ نسب نواب صاحب آف جاورہ سے ملتا ہے۔ اس لیے اپنے نام سے پہلے صاحبزادہ لکھا کرتے تھے۔ عالم کی پیدائش ۱۳۸۵ھ میں جاورہ میں ہوئی۔ ان کے والد نیاز محمد خاں ریاست جاورہ میں فوج کے کپتان تھے۔ جاورہ، ریاست مالوہ کا مشہور شہر ہے۔ جناب عالم کی تعلیم شہر جاورہ میں ہوئی۔ نوجوانی کی عمر میں تلاش معاش کے لیے حیدرآباد منتقل ہوئے۔ "عہد محبوبیہ" میں محکمۂ پولس میں ملازمت اختیار کی اور وہیں سے وظیفہ پر علحدہ ہوئے۔ آپ کی وفات ۱۳۳۰ھ میں ہوئی۔ [1]

جناب عالم کو شاعری کا شوق بچپن سے تھا۔ عربی، فارسی اور اردو میں مہارت رکھنے کے سبب بہت جلد ایک قادر الکلام شاعر بن گئے۔ وہ اپنے کلام پر جناب حبیب کنتوری سے اصلاح حاصل کرتے تھے۔ عالم نے شاعری کی ہر صنف میں طبع آزمائی کی ہے۔ ان کے یہاں قصیدہ، غزل، رباعی، قطعات، مرثیہ اور حمد و نعت ملتے ہیں۔

---

[1] غلام صمدانی خاں گوہر، تزک محبوبیہ جلد دوم۔ لمعۂ شعرا حیدرآباد۔ ۱۳۱۹ھ

جناب عالم ایک پر گو شاعر اور محقق تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی میں ایک دیوان مرتب کیا جو "مذاق عشق" کے نام سے شائع ہوا تھا مگر اب دستیاب نہیں ہے اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے عہد کے شعراء میں بہت بلند مقام حاصل کیا تھا۔ جناب عالم نے جس ماحول میں پرورش پائی وہ شاہی ٹھاٹ باٹ کا زمانہ تھا۔ جس کی وجہ سے ان کے کلام میں یہ اثر نمایاں ملتا ہے۔

بطور نمونہ یہاں چند شعر درج کیے جاتے ہیں۔

ڈوب کر دل مرا کہاں نکلا ؎ ابھی یاں تھا ابھی وہاں نکلا
انگلیاں دو طرفے اٹھنے لگیں وہ آتے ہیں ؎ میں جو عالم طرفِ کوچۂ دلبر نکلا

صاحبزادہ عالم کے کلام میں شوکتِ الفاظ اور دروبست کا بڑا اہتمام ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ان کے اشعار کا مطلب صاف صاف سمجھ میں آجاتا ہے۔ اس بیان کی تائید میں

چند شعر درج کئے جاتے ہیں

دیکھئے جان ابھی دے دوں گا ! اٹھ کے پہلو سے اگر جایئے گا

قتل میں میرے اگر کی جلدی ! ملیئے گا ہاتھوں کو پچھتایئے گا

جناب عالم کے کلام میں شوخی و معاملت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے - چند شعر ملاحظہ ہوں .

جو عضو تجھ کو دیا بس وہ مثال دیا
خدا نے نور کے سانچے میں جسم ڈھال دیا
خدا نے یار کو کیا حسن کیا جمال دیا
دہان غنچہ دیا دیدۂ غزال دیا
ملی تمام کالبا وقت بدن میں جب عالم
خدا کے ہاتھ نے کوہ بلا کو ٹال دیا

عظمت اللہ خاں عظمت

آپ کا نام عظمت اللہ خاں اور تخلص عظمت تھا۔

آپ کی ولادت ۱۸۸۲ء میں دہلی میں ہوئی۔ ابھی آپ پانچ سال کے تھے کہ آپ کے والد نعمت اللہ خاں کا انتقال ہو گیا۔ جناب عظمت اللہ اپنی والدہ کے ساتھ ۱۸۸۲ء میں حیدر آباد منتقل ہو گئے۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم والدہ کی نگرانی میں حاصل کی بعد میں علی گڑھ یونیورسٹی سے بی۔ اے کامیاب کیا اور "عہد محبوبیہ" میں حیدر آباد آکر مددگار ناظم تعلیمات کی خدمت پر مامور ہو گئے۔ عالم جوانی میں عظمت مرض دق میں مبتلا ہو گئے اور ماہ ربیع الاول ۱۳۴۶ھ م ۱۹۲۷ء میں انتقال کر گئے۔[1]

جناب عظمت اپنی کم عمری ہی سے شعر و شاعری سے دلچسپی رکھتے تھے۔ ان کی مختصر زندگی میں انہوں نے جو بھی لکھا ہے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ انہوں نے

---

[1] نصیر الدین ہاشمی، دکن میں اردو، دہلی ۱۹۸۹ء ص ۶۱۳

اُردو شاعری میں قدیم ہندی بحروں کا استعمال کیا ہے

ان کے گیتوں کا مجموعہ "سریلے بول" کے نام سے
شائع ہوا۔ جس میں اُردو اور ہندی بحروں کے امتزاج سے
لکھی ہوئی نظمیں ملتی ہیں۔ نمونے کے طور پر ان کی ایک مشہور
نظم کا ایک بند درج کیا جاتا ہے۔

مجھے بیت کا یاں کوئی پھل نہ ملا ٭ مرے جی کو یہ آگ لگا سی گئی
مجھے عیش کا یاں کوئی پل نہ ملا ٭ مرے جی کو یہ آگ جلا سی گئی

عظمت عالم نوجوانی میں اس دنیا سے گزر گئے۔ ذیل
کے اشعار ان کی زندگی کے ابتدائی دور کی ترجمانی کرتے ہیں۔

مرے تایا بڑے تھے زمانہ شناس ٭ بڑے اونچے گھرانے میں پڑے ایام
گیا ٹوٹ سا جی گئی ٹوٹ سی آس ٭ مری جاہ کا ہو گیا کام تمام

مرحوم کی نظمیں گو تعداد میں مختصر ہیں مگر اپنی خوبیوں
کے لحاظ سے گراں قدر ہیں۔

سندر صورت سندر ہی ہے رنگت گوری یا کالی

—

آندھرا دیس کی سندر تیری کالی کومل سی کالی

بال بھی کالے گھنگور گھٹا

ہونٹ وہ گدرے جامن کے سے اور اداھت میں لالی

دانت وہ اجلے موتی کی جلا ۱؎

—

عظمت اللہ خاں نے اُردو میں ہیئت کے تجربوں کی جانب اپنے ہم عصر شعراء کو متوجہ کیا۔ بیسویں صدی کی ابتداء میں غزل کو معتوب قرار دینے والوں میں عظمت اللہ خاں بھی ایک تھے۔ جوشؔ نے عظمت ہی سے اثر قبول کرتے ہوئے غزل کی گردن مار ڈالنے کی بات کی تھی۔ بہرحال عظمت کا یہ کاسیہ کارنامہ آج بھی اُردو شاعری میں اہم موڑ کی حیثیت سے یاد کیا جاتا ہے کہ انہوں نے مروجہ ہیئتوں میں تبدیلی لائی اور اُردو گیتوں کو ہندی پنگل سے آشنا کیا۔

۱؎ نصیر الدین ہاشمی "دکن میں اُردو" دہلی ۱۹۸۵ء ص ۶۱۵

حضرت میر امداد علی علویؔ

آپ کا نام میر امداد علی اور تخلص علوی تھا۔ ۱۲۵۵ھ م ۱۸۳۹ء بمقام تھانہ بھون ضلع مظفر نگر اتر پردیش میں پیدا ہوئے۔ اسی گاؤں کے مولانا اشرف علی تھانوی بھی مشہور عالم دین گزرے ہیں۔ حضرت علویؔ کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہی مکمل ہوئی چونکہ ان کا تعلق مذہبی گھرانے سے تھا۔ اس لیے قرآن شریف ختم کرنے کے بعد آپ کے والد میر نجابت علی علوی نے اپنے فرزند کو پیر طریقت کی تعلیم دی۔ بچپن ہی سے حضرت علویؔ کی عادات و اطوار میں بزرگی کے آثار نمایاں تھے۔ روایت ہے کہ ایام طفلی ہی میں خرق عادات اور کرامات آپ سے سرزد ہوئی ہیں۔ [1]

علوی نے دیگر علوم کے ساتھ ساتھ اردو زبان میں بھی کما حقہٗ قابلیت پیدا کی۔ ۱۸۵۷ء کی غدر کی آگ تھانہ بھون میں بھی آ پہنچی۔ علوی بھی اس سے متاثر ہوئے اور تھانہ بھون چھوڑ کر یہاں سے چودہ میل دور تحصیل کے صدر مقام پر رہائش اختیار کی۔ اس دوران آپ کی ملاقات بزرگ کامل مولانا ظہور الحق

۱؎ غلام صمدانی خاں گوہر "تزک محبوبیہ" جلد دوم ص ۲۳

سے ہوئی ۔ علوی آپ کے حلقۂ شاگردی میں شامل ہو گئے اور
ان کی خدمت میں رہنے لگے ۔ مگر یہاں سے آپ کو تلاش
معاش کے سلسلہ میں شہر میرٹھ جانا پڑا اور وہاں انہیں ایک
فوجی ٹھیکہ دار کے یہاں حسابات لکھنے کی نوکری ملی ۔ کچھ
عرصہ بعد آپ کو محکمہ سرکاری ورکشاپ میں سررشتہ داری
کی ملازمت مل گئی ۔ علوی پانچ سال بعد سرکاری ملازمت
ترک کردی اور اپنے ایک دوست کے ساتھ حیدرآباد کا
قصد کیا اور حیدرآباد میں محلہ تکیہ خان میں سکونت اختیار
کی ۔ آپ حیدرآباد میں حضرت مرزا سردار بیگ صاحب
کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہی کی ایما پر حافظ
مولوی شجاع الدین صاحب قبلہ کے ہاتھ بیعت کی اور
ذکر و اشغال میں مصروف ہو گئے اسی دوران علوی کی سر
سالار جنگ سے ملاقات ہوئی ۔ سالار جنگ نے
ان کو دارالعلوم میں ملازمت دلوائی جو اس وقت
کی سب سے بڑی علمی درسگاہ تھی مگر یہ سلسلہ کبھی

ادھورا رہ گیا کیونکہ علوی نے کچھ عرصہ بعد ملازمت ترک
کردی اور دوبارہ ذکر و اشغال میں مصروف ہو گئے۔
آخر دم تک کہیں ملازمت نہیں کی۔

علوی ایک نیک دل پرہیزگار پابند صوم الصلوٰۃ
صوفی تھے۔ آپ کا وصال ۱۱ محرم الحرام ۱۳۱۹ھ میں
حقیقت و عرفان کا یہ آفتاب غروب ہو گیا اور احاطہ
گنبد سردار بیگ صاحب قبلہ جنوب مغربی سمت آپ
کا مزار ہے۔

علوی نہ صرف مرشد تھے بلکہ شاعر و ادیب بھی تھے
آپ کے کئی نثری تصنیفات ملتی ہیں جو زیادہ تر مذہبی
موضوعات پر مبنی ہیں۔ جیسے انوارِ محمدؐ، سر السلوک،
عقائدِ صوفیہ، معیار السماع، ضمِ وحدت وغیرہ۔ آپ
کی تصانیف کے کئی قلمی نسخے کتب خانۂ آصفیہ میں محفوظ ہیں۔
دیوانِ علوی، کنزِ علوی، عقد اللآلی، دیوانِ سوزِ علوی
دیوانِ رنگ رنگیلا، مسدسات و مخمسات، واسوخت
دیوانِ محلِ علوی، دیوانِ حقائقِ علوی وغیرہ (قلمی)

موجود ہیں۔ علوی کی شاعری کو ہم دو ادوار میں آسانی سے تقسیم کر سکتے ہیں۔ جب آپ عالم شباب میں تھے، اس وقت کی شاعری میں ظاہری عشق اور غزل کا رنگ ملتا ہے اور بعد کے کلام میں صرف عشق مجازی سے زیادہ عشق حقیقی نمایاں نظر آتا ہے۔ غزل کے چند اشعار ملاحظہ فرمایئے ؎

جبکہ مدت اب شباب کی آئی ؛ آتش شوق خود بخود بھڑکی

حق نے بخشا تھا جو کہ ذہن رسا ؛ اور عنایت کیا تھا فہم رسا

حضرت علوی کی شاعری میں مثنویات کی ایک کثیر تعداد ملتی ہے۔ جیسے مثنوی عبرت، مثنوی نعمت الربا، مثنوی برزخ حقیقت، مثنوی دہ بزم ماتم، مثنوی مجموعۂ الواع نجم وغیرہ۔ ان مثنویوں کے قلمی نسخے کتب خانۂ سالار جنگ میں محفوظ ہیں۔ اس کے علاوہ علوی کی شاعری میں مسدس کی بھی کثیر تعداد ملتی ہے۔ جیسے مسدس شغل العجوز۔

حضرت علوی کا یہ عظیم الشان ذخیرۂ اردو اور فارسی دونوں زبانوں پر محیط ہے جو سات جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ حضرت علوی نے ہر صنف سخن پر زور قلم آزمایا ہے۔ آپ کے دواوین میں ہم کو حمد و ثناء، نعت شریف، منقبت، رباعیات، قطعات، دوہے، مرثیہ، ٹھمریاں وغیرہ ملتی ہیں [1] نمونہ کے طور پر مستزاد کے چند شعر درج کیے جاتے ہیں۔

اس عشق نے کیا کیا نہ مجھے ناچ نچایا مجبور سمجھ کر
اور بوجھ امانت کا میرے سر پہ اٹھایا مزدور سمجھ کر
سوتا تھا میں آرام سے اک شور مچایا سوتے کو جگایا
اس ہستی موہوم میں پھر لا کے بٹھایا معذور سمجھ کر
کہہ دے کے خلافت میرا اعزاز بڑھایا گھر خلد بنایا [2]

حضرت علوی کا ہندی کلام اردو رسم الخط میں

من کے بیچ سمایا رے داتا بن کے بیچ سمایا رے
جل درپن میں چھایا رے داتا بن کے بیچ سمایا رے
داتا بن کے بیچ سمایا رے [3]

---

[1] م۔ ع۔ علوی "سید ابو احمد علی علوی" حیدرآباد ص۳
[2]، [3] "دیوان حقائق علوی" (قلمی نسخہ) کتب خانہ آصفیہ محفوظ

غزل کے کچھ اور اشعار :

گرچہ ہے ذوالجلال کا بندہ
آدمی ہے خیال کا بندہ
کیسا ماضی کہاں کا استقبال
بندہ رہتا ہے حال کا بندہ

عثمانیہ یونیورسٹی کی اسکالر رشید النساء بیگم نے
"علوی حیات اور کارنامے" پر ایم۔اے کے لیے مقالہ پروفیسر
رفیعہ سلطانہ کی نگرانی میں مکمل کیا جو کہ شعبۂ اردو عثمانیہ
یونیورسٹی کی لائبریری میں محفوظ ہے ۔

۵

فیاض الدین خان فیاض

آپ کا نام فیاض الدین خان تخلص فیاض اور خطاب مشرف جنگ تھا۔ فیاض ۱۲۵۰ھ میں بمقام حیدرآباد تولد ہوئے۔ آپ کے والد نواب محمد عزیز الدین خان کے جد امجد سلطان الدین خان پیشوا پونا تھے۔ اپنے وقت کے آصفجاہ اول کے ہمرکاب تھے[1]۔ فیاض نے تعلیم و تربیت اپنے والد کی سرپرستی میں حاصل کی۔ اپنے وقت کے مشہور اساتذہ سے استفادۂ علم کیا۔ عربی، فارسی اور انگریزی میں مہارت حاصل کی۔ فیاض کا خاندان والد کی طرف سے دربار پونہ کی پیشوان (وزیر اعظم) تک جاتا ہے اور والدہ کی طرف سے ٹیپو سلطان سے ملتا ہے۔ اسی وجہ آپ کی رگوں میں ایک طرف حکمراں خون ہے تو دوسری طرف فوجی افسر کا دل رکھنے والے خاندان کا سلسلہ ہے۔ نواب فیاض کبھی علم پرور۔ حق گو۔ آزاد منش اور علم و ادب

۱؎ سید ابوالفضل مضمون "مشرف جنگ فیاض" از مرقع سخن جلد اول ۱۹۳۵ء ص ۲۰۰

کے شیدا تھے۔ انہوں نے شعر و شاعری میں مہارت حاصل کی۔ ابتداء میں انہوں نے اول مددگار معتمد صرفخاص پیشی میں ملازمت کی۔[1] نواب آصفجاہ سادس نے انہیں ۱۳۱۶ھ میں مشرف جنگ بہادر کے خطاب سے نوازا۔ آپ کی اولاد میں نواب عزیز یار جنگ عزیز، محمد کریم الدین خاں اور محمد رحیم الدین خاں ہیں۔ فیاض ۱۳۲۸ھ میں (۷۸) برس کی عمر میں انتقال کر گئے۔

فیاض حضرت فیض کے شاگرد تھے۔ وہ حضرت فیض کی بڑی قدر کرتے تھے۔ حضرت فیض کے خاص شاگردوں میں فیاض کا مقام بلند تھا۔ فیاض ان کی شاگردی پر فخر کرتے تھے۔ حضرت فیض کے تلامذہ میں فراج، عصر اور یاس کے بعد فیاض ہیں جن کے ساتھ ہمیشہ محفل شعر منعقد ہوا کرتی تھی۔

۱۔ غلام صمدانی خاں گوہر: "تزک محبوبیہ" جلد دوم دفتر اول حیدرآباد ۱۳۱۹ھ ص ۷۴۷
۲

فیاضؔ کی زندگی تکلفات سے بری تھی۔ وہ سیدھی سادی زندگی پسند کرتے تھے۔ بزرگان دین سے بے حد لگاؤ تھا۔ وضعداری کی جو شان انہوں نے ابتدا سے اختیار کی تھی، اُسے آخر وقت تک باقی رکھا۔ فیاضؔ کے دل میں ہمیشہ سچی لگن اور اخلاص و محبت کا دریا موجزن تھا۔ ان کی عنایات و نوازشات کا سلسلہ طبقۂ شعراء تک محدود نہیں تھا بلکہ سرکاری، خانگی اور اپنے ماتحت عہدہ داروں سے لے کر ملازمین تک سرپرستی کرتے تھے۔ فیاضؔ نے اپنے ہمعصر شعراء کی یاد تازہ کرتے ہوئے اپنے اشعار میں ان کا ذکر کیا ہے جیسے میر احمد علی قاضیؔ، مطلبؔ، میر قاسم علی بیگ اور اخگر وغیرہ۔ کہتے ہیں[۱] ؎

عمرؔ و فراغؔ و قاضیؔ و مطلبؔ کہاں ہیں اب
تھے بزمِ فیضؔ میں یہی دو چار خاص خاص

۱؎ سید عباس متقی "قاضی احمد علی قاضی" مقالہ ایم فل حیدرآباد ۱۹۸۸ء ص ۵۹

حضرت فیضؔ کے انتقال کے بعد جناب فیاضؔ
نے ان کی تقاریب عرس کی ذمہ داری قبول کی۔
وہ ہر سال پابندی سے عرس کے موقع پر مشاعرہ
منعقد کرتے تھے۔

شاعری کے علاوہ فیاضؔ نے نثر نگاری میں
بھی زور قلم آزمایا ہے۔ وہ علم حساب کے زبردست
ماہر تھے۔ چنانچہ طالب علموں کی سہولت کے لئے انہوں
نے چار کتابیں علم ریاضی سے متعلق تحریر فرمائیں:

(۱) قواعد کلیہ (۲) غرائب حسابی (۳) قطاع
(۴) تشریح المساحت

یہ کتابیں شائع ہوئیں۔ ہر کتاب تقریباً اسی صفحات
پر مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے "کنز اللطائف"
نام کی ایک کتاب بچوں کے لیے لکھی۔ علاوہ ازیں
انہوں نے عمر خیام کی رباعیات کو اُردو میں منتقل
کر کے ۱۳۱۱ھ میں شائع کیا۔ ان کے اُردو

دیوان کا ایک قلمی نسخہ (۳۲۰) صفحات پر مشتمل ہے۔ ان کے فرزند نواب عزیز یار جنگ عزیز کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔ جس میں غزلوں کے علاوہ مخمسات، قطعات اور موقتی نظمیں وغیرہ شامل ہیں۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:

بات رہ جاتی ہے دن رہتے نہیں ؛؛ تم نہ آؤ گے تو کیا ہو جائے گا

اگر رفعت پذیر اپنا غبار ناتواں ہوتا ؛؛ زمیں ہوتی فلک میرا قدم پیچھے آسماں ہوتا

دور مسجد سے تو میخانہ ہے پاس اے فیاض
شغل کچھ تو بھی خالی نہیں رہنا بہتر

رعایت لفظی کی مثالیں بھی ان کے کلام میں جا بجا ملتی ہیں:

اے بتو ایسی عمارت ہے کہاں ؛؛ کعبۂ دل کو نہ ڈھایا ہوتا

حال دل کا کہا نہیں جاتا ؛؛ آہ چپ بھی رہا نہیں جاتا

ہو سکے جس سے مسیحا کا علاج ؛؛ درد فرقت نہیں ایسا ہوتا

حضرت داغ کے انتقال پر جناب فیاض نے قطعۂ تاریخ وفات لکھی جو اس زمانے میں عام و خاص میں بہت مشہور و معروف ہوئی تھی:

ہائے لطف شاعری جاتا رہا [1]
۱۳۲۲ ھ

---

[1] سید ابو الفضل معنون شمولہ "مرقع سخن" جلد اول حیدر آباد ۱۹۳۵ء ص ۲۱۴

سید رضی الدین حسن کیفی

آپ کا نام سید رضی الدین اور تخلص کیفی۔ آپ کی ولادت ۱۲۹۷ھ میں حیدرآباد میں ہوئی۔ آپ سادات گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ جناب کیفی کے والد سید نظام الدین حسن ایک صاحب دل صوفی تھے۔ آپ کے نانا ڈاکٹر حکیم سید محمد خاندان باربہہ سے تعلق رکھتے تھے۔ کیفی نے ابتدائی تعلیم اپنے والد مولوی عبدالجلیل نعمانی سے حاصل کی۔ اس کے بعد دارالعلوم میں داخلہ لیا پھر پنجاب یونیورسٹی سے منشی کا امتحان کامیاب کیا۔ اس کے علاوہ آپ نے حضرت الٰہی بخش اور مولوی قادر محی الدین اور علامہ ابوبکر ابن شہاب اور مولانا عبدالقدیر صدیقی حسرت سے بھی علوم و فنون متداولہ عرفان کی تعلیم حاصل کی۔ ان اساتذہ کے بعد کیفی نے کسی سے مشورہ سخن حاصل نہیں کیا۔ طبیعت میں تلون مزاجی [?] تھی لیکن شاعرانہ صلاحیت بڑی اعلیٰ درجہ کی تھی [1]

کیفی طالب علمی کے زمانے سے شعر کہتے تھے۔ حیدرآباد کے ہر بڑے مشاعرہ میں شرکت کرتے اور

---

[1] ڈاکٹر زور مضمون مشمولہ "مرقع سخن" جلد اول حیدرآباد ۱۹۳۵ء ص ۲۵۹

مشاعرہ لوٹ لیتے تھے۔ طبیعت میں شوخی اور شرارت تھی۔
اس طرح محفل میں اپنا رنگ جما لیتے تھے۔ آہستہ آہستہ
سارے ہندوستان میں کیفی نے شہرت حاصل کرلی۔ حضرت
منیف اور میکش تھانوی کے سالانہ مشاعروں میں کیفی
اپنا کلام سنا کر کافی داد حاصل کرتے۔ کیفی کے تعلق سے
شمشاد علی گوہر مصنف "سخنوران دکن" لکھتے ہیں :

"آج سے پندرہ سال پہلے حیدرآباد میں صرف
دو ہی شاعر تھے ایک توفیق دوسرے کیفی۔ اگر
توفیق اپنے وقت کے میر تھے تو کیفی سودا۔
دونوں کے کلام میں بھی ایسا ہی رنگ تھا
جیسا میر اور سودا کے کلام میں ہے۔" [1]

ڈاکٹر عقیل ہاشمی نے اپنی تصنیف "سید محمد افتخار علی
شاہ وطن" میں غالب اور کیفی کا تقابل پیش کیا اور
دونوں کے اشعار ساتھ ساتھ درج کئے ہیں۔ دو شعر
بطور نمونہ لکھے جاتے ہیں۔

---

[1] صمصام شیدا رزمی "سخنوران دکن" حیدرآباد ۱۹۶۵ء ص ۳۱

غالبؔ : کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالبؔ ؛ شرم تم کو مگر نہیں آتی

کیفیؔ : یہ مستی اور اس پیری میں حضرت کیفیؔ ؛ بھلے مانس اسی پر دعویٰ اسلام کرتے ہیں

غرض یہ اور اسی انداز کے کئی ایک شعر حضرت کیفیؔ کے کلام میں ملتے ہیں ؎

نظم کی یہ نظم ہے تاریخ کی تاریخ ؛ واقعات و شاعری کا کچھ ہے کچھ اب لباب

داد اپنی شاعری کی آپ ہی دیتا ہوں

جس طرح سے آفتاب آمد دلیل آفتاب [1]

۵

---

[1] صمصام شیرازی "سخنورانِ دکن" حیدرآباد ۱۹۶۵ء، ص ۱۲۱

ڈاکٹر احمد حسین مائل

آپ کا نام اصلی احمد حسین اور تخلص مائل تھا۔ ان کی پیدائش ۱۲۷۷ھ میں مدراس میں ہوئی۔ مائل اپنے والد کے ساتھ حیدرآباد تشریف لائے۔ ان کے والد حاجی محمد حسن رضا صرفخاص میں سرمنشی تھے۔ مائل کا خاندانی سلسلہ شمالی ہند میں قاضیاں گوپاموسے اور ننھیال مدراس کے والاجاہی خاندان سے ملتا ہے۔ مائل کی ابتدائی تعلیم اپنے سرپرست کی نگرانی میں ہوئی۔ انہوں نے انگریزی کے علاوہ سائنسی علوم میں بھی مہارت حاصل کی۔ انٹر کامیاب کرنے کے بعد مدرسہ طبابت میں ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کی اور ۱۲۹۲ھ میں ڈاکٹری کی ڈگری لی۔ الوپیتھک کے علاوہ مائل طب یونانی اور ہومیوپیتھک سے بھی واقف تھے[۱]۔ محکمۂ طبابت میں ملازمت شروع کی اور ممالک آصفیہ کے ہر ضلع میں ان کا تبادلہ ہوتا گیا۔ آخر میں وظیفہ سے تین سال قبل ~~[illegible]~~ حیدرآباد میں سکونت اختیار کی۔ پھر تا حیات یہیں مقیم رہے۔ مائل غریب مریضوں

۱؎ نصیر الدین ہاشمی "دکن میں اردو" دہلی ۱۹۷۹ء ص ۵۶۱

کو بمبئی سے دوا منگوا کر مفت دیا کرتے تھے۔ نہایت
نیک شریف النفس ڈاکٹر تھے۔ وظیفہ حاصل کرنے کے بعد
انہوں نے حضرت آغا داؤد صاحب سے بیعت حاصل کی۔
اور اکثر اوقات ذکر و اذکار کی محفلوں میں بیٹھ جاتے اور
مراقبہ میں کبھی دن گزارتے۔ حیدرآباد میں انہوں نے اپنے
پیر و مرشد کی درگاہ کے قریب آغا پورہ کے ایک مکان
میں سکونت حاصل کی۔ کچھ عرصہ بعد فالج میں مبتلا
ہو گئے اور تقریباً دو سال بیمار رہنے کے بعد ۲۹ رمضان
۱۳۴۲ھ کو وفات پائی اور اپنے مرشد کی درگاہ
کے قریب مدفون ہیں۔ آپ کے دو فرزند تھے۔ ایک
مبارک احمد فاروقی اور دوسرے جمال احمد فاروقی۔

شاعری میں مائل جناب وصفی کے شاگرد تھے۔[1]
ان کی شاعری میں تمام اصناف ملتے ہیں۔ مائل اپنے وقت کے
قادر الکلام شاعر گزرے ہیں۔ انہوں نے شمالی ہند کے

۱؎ ڈاکٹر زور مضمون مشمولہ "مرقع سخن" جلد اول ۱۹۳۵ء
ص ۲۴۳

مشہور شعراء کی غزلوں کی زمینوں میں طویل غزلیں
لکھی ہیں۔ جن میں میرؔ، سوداؔ، ذوقؔ، انیسؔ، جراتؔ
امیرؔ اور داغؔ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ مائل نے پندرہ ہزار
اشعار اپنی یادگار چھوڑے ہیں۔ کچھ کلام دوسروں
کو بھی دیا ہے جو بعد میں دستیاب نہیں ہو سکا۔ سنہ ۱۳۲۱ھ
تک مائل کے تین دیوان شائع ہو چکے تھے۔ مائل
نے دو لغات بھی مرتب کیں۔ (۱) "نور ظہور" (۲) "ظہور نور"
نام سے شائع کی گئیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے "تحفۂ دکن"
کے نام سے ایک دیوان مرتب کیا جس میں ہر صنف سخن
کے نمونے ملتے ہیں۔ یہ مجموعہ تقریباً سات ہزار اشعار
پر مشتمل ہے۔ اسے ۱۳۱۲ھ میں شائع کیا۔ "تحفۂ دکن"
کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ اس میں ہر غزل پر صنف
کی وہ بحر درج ہوتی تھی جو اس کی تصنیف کے وقت تھی
اس کے علاوہ انہوں نے اپنے پیر و مرشد کی فرمائش پر

ایک نسخہ کلام کا مجموعہ عمر کے آخری دنوں میں مرتب کیا۔ مائل کے اس مجموعہ کے مطالعہ سے ان کی شخصیت کا پتہ چلتا ہے۔ انھوں نے بعض غزلیں دوغزلہ اور سہ غزلہ کی صورت میں لکھیں اور بعض غزلوں میں تو انھوں نے سو سے زیادہ اشعار لکھے ہیں۔ مائل سخت سے سخت زمینوں میں بھی شعر لکھا کرتے تھے۔ مائل نے جس ماحول میں شعر وسخن کی محفل سجائی وہ داغ کی شہرت کا زمانہ تھا۔ مائل کو اس دور کے لوگ شاعر ماننے سے انکار کرتے تھے جس کا مائل کو رنج تھا۔ ایک شعر میں اس بات کی شکایت کرتے ہیں:

مائل جو قدرداں سفارش ملا تو کیا ٭ مجھکو تو قدرداں سخن کی تلاش ہے

قدر مائل کی ہو کیونکر کہ ہے مائل گمنام ٭ وہ دکھاتا ہے مجھے عیب ہنر سے پہلے

نشو و نما پائی ہے دکن میں قدر ہماری کیونکر ہوگی
گھر کی مرغی دال برابر کس کو دکھائیں اپنا ہنر ہم

مائل کو اہل دکن ہونے پر ناز تھا۔ اپنے دکنی ہونے پر فخر محسوس کرتے تھے۔ شمالی ہند کے اکثر شاعر مائل کے قدرداں تھے۔ اردو کے علاوہ انہوں نے فارسی میں بھی شعر کہے اور اپنے والد سے اپنے کلام پر اصلاح لی۔[1]

٥

---

1 غلام صمدانی گوہر "تزک محبوبیہ" جلد دوم حیدرآباد ۱۳۱۹ھ
مشمولہ تزک خلیل ص ۱۶۰

حکیم وائسرائے وہمیؔ

حکیم

آپ کا نام وائسرائے تھا اور تخلص وہمیؔ۔ آپ کا خاندان کائستھ گھرانے سے تعلق رکھتا ہے۔ وہمی کی ولادت ۲۸ ذیقعدہ ۱۳۰۸ھ م ۶ جولائی ۱۸۹۱ء ہوئی۔ جناب وہمیؔ کے والد ڈاکٹر کرپا شنکر حشمتؔ بھی شاعر تھے اور ان کی اور مہاراجہ شیوراج بہادر دھرم ونت کی قریبی رشتہ داری تھی۔ وہمی کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ پانچ سال کی عمر میں سٹی ہائی اسکول لاڑ بازار حیدرآباد میں داخل کیا گیا۔ میٹرک تک اس مدرسہ میں تعلیم حاصل کی۔ میٹرک کامیاب کرنے کے بعد طبابت کی تعلیم کے لیے مدرسہ طبیہ یونانی (نظامیہ کالج) سے حکمت میں سند حاصل کی اور سرکاری ملازمت مل گئی۔ اس کے ساتھ ساتھ والد کے مطب پر بھی وہمی مریضوں کا معائنہ کرتے تھے۔ ملازمت سے وظیفہ

حاصل کرنے کے بعد اپنے والد کے مطب میں کافی
مدت تک حکمت کرتے رہے ۔ ۱۹۶۵ء میں ان کی
وفات ہوئی ۔ [1]

جناب وہمی کو شاعری کا شوق ورثہ میں ملا ۔
اپنے والد کی طرح وہمی حکمت کرتے تھے اور شعر و شاعری
بھی ۔ نادر علی برتر سے کلام پر اصلاح لیا کرتے تھے ۔
جناب وہمی ایک قادر الکلام شاعر تھے اور حکیم بھی ۔
شاعری کے علاوہ انہوں نے اپنی زندگی کا اہم ترین
کارنامہ رامائن کا منظوم ترجمہ انجام دیا ۔ اس
ترجمہ کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں
ایک ہی قافیہ استعمال کیا گیا ہے ۔ رامائن کے
منظوم ترجمہ میں چھ چھ ہزار اشعار ہیں جو ۱۹۶۰ء
میں شائع ہوئے ۔ [2] ان کے دیگر اصناف سخن
میں بھی موضوعی شاعری ملتی ہے مثلاً آرتی

---

[1] سلیمان اریب "حیدرآباد کے شاعر" حیدرآباد ۱۹۶۶ء ص ۱۰۵

[2] نصیر الدین ہاشمی "دکنی ہندو اور اردو" حیدرآباد ۱۹۵۶ء ص ۱۱۵

دوسری نگارشیں آئینہ وغیرہ۔ نمونے کے طور پر
یہاں ان کی غزل کے چند شعر درج کیے جاتے ہیں

خدا میرے ہو نظر کی قناعت جس کا پیشہ ہو
خدا کو ہیں وہی پیارے وہی منظور ہوتے ہیں

آرتی نظم کے کچھ شعر ملاحظہ ہوں

سری رگھوناتھ دیا کے ساگر نرگن ہو تم انتریامی
دینا ناتھ دیا کے ساگر سرشٹی کے تم ہی ہو اجاگر
رام اچھتا پورن کا دسرتھ نندن ہو کے دکھاما
آرتی آپ کی ہم کرتے ہیں چرنن میں سنگ دھرتے ہیں

گن دوش ہمی کے اجاگر کردو
پار اس کو بھوساگر کردو

ہدایت علی خاں ہدایت

آپ کا نام محمد ہدایت علی خاں اور تخلص ہدایت تھا۔ آپ کی ولادت ۱۲۷۵ھ م ۱۸۵۸ء میں بمقام حیدرآباد ہوئی۔ آپ خانوادۂ آصفیہ کے صاحبزادے ہیں۔ آپ کے والد میر معزالدین خاں المخاطب بہ شرف یار جنگ ہمایوں جاہ تھے۔ جناب ہدایت کی پرورش شاہی محلات میں ہوئی۔ (۷) سال کی عمر میں مدرسہ اعزہ میں شریک کیا گیا۔ مدرسہ اعزہ صرف امرا کے بچوں کی درسگاہ تھی۔ خاندان آصفیہ کے فرد ہونے کی وجہ سے ملازمت کا سوال نہیں تھا۔ آپ کے دو صاحبزادے ہیں۔ آپ کی وفات ۱۳۳۵ھ میں حیدرآباد میں ہوئی۔ [1]

جناب ہدایت کو شاعری کا شوق بچپن سے تھا جو ورثہ میں ملا تھا۔ کوئی اور مصروفیت نہ ہونے کی وجہ

---

[1] نصیرالدین ہاشمی "دکن میں اردو" دہلی ۱۹۲۸ء ص ۵۱۳

سے دن رات شعر و شاعری کی محفلیں آراستہ کرنا ان کا
خاندانی مشغلہ تھا۔ اپنے کلام پر حضرت نیفیں سے اصلاح
لیا کرتے تھے۔ جناب ہدایت کے کلام میں غزلیات
مثنوی، مخمس، رباعیات وغیرہ شامل ہیں۔

نمونہ کے طور پر غزل کے چند شعر درج کئے جاتے ہیں۔

میں نے غیروں کا تو پھر گھر میں بلانا چھوڑا
تو نے آنکھیں نہیں پر بار ملانا چھوڑا

مرا عشق جب تجھ پہ اظہار ہوگا ؛ تجھے درد و غم بھی تو بسیار ہوگا
دل کی صفائی مانگ ہدایت تعجل درد ؛ آئینہ کیا مجال تجھے منہ دکھا سکے
گلا میں اب تو ہدایت کھلی دبی زبان ؛ قسم وفا کی تجھے مفت بے وفا کہیے

ہدایت کی ایک مثنوی کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

ترا حمد کرنے کو جان جہاں ؛ زمیں میں ذروں کو طاقت کہاں
کہوں نعت احمد کی کہہ کر احد ؛ کہ ہے خاص وہ نور ذات صمد
وہ ہے احمدی آئینہ سرمدی ؛ کہ دکھلا دیا صورت ایزدی

بدایت کا قلمی دیوان کتب خانہ سالار جنگ میں محفوظ ہے جو کہ

سنہ ۱۲۷۵ھ میں مرتب ہوا اور اس کی کتابت سنہ ۱۳۰۱ھ میں مکمل ہوئی۔ بدایت

کی ایک رباعی ذیل میں نقل کی جاتی ہے :

زاہد کو جنت کی ہوا سے سروکار ؛ عارف تو ہے معرفت حق سے سرشار

اور ہم ہیں خراباتیٔ میخانۂ عشق ؛ ہے مست جہاں میں کوئی کوئی ہشیار [1]

اس باب میں پچھلے صفحات پر طبقہ محبوبیہ میں اُردو شعراء کی

صفات پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ ان شعراء میں بیشتر ایسے ہیں جنہوں نے

عہد عثمانیہ میں اپنی تخلیقات سے اُردو ادب میں اضافہ کیا ہے۔ یہی وجہ

ہے کہ آئندہ باب میں اُن شعراء کا ذکر نہیں کیا جائے گا۔ جن کا تذکرہ

پچھلے صفحات میں کیا گیا ہے۔ کشن پرشاد شادؔ، صفی اورنگ آبادی

کنفی اور عبدالقادر صدیقی حسرت وغیرہ وغیرہ۔

عہد میر محبوب علی خاں میں شاعری کے ساتھ ساتھ نثر کو بھی

---

[1] ماخوذ از "جنوبی ہند کی رباعی گوئی" از صاحب حیدرآبادی ص ۲۶۵

بے انتہا فروغ ملا۔ کشن پرشاد شاد نے نثر میں متعدد رسالے تصنیف کیے۔ علاوہ ازیں انہوں نے ناول لکھنے کی جانب بھی توجہ دی اور "سرمایہ سعادت" ۱۳۰۵ھ "مطلع خورشید" ۱۳۲۰ھ میں لکھا اور "جنجل نار" ۱۳۲۱ھ میں لکھا اور "بزم خیال" ۱۳۲۷ھ میں لکھا۔

شاد نے نظم ونثر میں جملہ ساٹھ (۶۰) تصانیف اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔[1]

ڈاکٹر زور نے اقبال سے اُن کی مراسلت کو "شاد و اقبال" کے عنوان سے شائع کیا ہے۔ مکتوب نگاری میں غالب کا چربہ اتارنے کی کوشش کیا کرتے تھے چنانچہ اپنی نظم ونثر کی خصوصیات کا بیان خود اپنے ایک خط میں کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"مگر جیسا معمولی مکتوب نویسی وغیرہ میں اگر غالب مرحوم کا چربہ نہ اتارا تو ہار جاؤں۔ الغرض جو کچھ میں نے سیکھا اُستادوں سے سیکھا صحبت اہل علم وفضل کی رہی ہے۔ یہ میرا کلمہ غرور کا نہ سمجھیں

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو "مہاراجہ کشن پرشاد" مولفہ مہدی نواز جنگ سنہ اشاعت ۱۹۵۰ء

بیچ مداں ہیں۔ مگر توبہ کر کے کہتا ہوں کہ اگر امرائے دولت آصفی میں اس وقت کوئی مقابلہ کرے تو بہرہ ہر فن میں اپنی استعداد تھوڑی بہت دکھانے کو حاضر ہے اور کمترین خانہ زاد تلمیذ حضرت آصف ہوں

گو شاعری سے مجھ کو سروکار کچھ نہیں
یہ فخر کیا یہ کم ہے کہ شاگرد شاہ ہوں" ۱؎

مہاراجہ کشن پرشاد شاد کے ہم عصر مولوی محب حسین تھے۔ جنھوں نے بحیثیت صحافی نام پیدا کیا چنانچہ انہوں نے مولانا جمال الدین افغانی کی رائے سے متاثر ہوکر تعلیم نسواں کے فروغ کے لیے "معلم شفیق" (۱۸۸۰ء) پھر معلم نسواں (۱۸۹۲ء) اور روزنامہ "علم و عمل" (۱۹۰۰ء) شائع کئے۔ "معلم شفیق" اور "معلم نسواں" اسم با مسمّٰی بن گئے ہیں۔ محب حسین انگریزی سے اچھی واقفیت رکھتے تھے۔ اپنی انگریزی فہمی کا ثبوت انہوں نے انگریزی کے

۱؎ مہدی نواز جنگ "مہاراجہ کشن پرشاد" ص ۲۳۷

ناول ترجمہ کر کے فراہم کیا ہے۔ انہوں نے کرنل میڈوز کے ناول "کانفیشن آف اے ٹھگ" کو "امیر علی ٹھگ" کے نام سے ترجمہ کیا علاوہ ازیں ایک اور ناول "پہلا حرم" بھی ان کا ترجمہ ملتا ہے۔

محب حسین ہی کی طرح صغرا ہمایوں مرزا نے عورتوں کی بیداری کے لیے "النساء" رسالہ جاری کیا اور عورتوں اور ان کی معاشرت کو موضوع بنا کر ناول لکھے۔ "سرگذشت ہاجرہ" "موہنی بی بی" "طوبی کا خواب" اور "مشیر نسواں" ان کی یادگار ہیں۔ آخر الذکر ناول پر مولانا الطاف حسین حالی کی رائے موجود ہے۔ وہ اس ناول کے بارے میں لکھتے ہیں:

> "ہندوستان کی شریف اور ذی لیاقت خواتین میں سے ایک سید ہمایوں مرزا بیرسٹر کی اہلیہ محترمہ ہیں جنہوں نے "مشیر نسواں" لکھ کر اپنے ہم جنس طبقے پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ یہ کتاب ناول کے پیرایہ میں لکھی

گئی ہے اور کافی نصیحت آمیز ہے۔ لائق مصنفہ نے
شہرنسواں میں وہ نتائج جو اولاد کے بے ترتیب
رہنے سے پیدا ہوتے ہیں جیسے لڑکوں کا بے ادب
بدتمیز اور نافرمان ہونا یا لڑکیوں کی کاہلی سستی
اور ضد ہٹ وغیرہ کو نہایت خوبی کے ساتھ دکھایا
ہے۔ یہ ناول فرقہ نسواں کے لیے نئی معلومات
فراہم کرتا ہے۔" [1]

صغرا ہمایوں مرزا کے ہمعصروں میں ہمیں طیبہ بیگم بھی نظر آتی ہیں۔
انھوں نے "انوری بیگم" کے نام سے ناول لکھا عہد محبوبیہ میں ناول کے
ساتھ افسانے لکھنے پر بھی توجہ دی گئی۔

اُردو ادب کی تاریخ میں حیدرآباد کو بیشتر امور
میں اولیت حاصل ہے۔ اُردو کا پہلا دیوان اسی سرزمین پر
مرتب ہوا۔ اُردو کی پہلی صاحب دیوان شاعرہ اسی سرزمین
سے تعلق رکھتی ہیں۔ اسی طرح اُردو کا پہلا مختصر افسانہ بھی

---

[1] ڈاکٹر طیب انصاری "عہد آصفیہ میں اردو نثر کا ارتقاء" ص ۲۳۶
۱۹۹۹ء

حیدرآباد ہی میں مطبع محبوبیہ میں لکھا گیا۔ اودھیش رانی لکھتی ہیں

"اگر معزز وطن کی اشاعت ۱۹۰۸ء مان لی جائے
جیسا کہ ڈاکٹر جعفر رضا نے تحقیق کی ہے تو پھر
حیدرآباد کے تاج فخر میں ایک موتی یہ بھی ٹانکا
جا سکتا ہے کہ اردو کا پہلا افسانہ "صحیفہ"
حیدرآباد (فروری ۱۹۰۷ء) میں "بادشاہ کی دلہن"
کے عنوان سے شائع ہوا اور مارچ ۱۹۰۷ء
میں مکمل ہوا۔ اس کہانی کے لکھنے والے واجد
علی صاحب نلگنڈوی ہیں" ۱؎

اودھیش رانی کی اس طرح کو بغور پڑھنے سے پتہ چلتا ہے کہ واجد علی نلگنڈوی نے "بادشاہ کی دلہن" کے نام سے ایک افسانہ لکھا جو حیدرآباد کے مشہور رسالے "صحیفہ" میں دو قسط میں شائع ہوا۔ اودھیش رانی نے اس افسانے کی کہانی بھی بیان کی ہے۔ ذیل میں اس افسانے کا خلاصہ درج کیا جاتا ہے۔

۱؎ اودھیش رانی، "اردو اور تلگو افسانوی ادب کا تقابلی مطالعہ" صفحہ ۲۷ مقالہ غیر مطبوعہ مخزونہ کتب خانہ شعبۂ اردو سنٹرل یونیورسٹی حیدرآباد

سندھ کا ایک بادشاہ احمد شاہ راجپوت شہزادی لالہ پر عاشق ہو جاتا ہے جو کہ ہر بیر سنگھ کی بیٹی ہے۔ ہر بیر سنگھ قلعہ آمور کا راجہ ہے۔ وہ احمد شاہ سے مقابلہ کرتا ہے اور ہم سے شکست ہو جاتی ہے۔ سب عورتیں جوہر کر لیتی ہیں۔ مگر لالہ اپنے آپ کو احمد شاہ کے سپرد کر دیتی ہے۔ اس طرح کہ خاموشی سے احمد شاہ کے لباس میں ایک زہریلی دوا لگا دیتی ہے۔ جو سورج کی ~~زہریلی~~ شعاعوں سے اثر پذیر ہوتی ہے۔ درد و سوزش سے بادشاہ چلانے لگتا ہے۔ وہ اپنے زہر آلود کپڑوں کو پھاڑ ڈالنے کی کوشش کرتا ہے اور ادھر اُدھر بھاگنے لگتا ہے۔ افسانے کے آخر میں لالہ مطمئن ہو کر خود کو تالاب میں گرا دیتی ہے۔

واحد نلگنڈوی کے افسانے کا یہ خلاصہ مکمل افسانہ کی نمائندگی کرتا ہے۔ وحدت تاثر بھی اس کہانی میں مکمل ہے۔ لالہ کا کردار نہ صرف فعال ہے بلکہ زندگی سے بھرپور بھی معلوم ہوتا ہے۔ وہ اپنی سکھیوں کے ہمراہ صرف اس لیے جوہر نہیں

کرتی کہ اُسے اپنے باپ کی موت کا بدلہ لینا ہے' انتقام لیا ہے۔

راقم الحروف کا خیال ہے کہ اود ھیش رانی نے بالکل صحیح رائے قائم کی ہے کہ پریم چند سے قبل اُردو افسانے نے حیدرآباد میں زندگی کرنا سیکھ لیا تھا اور "بادشاہ کی دلہن" کو ہم اُردو کا پہلا افسانہ قرار دے سکتے ہیں۔

عہد محبوبیہ میں ڈرامے کو بھی فروغ حاصل ہوا چنانچہ شمس الدین محمد حمزہ نے اپنا ڈراما "مصدر لطف آدھا لکاح" ۱۸۸۳ء میں بطور تمثیل پیش کیا۔ بعد ازاں اُردو ڈرامہ نے اسٹیج کا سہارا لیا اور حیدرآباد کی سرزمین پر اس صنف سخن کا ارتقاء بھی عمل میں آیا۔ سید منجو قر اپنے شاہکار ڈرامے "بہادر شاہ ظفر" میں لکھتے ہیں:

"دکن میں بیسویں صدی کی ابتداء کے ساتھ نواب حبیب علی نے دال منڈی کے ناٹک کی داغ بیل ڈالی۔

اس ناٹک کے منتظم مقرر کیا گیا تھا۔ یہی ادارہ
حیدرآباد میں ناٹک کا پہلا ادارہ تھا جس
کی گلوکار محبوب جان ممتاز تھی جو رقص
میں مہارت رکھتی تھی۔ اندر سبھا دال منڈی
کے کھلے رنگ منچ کا خاص ناٹک تھا۔ رنگ
منچ کے سامنے شطرنجیاں اور دریاں بچھا
دی جاتیں اور عوام زیر آسمان بیٹھے اندر کے
اکھاڑے کا تماشہ دیکھا کرتے تھے گویا یہ جاترا
ناٹک کی تھوڑی بہت ترقی یافتہ شکل تھی۔" ؎۱

عہد محبوبیہ میں اُردو کی ترقی اور اُردو شعر و ادب
کا ارتقاد "سنہرے حرفوں" میں لکھا جائے گا۔ آصف جاہ سادس
نے نامساعد حالات میں اُردو کو سرکاری زبان قرار دیا جس
سے اُردو ادب و شعراء کے حوصلے بلند ہوئے اور یہ قلم کے
دھنی اُردو کی خدمت میں جٹ گئے۔ آصف جاہ سادس کے

؎۱ سید منجو قمر: بہادر شاہ ظفر، ڈراما ص ۱۲ طبع اول

اس کارنامے کا بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر زورؔ نے اُن کے اس "احسان" عظیم کا بیان کیا ہے۔ نواب میر عثمان علی خان کے عہد میں اُردو شعر و ادب کے ارتقاء کو ڈاکٹر زورؔ کے اسی اقتباس پر ختم کیا جاتا ہے۔

"اعلیٰ حضرت تحریر و تقریر دونوں کے حاکم تھے۔ ان کی نظم و نثر، فرامین اور اسپیچیں اس دعوے پر شاہد عادل ہیں۔ انھوں نے نہ صرف مال و دولت سے اُردو (ادب) کی سرپرستی کی اور ملک میں ذوق ادب کو ترقی دی بلکہ اپنی زبان اور قلم سے اُردو زبان کی خدمت کی۔ انھیں کے عہد کا یہ کارنامہ تھا کہ ممالک محروسہ کی دفتری زبان فارسی کے بجائے اُردو اُردو قرار پائی۔ یہ وہ عزت تھی جو اُسے نہ دہلی میں نصیب ہوئی اور نہ لکھنؤ میں۔ یہی وہ احسان تھا جس نے اُردو کو موت کے منہ سے کھینچ نکالا اور حیات جاوید (جاوید کذا) عطا کی" [1]

---

[1] ڈاکٹر زورؔ "مرقع سخن" جلد دوم ص ۱۹ و ص ۱۲۸

۵

باب پنجم

اردو شعر وادب بہ عہد میر عثمان علی خان
آصف جاہ سابع (۱۹۱۱ء تا ۱۹۶۷ء)

اگزالٹڈ ہائینس سلطان العلوم خسرو شیرین سخن اعلیحضرت نواب میر عثمان علی خان بہادر
شاہ آصفجاہ سابع خلد اللہ ملکہ

1

430

عہد آصفیہ میں اُردو شعروادب کی داستان اپنے دلچسپ زمانی منزلیں طے کرتے ہوئے سلطان العلوم کے عہد میں اپنے عروج کی اُس منزل کو پہنچ جاتی ہے، جہاں سے مزید ترقی وارتقاء کی گنجائش نظر نہیں آتی۔ عثمانیہ یونیورسٹی کا قیام اور کامیاب درس وتدریس کے مرحلے نے عہد عثمان علی خاں میں اُردو شعروادب کو بام عروج پر پہنچادیا تھا اور ۱۹۴۸ء کے سانحہ کے بعد اُردو شعروادب نے اپنا سفر پھر اس طرح شروع کیا تھا جیسا کہ ۱۷۲۴ء میں آصفجاہ اول کے عہد میں برار اور اورنگ آباد میں کیا تھا۔ قطب شاہی عہد سے عہد آصفجاہ سابع تک اُردو کی ترقی کا بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر زور لکھتے ہیں:

"محمد قلی اور عبداللہ قطب شاہ جیسے قدردانِ اردو
باقی نہیں رہے تھے، فارسی کی قدردان سلطنت مغلیہ
کے تسلط کی وجہ سے دکن کے اُردو ادیبوں کو درباری
ہمت افزائیوں کی کوئی توقع نہ تھی اور ایسا معلوم
ہوتا تھا کہ قطب شاہیوں کی روشن کی ہوئی شمع

اردو شاید گل ہو جاتی لیکن ایسے ناموافق
حالات میں بھی ولی اور سراج، قادر اور مرزا
جیسے متعدد باکمال شاعر موجود تھے اور ان کے دم سے
شعر و سخن کی محفلیں برابر گرم تھیں۔ ان محفلوں
کے چراغ ابھی گل بھی نہ ہونے پائے تھے کہ نواب
ارسطو جاہ، اعلیٰ حضرت سکندر جاہ، مہاراجہ چندو
لال اور نواب شمس الامراء اور ان کے فرزندوں
(شمس الامراء ثانی اور شمس الامراء ثالث)
نے اپنی مشہور آفاق سرپرستوں سے اُن کی
تابناکیوں میں چار چاند لگا دیے لیکن یہ محفلیں
اور ان کی سرگرمیاں ابھی اُردو دنیا کی نظروں سے
اوجھل ہیں۔

شمس الامرائی ضیا پاشیاں ابھی مدھم نہ ہونے
پائی تھیں کہ اعلیٰ حضرت غفران مکاں آصف جاہ
سادس کے عہد کی ضیا مینوں نے اُردو کی محفل کو
بزم چراغاں بنا دیا اور اب اس بزم چراغاں
میں عہد حضرت سلطان العلوم آصف جاہ سابع

کی مسیحا نفسی نے برقی رو دوڑا دی ہے۔"[1]

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور نے اردو شعر و ادب کے ارتقاء اور عہد آصفیہ میں اس کے فروغ کی کوششوں کا بیان بڑی خوبی سے کیا ہے اور ساتھ ہی نواب میر عثمان علی کے عہد میں اردو شعر و ادب کی ترقی کی جانب عمدگی سے اشارہ کیا ہے۔

○

نواب میر عثمان علی خاں ۲۹ رجمادی الثانی ۱۳۰۳ھ مطابق ۱۸۸۶ء بروز شنبہ حویلی قدیم میں جو لڑکا پیدا ہوا اُسے نواب میر عثمان علی خاں کے نام سے موسوم کیا گیا۔ پانچ برس کی عمر میں یعنی ۱۳۰۷ھ م ۱۸۹۱ء میں رسم تسمیہ خوانی کے بعد تعلیم کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ مولانا انوار اللہ خاں فضیلت جنگ عربی اور دینی تعلیم نواب عماد الملک اور سید علی شوستری فارسی تعلیم اور مسٹر رحیرٹن انگریزی زبان کی تعلیم کے لیے مقرر ہوئے۔ تعلیم ہی کے ساتھ سواری شکار اور سپاہیانہ فنون کی تعلیم کا بھی آغاز ہوا اور نواب سر افسر الملک کو ان علوم کی تعلیم اور مشق کے لیے مقرر کیا گیا۔ ان مندرجہ بالا قابل اساتذہ کی نگرانی میں میر عثمان علی خاں نے تعلیم و تربیت مکمل کی۔ ۱۳۲۴ھ مطابق ۱۹۰۶ء میں نواب جہانگیر جنگ بہادر کی دختر نیک اختر سے شادی ہوئی۔ نواب

---

[1] ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور "عہد عثمانی میں اردو کی ترقی" ص ۱۱، ۱۲ سنہ اشاعت ۳۴ء

میر عثمان علی خاں کو تخت نشینی سے قبل ہی دو فرزند نواب اعظم جاہ بہادر اور نواب معظم جاہ بہادر تولد ہوئے۔

نواب میر عثمان علی خاں، آصف جاہ سادس نواب میر محبوب علی خاں کے انتقال پر ۲۹ ستمبر ۱۹۱۱ء کو تخت آصفی پر تخت نشین ہوئے اور ۱۹ ستمبر ۱۹۴۸ء کو ریاست کے ہندیونین میں ضم کئے جانے تک حکمراں رہے۔ اس طرح انہوں نے ۳۷ برس تک حکمرانی کی۔ نواب میر عثمان علی خاں آصف جاہ سابع کے عہد میں تعلیم اور علم وفن کے فروغ کا بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر داؤد اشرف لکھتے ہیں:

> "آصف سابع کے عہد میں ریاست حیدرآباد نے زبردست ترقی کی۔ اس عہد کے ابتدائی ۲۶، ۲۷ برسوں میں تمام شعبۂ حیات میں ترقی کی رفتار دیگر آصف جاہوں کے ادوار کی بہ نسبت بہت تیز تھی۔ آصف سابع نے تعلیم اور علم وفن کے فروغ میں غیر معمولی دلچسپی لی۔ اس عہد میں تمام شعبہ ہائے حیات میں ترقی کی رفتار تیز تھی۔ مدارس اور کالجوں کی تعداد میں کئی گنا اضافہ ہوا۔ جامعہ عثمانیہ کے قیام کی وجہ سے نہ صرف ایک تعلیمی انقلاب رونما ہوا بلکہ زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھی انقلاب آیا"[1]

---

[1] سید داؤد اشرف "نواب میر عثمان علی آصف سابع" مضمون شمولہ رسالہ قومی زبان بابت نومبر ۲۰۰۲ء

آزاد ہندوستان نے جب ۲۶ رجنوری ۱۹۵۰ء کو جمہوریت کا پرچم بلند کیا تو نواب میر عثمان علی خاں آصف جاہ سابع کو راج پرمکھ بنائے گئے اور ۳۱ راکتوبر ۱۹۵۶ء تک اس عہدہ پر فائز رہے۔ آصف سابع نے ۲۴ رفبروری ۱۹۶۷ء کو داعی اجل کو لبیک کہا۔

o

آصف جاہ سابع کے دور حکومت میں بیشتر ادیب و شعراء وہ ہیں جنھوں نے عہد آصف جاہ سادس میں شہرت حاصل کی اور جن کا ذکر اس مقالے کے چوتھے باب میں کیا گیا ہے۔ اس باب میں ایسے ادیب و شعراء کا ذکر نہیں کیا گیا ہے کہ تکرار محض کا باعث ہوتا بہرحال آصف جاہ سابع کے عہد میں اردو شعر و ادب کا ارتقاء یوں اظہر من الشمس ہے۔ پھر بھی ذیل میں اس عہد میں اردو ادب کے ارتقاء کا اجمالی خاکہ پیش کیا جاتا ہے۔

عہد آصف جاہ ثانی میں ہمیں ادیب و شعراء کے تین واضح طبقات کا پتہ چلتا ہے۔ ایک وہ ہیں کہ جو اعلیٰ حضرت کے امراء و مقربین میں شامل ہیں اور اردو شعر و ادب کا اچھا ذوق و شوق رکھتے ہیں۔ دوسرے وہ ادیب و شعراء ہیں جو کہ اپنے ذوق سلیم کی بناء اردو ادب کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ ان ادیب و شعراء میں بھی بیشتر کسی نہ کسی سرکاری دفتر سے وابستہ ہیں یا پھر درس و تدریس سے منسلک ہیں۔ تیسرا طبقہ وہ ہے جس

ہم فرزندانِ جامعہ تعمیر کرتے ہیں۔

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ "عہدِ عثمانی میں اُردو کی ترقی" کا بیان کرتے ہوئے نواب عثمان علی خاں بیرونی مشاہیر پر انعام و اکرام کی بارش کا بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "اعلیٰ حضرت سلطان العلوم کی اُردو زبان و ادب کی سرپرستی اور قدر افزائی کے زیرِ سایہ اُردو کے جن خدمت گزاروں کی کوشش سرسبز و شاداب ہوئیں، وہ کئی قسم کے ہیں۔ ان میں سے پہلے ان ادیبوں اور شاعروں کا ذکر ضروری ہے جنھیں تصنیف و تالیف یا شعر و شاعری کے صلے میں اعلیٰ حضرت نے منصبوں اور ماہواروں سے سرفراز کیا ہے۔ شبلی نعمانی مرحوم اور عبدالحلیم شررؔ مرحوم جیسے اُردو کے زبردست محسنوں نے بھی اپنی وفات تک اعلیٰ حضرت ہی کی قدر دانی کی وجہ سے مرفہ الحال زندگی بسر کی اور اُردو زبان کو اپنی گراں بہا تحریروں سے مالا مال کرتے رہے۔ ان کے جملہ آخری کارنامے عہدِ عثمانی ہی کی فتوحات ہیں۔ مولوی عبدالماجد دریابادی، خواجہ حسن نظامی،

سید سلیمان ندوی صاحب مولوی ظفر علی خاں اور
ان کے بیٹے اختر علی خاں وغیرہ جیسے متعدد انشاء
پرداز بھی اعلیٰ حضرت ہی کی سرپرستی کی وجہ سے
حیدرآباد سے دور اپنے اپنے وطن میں رہ کر اُردو
زبان کی خدمت میں سرگرم ہیں۔ ان سبھوں کی
اُردو خدمات دنیائے علم میں اچھی طرح روشناس
ہوچکی ہیں اور ان میں سے بعض ہستیوں نے تو تاریخ
ادب اُردو میں مستقل جگہ حاصل کرلی ہیں ۔۔۔ "[1]

آصف جاہ سابع نواب میر عثمان علی خاں نے ابتدائے مشق سخن میں
ب مرزا خاں داغؔ استاد شہ سے اپنے کلام پر اصلاح لی۔ داغؔ کے انتقال
بعد انہوں نے حضرت امیر مینائی کے شاگرد رشید جلیل مانکپوری سے اپنے
م پر اصلاح لی۔ جلیلؔ کو فصاحت جنگ اور استاد شہ کا لقب عطا ہوا۔
ل کے دو شعری مجموعے "جان سخن" اور "ریاض سخن" عہد عثمانی ہی کی یادگار ہیں۔

جلیلؔ مانکپوری کے کلام میں لکھنوی تغزل پوری طرح جھلکتا ہے۔ زبان
ف شستہ اور متروکات سے پاک ہوتی ہے لیکن لفظ پر معانی کو ترجیح
تے ہیں۔ مضمون کو زبان پر فوقیت دیتے ہیں۔ محبوب کی ستم آرائی وجفاکشی

---

[1] ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ "عہد عثمانی میں اردو کی ترقی" ص ۲۵ سنہ اشاعت ۱۹۳۷ء

سید سلیمان ندوی صاحب مولوی ظفر علی خاں اور
ان کے بیٹے اختر علی خاں وغیرہ جیسے متعدد انشاء
پرداز بھی اعلیٰ حضرت ہی کی سرپرستی کی وجہ سے
حیدرآباد سے دور اپنے اپنے وطن میں رہ کر اردو
زبان کی خدمت میں سرگرم ہیں۔ ان سبھوں کی
اردو خدمات دنیائے علم میں اچھی طرح روشناس
ہو چکی ہیں اور ان میں سے بعض ہستیوں نے تو تاریخ
ادب اردو میں مستقل جگہ حاصل کر لی ہیں ۔۔۔" [1]

آصف جاہ سابع نواب میر عثمان علی خاں نے ابتدائے مشق سخن میں نواب مرزا خاں داغ استاد شہ سے اپنے کلام پر اصلاح لی۔ داغ کے انتقال کے بعد انہوں نے حضرت امیر مینائی کے شاگرد رشید جلیل مانکپوری سے اپنے کلام پر اصلاح لی۔ جلیل کو فصاحت جنگ اور استاد شہ کا لقب عطا ہوا۔ جلیل کے دو شعری مجموعے "جان سخن" اور "ریاض سخن" عہد عثمانی ہی کی یادگار ہیں۔

جلیل مانکپوری کے کلام میں لکھنوی تغزل پوری طرح جھلکتا ہے۔ زبان صاف شستہ اور متروکات سے پاک ہوتی ہے لیکن لفظ پر معانی کو ترجیح دیتے ہیں۔ مضمون کو زبان پر فوقیت دیتے ہیں۔ محبوب کی ستم آرائی وجفاکشی

---

[1] ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور "عہد عثمانی میں اردو کی ترقی" ص ۲۵ سنہ اشاعت ۱۹۳۴ء

شباب و نواب، فخرو آئینہ حنا و محرم کے مضامیں معلوم ہوتا ہے کہ جلیل کو بے حد پسند ہیں۔ جلیل نے لکھنوی دبستان کو اپناتے ہوئے اپنے کلام میں تغزل کے ساتھ ساتھ جا بجا معروفت کے عناصر کو بھی شامل کیا ہے۔ جس سے اُن کے کلام میں ندرت پیدا ہو گئی ہے۔ جلیل کی ایک غزل ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

اب شغل نہیں ہے مئے کشی کا ؛ اب لطف نہیں ہے زندگی کا
یہ رنگ گلاب کی کلی کا ؛ نقشہ ہے کسی کی کم سنی کا
کیا شکوہ کروں میں بیخودی کا ؛ ہوتا نہیں کوئی بھی کسی کا
ہم مرتے ہیں ناصحا کہے کیا ؛ مختار ہر اک ہے اپنے جی کا
منہ پھیر کے یوں چلی جوانی ؛ یاد آ گیا روٹھنا کسی کا
غنچوں کو صبا نے گدگدایا ؛ دشوار ہے ضبط ہنسی کا
دیکھو نہ جلیل کو مٹاؤ ؛ مٹ جائے گا نام عاشقی کا

غالب کے انتقال کے بعد رام پور میں داغ کے کلام کا طوطی بولنے لگا۔ داغ کا انداز سخن اتنا مقبول ہوا کہ ایک عرصہ تک یہی اسلوب دہلی لکھنؤ رامپور اور حیدرآباد کے شعراء پر اثر انداز رہا۔ داغ اور امیر مینائی رام پور میں ایک ساتھ رہے۔ سخن سنجی و سخن فہمی کی خوب خوب داد دی اور داد پائی۔ دونوں استاذہ سخن نے خوب خوب مشاعرے لوٹے لیکن امیر خود کو داغ کے مقبول اسلوب سے بچا نہیں پائے۔ جلیل پر بھی داغ کا اثر بالراست بھی ہوا

جلیل کے چند اشعار دیکھئے جن پر داغ کا اثر سر چڑھ کر بول رہا ہے

جادو بھی گردن نہ میری کٹ سکی :: منت میں اپنا ہاتھ بھی جھوٹا کیا

ہے مثل تل اوٹ ہو جائے بہار :: آنکھ ہاسم ملتے ہی دل مل گیا

ہم کو موقع مل گیا گردن میں باہیں ڈال دیں
بیٹھے رونا رو رہے تھے وہ گلے کے ہار کا

آتشیں رخ سے الٹتی تھی نہ محفل میں نقاب
آنچ آئی شمع پر پروانہ جل کر رہ گیا

جان بھی نذر بت خودکام ہے :: اب بیاں کیا ہے خدا کا نام ہے

زبان و بیان کی خوبی، محاورہ اور روزمرہ سے مزین اشعار کے باوصف
خود جلیل کو فنی نزاکتوں کا ادراک تھا۔ فرماتے ہیں،

اس سخن کا جلیل کیا کہنا :: مصحفی کی زبان ہے گویا

یہ جان لو کہ زمانہ ہے نکتہ چینی کا :: جلیل مستم کا پہلو ذرا بچائے ہوئے

داغ نے ۱۹۰۵ء میں انتقال کیا۔ جلیل نوجوان تھے آمد زوروں پر
تھی۔ علیہ جوانی کے مضامین کو داغ کے اسلوب میں خوب سے خوب تر باندھا طرہ
یہ کہ استاد شہ، ہر رسالے، ہر اخبار، ہر گلدستہ میں کلام موجود۔ نتیجہ یہ ہوا کہ
جلیل کی وجہ سے شعر و شاعری کو خوب فروغ ملا۔ سلطان العلوم کا زمانہ "تعلیم
کا بول بالا" اس پر جلیل کی زبان اور رعایت لفظی کی شان، نوجوانوں نے اردو

شاعری کی دیوی کے آگے سر خم کر دیا۔ نتیجتاً اردو شاعری کو خوب فروغ ملا۔

آصف سابع نواب میر عثمان علی خاں کی تعلیم سے دلچسپی اور شعراء کی ہمت افزائی کے ساتھ ساتھ خود ان کے کلام کی اشاعت کی بنا پر درباری امراء و اقرباء نے بھی شاعری کی جانب توجہ کی اور اردو ادب کی اشاعت سے دلچسپی لی چنانچہ نواب محمد لطف الدین خاں لطافت جنگ لطف، نواب محمد معین الدین خاں بہادر تمکین، راجہ نرسنگ راج بہادر عالی، نواب تہنیت یار جنگ تہنیت، صاحبزادہ میر آفتاب علی خاں قمر، راجہ محبوب راج محبوب، شہزادہ والاشان نواب معظم جاہ بہادر شجیع، نواب میر کاظم علی خاں وغیرہ وغیرہ نے بھی اردو شعر و ادب سے اپنی وابستگی کے ذریعہ اردو ادب کے فروغ میں اہم حصہ ادا کیا۔

نواب لطف الدولہ بہادر لطف رمضان ۱۳۰۰ھ میں پیدا ہوئے۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ خوش نویسی سے خصوصی دلچسپی تھی۔ ابتدائی عمر ہی سے شعر و سخن سے شغف پیدا ہوا۔ تاریخ گوئی میں ملکہ پیدا کیا۔ انتہائی سادہ منکسر المزاج واقع ہوئے تھے۔ شعر و شاعری کی اعلیٰ صلاحیتوں کے باوجود خود کو شاعر نہیں سمجھتے تھے۔ لطف کے کلام کے بارے میں مرزا قدرت اللہ بیگ لکھتے ہیں:

"معاملہ فہمی اور سخن شناسی سے بھی بہرہ ور تھے بے جا
تکلفات اور خوشامد کو ناپسند کرتے تھے ان کی شاعری

داد طلبی یا شہرت کے لئے نہیں بلکہ محض فطری لگاؤ اور ذوق سلیم کا نتیجہ تھی۔ "[1]

لطف نے دیوان مرتب کیا تھا لیکن شائع نہیں کیا۔ غالباً اس کی وجہ بھی یہی تھی کہ شاعری کو وہ باعث شہرت و توقیر استعمال کرنا نہیں چاہتے تھے اور صرف اپنی فطری پسندیدگی اور ذوق سلیم کی تسکین کے لیے شعر کہتے تھے۔ کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو:

وہ اب پوچھتے بھی نہیں مجھ کو برسوں ؛ گوارا نہ تھی جن کو دم بھر جدائی
سامنے میرے غیر سے ہنسنا ؛ یہ رلانا نہیں تو پھر کیا ہے
دل کو دے کر ہے درد سر لینا ؛ عشق جھگڑا نہیں تو پھر کیا ہے
قسم آپ کھاتے ہیں کہتی ہے چتون ؛ یہ وعدے نہیں ہیں وفا ہونے والے
شب وصل جتنا وہ چاہیں ستالیں ؛ بھلا لطف ہی بے مزا ہونے والے

لطف کے یہاں عموماً مسلسل غزلیں ملتی ہیں جا بجا بحر چھوٹی ہو کہ طویل وہ مضمون کو ایک تسلسل کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزل کے اکثر شعر نظم یا مثنوی کے شعر معلوم ہوتے ہیں۔

لطف ہی کی طرح عتیق کے ہاں بھی غزل مسلسل ملتی ہے لیکن عتیق نے نظم نگاری پر زیادہ توجہ دی ہے۔ نواب محمد ظہیر الدین خاں رفعت جنگ بشیر الدولہ عمدۃ الملک اعظم الامراء امیر اکبر سر آسمان جاہ بہادر کے گھر ۷ ذیقعدہ سنہ ۱۳۰۱ھ

---

[1] مضمون مشمولہ "فروغ سخن" جلد دوم ص ۲۲۷

بروز دو شنبہ بمقام سرور نگر پیدا ہونے والے لڑکے کو محمد معین الدین خاں کے نام
سے موسوم کیا گیا۔ اجداد کا سلسلہ حضرت بابا شیخ فرید گنج شکرؒ سے ملتا ہے۔ آٹھ
برس کے تھے کہ والد کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ نواب میر محبوب علی خاں نے معین کو
اپنے سایۂ عاطفیت میں لے لیا اور انہیں بہترین تعلیم دلوائی۔

تعلیم سے فراغت کے بعد شاہی ملازمت میں داخل ہوئے اور اپنی اعلیٰ
صلاحیتوں کی بنا د ترقی کے مدارج طے کیے۔ چنانچہ ۱۶ رجب ۱۳۳۶ھ میں انھیں
نواب امانت جنگ بہادر اور ۲۵ رجمادی الثانی ۱۳۴۱ھ میں معین الدولہ کا
خطاب ملا۔ ۱۳۴۲ھ میں محکمہ صنعت و حرفت کے صدر المہام اور باب حکومت
کے رکن بنائے گئے۔ اس کے ایک سال بعد یعنی ۱۳۴۳ھ میں محکمہ افواج کی صدر المہامی
تفویض ہوئی۔

معین الدولہ ایک بہترین شکاری تھے اور ان کے شکار کی شہرت دور دور
تک تھی۔ سید ابو الفضل لکھتے ہیں:

"فنون سپہ گری میں آج سرزمین دکن میں ان کا
ہمسر مشکل سے نظر آتا ہے۔ نشانہ بازی میں
شاید ہی معدودے چند ان کے پایہ کے نشانہ انداز
نکل سکیں۔ شکار کے معلومات اور تجربہ جتنے انہیں
حاصل ہوئے ہیں۔ شاید ہی کسی اور کو نصیب ہوں گے۔

سیر و شکار کے اس طویل زمانے میں وہ اپنا روز
نامچہ برابر لکھتے رہے چنانچہ ان روزناموں میں ایسے
دلچسپ واقعات اور ایسے جرأت آزما تجربے پیش
ہو گئے ہیں کہ شکار سے متعلق کوئی مستند کتاب بھی
بمشکل ان کا جواب پیش کر سکے گی۔" [1]

معین الدولہ کو کھیل کود سے بھی دلچسپی تھی چنانچہ خود اپنی ایک کرکٹ ٹیم تشکیل دی تھی اور ہندوستان بھر کی ٹیموں کو حیدرآباد مدعو کرتے ہوئے ٹورنمنٹ منعقد کیا کرتے تھے۔ معین الدولہ ہی کی کوششوں سے حیدرآباد میں کرکٹ کو فروغ حاصل ہوا۔ آج بھی معین الدولہ گولڈ کپ ٹورنمنٹ ان کی یاد میں ہر سال منعقد کیا جاتا ہے۔

معین الدولہ کو شاعری کا شوق بچپن ہی سے تھا چنانچہ معینؔ تخلص اختیار کیا اور ابتداء میں مولوی میر لیاقت حنیفؔ سے مشورۂ سخن کیا اور بعد ازاں جلیلؔ کے آگے زانوئے ادب طے کیا۔ مشق سخن سے فن شاعری پر دسترس حاصل کی۔ عموماً موضوعاتی نظمیں بہت اچھی لکھا کرتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے انیسویں صدی کی ابتداء میں جب دکن میں طاعون پھیلا تو معینؔ مسدس "بلائے آسمانی" لکھا جس میں بائیس بند ہیں۔ مسدس کے پہلے بند میں "چمن روزگار کی بربادیوں" پر افسوس کا اظہار کیا ہے۔ مسدس کا پہلا بند ملاحظہ ہو۔

بربادیوں پہ ہے چمن روزگار حیف :: لٹتا ہے کاروان نسیم بہار حیف

---

[1] مشمولہ "مرقع سخن" جلد دوم ص ۲۸۴

پامال ہو رہے ہیں گلِ تر مزا رہے ؛ قمری کو سرو بھی نظر آتا ہے دار ہے

آمدِ خزاں کی رخصتِ فصلِ بہار ہے
جو پھول ہے نگاہ میں بلبل کے خار ہے

مسدس کے آخری بند میں دعا باندھی ہے۔ سدد دیکھیے:

بس اے معین دعا کے لیے ہاتھ اٹھاؤ اب ؛ رو رو کے خود نہ ایک جہاں کو رلاؤ اب
غم جس سے دور ہو وہ فسانہ سناؤ اب ؛ قابو میں اپنے اپنی طبیعت کو لاؤ اب

درگاہِ حق میں دل سے کرو التجائے رحم
آخر قبول ہوگی نہ کب تک دعائے رحم

معین کے یہاں شراب و شباب کے ساتھ ساتھ حکیمانہ نکتہ رسی بھی ملتی ہے۔ معین کا دیوان شائع ہو چکا ہے۔ دیوان معین کے مشمولات اور مضامین و موضوعات پر اظہار خیال کرتے ہوئے سید ابوالفضل لکھتے ہیں:

"معین بہت پرگو شاعر ہیں۔۔۔۔ انہوں نے کئی سو غزلیں
مخمس، مسدس، نظمیں اور نفیس ٹھمریوں کا ایک ضخیم
دیوان تیار کر لیا ہے۔ ان کا کلام سادہ اور بے جا
تعقید سے بالکل مبرا ہے۔ عشق کی غارتگری کے دلسوز
مضامین اور پند و نصائح و حکم و تصوف کے ادق
مسائل کو سادہ اور سلیس الفاظ ادا کرنے پر انہیں

خاص قدرت حاصل ہے۔ ایک تو فطری شاعری اور
دوسرے طویل مشق سخن نے ان کے کلام میں ایک
خاص رنگ پیدا کر دیا ہے انہوں نے اپنا زیادہ
وقت صنائع و بدائع پر صرف نہیں کیا۔ ان کے
کلام میں آمد ہے آورد نہیں۔"[۱]

معین نے سادہ بے عیب زبان استعمال کی ہے۔ اُن کے یہاں روزمرہ بھی ملتا ہے۔ معین کو خود بھی اپنی زبان کے استعمال پر ناز تھا اور اپنے مشق سخن کا بھی بعض خوب اندازہ تھا۔ چنانچہ اپنے چند اشعار میں کہتے ہیں:

نہ کیونکر اے معین ہو پاک عیبوں سے کلام اپنا
کہ آخر ہم نے کی ہے خدمت اہلِ ہنر برسوں

قابلِ داد ہو کیونکر نہ معین اپنا کلام / بندش چستی و شیریں سخنی کے باعث

معین چھپتی نہیں اہلِ ہنر سے / صفائی میرے اندازِ بیاں کی

شہرت ہے اے معین ترے زورِ کلام کی / تجھ سا جہاں میں کوئی جادو بیاں نہیں

"اپنی جادو بیانی" کے دعویٰ کے باوصف انھیں "جہاں سے اہلِ نظر" اور "قدردانِ سخن" سے اُٹھ جانے کا افسوس ہے۔ اسی کے ساتھ معین کو یہ احساس بھی ہے کہ داغ کے داعی اجل کو لبیک کہنے پر "شاعری کا فن" بھی چلا گیا ہے۔ اشعار ملاحظہ ہوں:

---

[۱] مضمون مشمولہ "فرخ سخن" جلد دوم ص ۲۸۸

وہ زمانہ آگیا اے متینؔ کوئی قدر دانِ سخن نہیں
کیسے جوہر اپنے دکھائیں ہم کہ جہاں سے اہلِ نظر گئے "

دارِ فانی کی طرف بزمِ سخن سے اے متینؔ ؛ داغؔ صاحب کیا گئے بس شاعری کا مر گیا

متینؔ کی غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

خیالِ نرگسِ مخمور تیرے قرباں ؛ نہ مست ہی نہ مجھے ہوشیار ہی رکھا
شبِ وصل ذکرِ دشمن جو نہ آیا خیر گذری ؛ انہیں کچھ خیال ہوتا مجھے کچھ خیال ہوتا
عمر حکیر میں کٹی چین نہ پایا دم بھر ؛ میرے نالوں کا اثر چرخِ کہن دیکھ لیا
بڑھا دے کچھ تو یارب وصل کی شب ؛ رہی جاتی ہے دل کی دل میں ہر بات
تم نے کل غیر کو محفل سے کیا تھا باہر ؛ آج ہم آپے سے باہر ہیں خوشی کے باعث
چشمِ ساقی کا بندھا دل میں تصور دمِ ذبح ؛ پی لیا ساغرِ مئے جامِ شہادت کے عوض
حشر میں ہوگی جو پرسش تجھے کر دوں گا معین ؛ سالہا سال کی ہے بات مجھے یاد نہیں
جو نیچی نظروں سے لیتے ہو چٹکیاں دل میں ؛ نہاں ہے شرم کے پردے میں بھی شرارت کیا
بے عشق زندگی ہمیں بدتر ہے موت سے ؛ سر رکھ کے کیا کریں گے وہ سودا نہیں رہا
نظر پڑ کیفِ دل بدست اور آنکھیں خمار آگئیں
مجھے دیکھ کر سراپا ہوں میں تصویرِ میخانہ

عہدِ عثمان علی خاں میں متینؔ اور حکیمؔ دو ایسے شاعر ہیں جو موسیقی سے بھی واقفیت رکھتے تھے اور ان دونوں شاعروں نے ٹھمریاں قلمبند

کی ہیں۔ ویسے عشاق نے خود بھی بڑی اچھی ٹھمریاں لکھی ہیں۔ ذیل میں عشاق کی دو ٹھمریاں نقل کی جاتی ہیں :

ٹھمری نمبر ۱

رین کٹت ہے گن گن تارے
دکھوا بہت موہے بہا لمبا رے
جان بھی موری موہے بھائی سیرائی
سر دھنوں پھولی آنگن میں

—

ٹھمری نمبر ۲

جیوا چین نہ پاوت سجنی
سونی سیجریا نہ بھاوت سجنی
مورا پیا کب آوت سجنی
راہ باٹ تکت ہوں کب سے
کاہے کھبریا نہ لاوت سجنی
مورا پیا کب آوت سجنی

محمد جلال الدین حکم نے بھی اردو میں ٹھمریاں خوب لکھی ہیں۔ انہوں نے عادل شاہی حکمرانوں ابراہیم عادل شاہ نورس اور علی عادل شاہ ثانی شاہی کی طرح ہندوستانی موسیقی کی مختلف نغمہ پر مشتمل نظموں کا مجموعہ مرتب کیا ہے۔ جس کا نام "پیت کی ریت" ہے۔ جس پر آغا حیدر حسن نے مقدمہ لکھا ہے۔

حلم کی دو ٹھمریاں ذیل میں درج کی جاتی ہیں

۱۔ ٹھمری دھناسری (سہ پہری)

دور نہیں میں پاس ہوں تیرے
میرے کو کوئی ڈھونڈھو تو
پھرو جدھر مکھ سامنے ہوں میں
کھول کے آنکھیں دیکھو تو
حلم نہیں میں اور ہی کچھ ہوں
جانو بوجھو سوچو تو

۲۔ ٹھمری شاہانہ (دوپہر رات)

یہ کام کسو کی یاری ہے	میں اور مورا یار بھلا
سارے گھٹ ہوں سانوریا مائیں	ہر پل مورے سنگ ہے مائیں
ہر گھٹ میں واکی پرچھائیں	خلوت سے باز رہ بھلا
ہتی گھوڑا اونٹ چڑھت ہیں	دھن دولت سب پاس رکھت ہیں
بھولی کب جگ دھندے میں	حلم کو سب کار بھلا

حلم نے حیدرآبادی زبان میں ٹھمریاں تصنیف کی ہیں اور یہ ایک نئی روایت ڈالنے کی سعی ہے اس لئے کہ عموماً ہندوستانی موسیقی پر لکھی جانے والی ٹھمریوں میں برج آمیز لہجہ اختیار کیا جاتا ہے۔

عہدِ عثمانی کے امراء میں راجہ نرسنگ راج بہادر عالی، راجہ محبوب راج محبوب بھی شامل ہیں۔ دونوں ہی عہدِ عنفوان مکاں کے راجہ محبوب نواز ونت باقی کے لڑکے ہیں۔ دونوں اچھے شاعر تھے۔ راجہ گردھاری پرشاد محبوب نواز ونت بھی اچھے شاعر تھے اور باقی تخلص کرتے تھے۔ راجہ نرسنگ راج عالی کو جلیل سے تلمذ حاصل تھا۔ اکثر مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر کے مشاعروں میں کلام سنایا کرتے تھے۔ راجہ محبوب راج محبوب، عالی کے چھوٹے بھائی تھے۔

عالی کو شاعری سے بچپن ہی سے لگاؤ تھا۔ زیادہ تر غزل اور رباعی میں طبع آزمائی کی ہے۔ باوجود جلیل کے شاگرد ہونے کے کلام میں داغ کا انداز و رنگ ملتا ہے۔ چند شعر غزل کے ملاحظہ ہوں :

سر بھی سودائے محبت میں دیا جان بھی دی   کس گرانی سے ہوا دیکھئے سودا اپنا

وہ گھڑی کیسی مبارک تھی خدا پھر لائے   روٹھنا ان کا شب وصل منانا اپنا

زاہد خشک کچھ سنا کر پی کر   ہم سنیں گے سرور کی باتیں

درد بے آرام جاں اور موت بھی اک نیند ہے   کب تڑپتا ہے مریضِ عشق درماں کے لیے

مالک ہیں آصف سابع زہے نصیب   صد شکر ہے کہ عالی بھی ان پر نثار ہے

عالی کے بھائی راجہ محبوب راج محبوب سنہ ۱۳۴ ھ میں آنجہانی بن گئے۔ عالی ابھی حیات تھے انھیں بھائی کی جدائی کا شدید صدمہ پہنچا۔ غم و اندوہ کے عالم میں مرثیہ لکھا اور چند رباعیوں میں بھی بھائی کی یاد کو بیان کیا ہے۔ مرثیہ مربع کی ہیئت میں لکھا ہے۔ دو بند ذیل میں درج کیے جاتے ہیں :

مرے دوست احباب سن لیں کہ کیا ہے — یہ عالیؔ کے مجروح دل کی صدا ہے
یہ محبوبؔ کا ماتمی مرثیہ ہے — مرے پیارے بھائی مرے پیارے بھائی
میں کس سے کروں تیری فریاد بھائی — سناؤں کسے تیری بیداد بھائی
تری یاد کردے گی برباد بھائی — مرے پیارے بھائی مرے پیارے بھائی

عالیؔ کے چھوٹے بھائی کا نام محبوب راج تھا جو کہ ان کی پیدائش پر حضرت غفراں مکاں نے تجویز کیا تھا۔ راجہ گردھاری پرشاد محبوب نواز ونت باقیؔ کے گھر ۱۳۱۲ھ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مدرسہ عالیہ میں حاصل کی۔ اٹھارہ انیس برس کی عمر سے شعر کہنا شروع کیا۔ محبوبؔ تخلص اختیار کیا۔ ویسے شاعری انھیں ورثہ میں ملی تھی۔ ابتداء میں مہاراجہ کشن پرشاد شادؔ سے اصلاح لی اور پھر شادؔ ہی کی ایماء پر جلیلؔ سے کلام پر اصلاح حاصل کی۔ مہاراجہ شادؔ کے مشاعروں میں بھی محبوب نے شرکت کی۔ محبوب کے کلام میں بیشتر غزلیں ملتی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ انھیں غزل بہت زیادہ پسند تھی۔ زبان صاف سادہ سلیس استعمال کرتے ہیں۔ کلام میں موضوعات کا تنوع ملتا ہے۔ چند شعر دیکھیے:

سلسلہ وحشت کا لکھا تھا مری تقدیر میں — باندھ رکھا ہے جنوں نے زلف کی زنجیر میں
دنیا سرائے سمجھ کے مسافر ٹھہر گئے — گزرے تھے چار دن کہ یہاں سے گزر گئے
کیا خاک ہو لطف زندگی کا — جب کا نہ ہو جس کو عاشقی کا
نہیں بوئے وفا کسی گل میں — ہر گلستاں میں جا کے دیکھ لیا
ڈھونڈا سارا جہاں مگر تجھ کو — دل کا پردہ اٹھا کے دیکھ لیا

عہدِ عثمانی کے جن شعراء کا ذکر ان صفحات پر کیا گیا ہے۔ وہ امراء کے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے کلام میں ندرت بھی ہے مضامین کا تنوع بھی ان کے یہاں ملتا ہے لیکن فکری عنصر کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ ان شعراء میں کسی نے بھی اپنے عہد کی ترجمانی نہیں کی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمام شاعر ایک ہی ڈگر پر چل رہے ہیں اور یکساں مضامین باندھ رہے ہیں لیکن ان شعراء کے کلام کی ایک خصوصیت ایسی ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ان شعراء نے زبان و بیان بڑی شستہ صاف، بامحاورہ لکھی ہے۔ روزمرہ بھی ان کے کلام کا جز ہے — اور یہ ایک خصوصیت کوئی معمولی نہیں۔ سنہ ۱۸۵۷ء کے بعد بیرونی شعراء کی حیدرآباد میں بکثرت آمد نے دکنی لب و لہجہ کو صاف کر دیا اور عہدِ عثمانی میں یہ زبان کوثر و تسنیم سے دھلی ہوئی معلوم ہوتی ہے —

عہدِ عثمانی کے امراء شعراء کے علاوہ اس عہد میں متعدد ایسے شعراء موجود تھے جو کسی نہ کسی شکل میں سلطنتِ آصفیہ کی خدمت میں مصروف تھے اور ساتھ ہی ساتھ شعر و سخن کی مشقت میں بھی مشغول تھے۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ نے اپنی تصنیف "عہدِ عثمانی میں اردو کی ترقی" میں ایسے بے شمار شعراء کا ذکر کیا ہے۔ اس باب میں چند اہم اور نامور شعراء عہدِ عثمانی کا ذکر و تذکرہ کیا جاتا ہے۔

محمد حیدر دلؔ فلاطون جنگ لقمان الدولہ اشرف الحکماء خطابات تھے ۱۲۹۹ھ میں پیدا ہوئے۔ حیدرآباد میں ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کرنے والے اولین ڈاکٹرز میں سے ہیں۔ شاعری کا شوق بچپن ہی سے تھا۔ شمس الدین فیضؔ کے شاگرد تھے ان سے اصلاح

لیا کرتے تھے۔ تصوف سے دلچسپی تھی۔ شعر میں مسائل تصوف کا بیان خوب کرتے ہیں۔ نثر میں اُن کی دو تصانیف ملتی ہیں "سوانح حاتی" اور "نماز دل"۔ دیوان مرتب کیا تھا لیکن شائع نہ ہوا۔ نمونہ کلام درج ذیل ہے:

دل کا آنا جی کا جانا ہو گیا — آنکھ لڑ جانا بہانہ ہو گیا

تذکرے ہوتے ہیں اب تو جا بجا — یار کا سر افسانہ ہو گیا

بے کسی حسرت و ارماں کا ہے ہمراہ ہجوم — دیکھو کس شان سے نکلا ہے جنازہ دل کا

دل کو جلا دیا ہے مشعل بنا لیا ہے — دل ہی کی روشنی سے پھر دل کو ڈھونڈتے ہیں

کوئے قاتل میں چلو جو ہو سو ہو — جان اک دن جانے والی جائے گی

سید غلام مصطفیٰ نام ذہین تخلص اسی زمانے کے اہم شاعر ہیں۔ جنھوں نے امجد حیدرآبادی ہی کی طرح اخلاقی مضامین شعر میں بیان کرتے ہیں۔ نظم و غزل دونوں میں یکساں مہارت حاصل ہے۔ اخلاقی نظموں کے ساتھ معرفت اور تصوف کے مضامین میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ بچوں کے لئے بھی بیشتر نظمیں لکھی ہیں۔ ذہین نے پوری پوری کوشش کی ہے کہ بچوں کے لئے لکھی گئی نظموں کی زبان بہت سادہ اور آسان ہو چنانچہ اپنی بیشتر نظموں میں بچوں کے روزمرہ کو برتا ہے۔ ۱۲۶۹ھ میں انتقال کیا۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو:

نظم شیریں کلامی

ترے دم سے دنیا میں خلق و مروت — ترے خلق سے لطف و اکرام و راحت

ترے لطف سے فیض و جود و عنایت　　ترے فیض سے رحم و احسان و رحمت

تری رحمتیں سایہ گستر جہاں پر

ترا سایہ ظلِّ ہما سے ہے بڑھ کر

غزل کے اشعار کا نمونہ ملاحظہ ہو :

سب ہیں فانی کیا زمیں کیا آسماں کچھ بھی نہیں　　اک خدا کو ہے بقا دونوں جہاں کچھ بھی نہیں

زندگانی کا زمانے میں بھروسہ کیا ہے　　جز فنا ہونے کے انسان میں رکھا کیا ہے

حیات و خرد کی سی نعمت ملی　　پھر اب کیا تجھے اے بشر چاہیئے

ذہین ہی کی طرح غلام مصطفیٰ رسا بھی اس دور کے ایک نامور شاعر ہیں۔ بچپن ہی سے شعر کہتے تھے۔ داغ سے اصلاح لی اور خود استادی کے درجہ پر فائز ہوئے۔ داغ کے ممتاز تلامذہ میں شمار ہوتا ہے۔ شاعری کی جملہ اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ کلام کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تخیل کی بلند پروازی رسا کے یہاں نہیں پائی جاتی لیکن معنی آفرینی ملتی ہے اور شعر عموماً پُر اثر ہوتا ہے — کلام پر داغ کا انداز نمایاں ہے — چند شعر دیکھیے :

شوخی سے بچا دل تو پھنسا دامِ حیا میں　　سو طرح کے انداز ہیں ظالم کی ادا میں

ناکامِ محبت کو تدبیر سے کیا حاصل　　پہلو مرے بچ کر تقدیر نکلتی ہے

وصل کی کوئی تدبیر نکالی ہوتی　　میں ہوں مجبور مگر آپ تو مجبور نہیں

ایسا مٹا کہ نام و نشاں تک نہیں رہا　　کیوں اے فلک میں مظہرِ شانِ ظہور تھا

علامہ علی حیدر طبا طبائی تخلص نظم سلسلہ عثمانی کے ایک شاعر ہیں۔ سنہ ۱۲۷۰ھ میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد نواب واجد علی شاہ کے شہزادے مرزا کام بخش کی تعلیم و تربیت کے لئے نامزد ہوئے چنانچہ ایک عرصہ تک مٹیا برج کلکتہ میں قیام رہا۔ سنہ ۱۳۰۵ھ میں جب اختر پیا نے داعی اجل کو لبیک کہا تو نظم نے حیدرآباد کا رخ کیا۔ نظام کالج میں فارسی و عربی کے پروفیسر مقرر ہوئے بعد ازاں دارالترجمہ میں تقرر عمل میں آیا۔ سنہ ۱۹۰۰ء میں کلام غالب کی شرح حیدرآباد ہی میں لکھی۔

نظم طبا طبائی نے جملہ اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے ــــ قصاید میں زور طبع دکھایا ہے۔ بیشتر قصائد سیرت النبیؐ سے متعلق ہیں۔ بقول نصیر الدین ہاشمی قصیدے اتنی مہارت سے لکھے ہیں کہ انیس کے بعد کسی اور نے نہیں لکھے۔ غزل اور نظم میں بھی زور طبع دکھایا ہے۔ نظم طبا طبائی انگریزی سے اچھی واقفیت رکھتے تھے چنانچہ انگریزی کی مشہور نظموں کو اردو کے قالب میں ڈھالا ہے خصوصاً گرے کی "Elegy" کو "گور غریباں" کے نام سے اس خوبی سے ترجمہ کیا کہ یہ نظم مثال بن گئی ہے۔ ذیل میں "گور غریباں" کا ایک بند نقل کیا جاتا ہے۔ "گور غریباں" پر شام کے منظر کو دیکھیے کس مہارت سے بیان کیا ہے ۔

اندھیرا چھا گیا دنیا نظر سے چھپتی جاتی ہے   جدھر دیکھو اُٹھا کر آنکھ ادھر اک ہو کا ہے عالم

مگس لیکن کسی جا بھیرویں بے وقت گاتی ہے   جرس کی دور سے آواز آتی ہے کبھی مبہم

نظم طباطبائی کے سینکڑوں تلامذہ تھے۔ جن میں رعد نے انفرادیت پیدا کی۔

میر نادر علی نام اور تخلص رعد تھا۔ شعلہ کے فرزند تھے۔ شاعری ورثہ میں ملی تھی۔ ابتداء میں شعلہ سے کلام پر اصلاح لی بعد ازاں نظم طباطبائی کے آگے زانوے ادب طے کیا۔ مشق سخن کے ذریعہ استاد سخن بن گئے۔ اُردو کے مشہور اساتذہ کے رنگ میں کلام موزوں کیا ہے۔ جس میں کامیاب بھی دکھائی دیتے ہیں۔ نمونۂ کلام دیکھیے:

طالب تو بے شمار ہیں میرے سوا مگر　　مطلوب دوسرا نہیں تیرے سوا مجھے

حال دل سے وہ میرے واقف ہے　　حاجتِ نامہ و پیام نہیں

اہلِ دلاں پہ گرتی ہے برقِ بلائے ناز　　لیکن متاعِ صبر طلب گار دیکھ کر

دل گیا، جان گئی، سب ہوئے مہماں رخصت
نہ گئی میرے گھر تو شبِ فرقت نہ گئی

میر تراب علی خاں سعید، میر مہدی علی شہید اور میر معین الدین علی خاں شباب بھی اسی عہد کے شاعر ہیں۔ شباب کا تعلق خاندان آصفی سے تھا۔ صاحبزادہ کہلاتے تھے۔ حبیب کنتوری سے اصلاح لی۔ اُن کے انتقال کے بعد ضامن کنتوری سے رجوع ہوئے۔ شباب کے کلام میں لطافتِ زبان، طرزِ ادا کی ندرت اور سادگیٔ زبان ملتی ہے۔ نمونۂ کلام دیکھیے:

ہم کو دونوں جہاں سے کھویا　　یا خدا ہو بُرا محبت کا

آپ اُف اُف جو کر رہے ہیں شباب　　کیا کلیجے کے داغ جلتے ہیں

کہتے ہیں اپنے چہرے سے سرکار کے زلف کو
لو آج آفتاب گہن سے نکل گیا

اللہ رے شوق دید میں قبلہ نما بنا
آنکھیں اسی طرف کو پھیریں تم جدھر گئے

وہ بے قرار ہو کے چلے آئے میرے گھر
تردید نارسائی آہ رسا تو کی

دن نکل آئے جو اٹھے شب کو وہ رخ سے نقاب
گیسوئے مشکیں بکھر جائے جو دن میں شام ہو

شتاب ہی طرح عزیز بھی طبقہ امراء سے تعلق رکھتے ہیں۔ محمد عزیز الدین خاں نام عزیز تخلص اور عزیز یار جنگ بہادر خطاب تھا۔ عہد عثمان مکان کے شاعر مشرف جنگ فیاض کے فرزند تھے۔ شاعری ورثہ میں ملی تھی۔ عربی فارسی اور انگریزی میں مہارت حاصل تھی۔ داغ کے ممتاز تلامذہ میں شمار ہوتے ہیں۔ چنانچہ داغ کے رنگ کو خوب نبھایا ہے دو دیوان شائع ہوئے ہیں ایک غزل بطور نمونہ کلام درج کی جاتی ہے۔

اضطراب دل و جگر دیکھو — لوٹتے ہیں ادھر ادھر دیکھو
دھجیاں ہیں مرے گریباں کی — جیب میں ہاتھ ڈال کر دیکھو
راز عشق ہے آشکارا نہ ہو — میں ادھر دیکھوں تم ادھر دیکھو

بے وفا کون، با وفا ہے کون — ذرا تم دل میں سوچ کر دیکھو
دیکھتا ہوں نگاہِ ناز کو میں — تم ادھر دیکھو یا اُدھر دیکھو
بت کدہ ہے اُٹھو عزیز چلو — دوسرا اور کوئی گھر دیکھو

محب حسین محب اسی زمانے کے ایک ہمہ جہت ادیب و شاعر ہیں۔ وہ ادیب، شاعر، مدیر، تعلیم نسواں کے داعی، مفسر، مترجم و مبلغ تھے۔ اٹاوہ میں پیدا ہوئے لیکن حیدرآباد کو وطن ثانی بنالیا۔ متعدد نثر و نظم کی کتابوں کے مصنف و مرتب ہیں۔ دیوان و کلیات کے علاوہ متعدد مثنویوں کے علاوہ "پہلا جرم" اور "سوانح امیر علی ٹھگ" ترجمہ ناول شائع ہو چکے ہیں۔ خطوطِ محب حسین بھی شائع ہو چکے ہیں۔ "معلم شفیق" "معلم نسواں" جیسے رسائل عرصہ تک شائع کرتے رہے۔ ۱۳۴۸ھ میں انتقال کیا۔ اکثر مسلسل غزل کہتے ہیں، جس میں نظم کا انداز پایا جاتا ہے۔ ایک غزل کے تین شعر دیکھئے غزل کیا ہے تعلیم نسواں پر نظم معلوم ہوتی ہے ؎

ہماری قوم بھی ضدی بڑی ہے — پرانی ریت رسموں پر اڑی ہے
عجب مشکل ہے تعلیم نسواں — یہی سر پر ہے ہستی کی گھڑی ہے
ہمارے حال پہ روتا ہے بادل — نہیں بارش یہ اشکوں کی جھڑی ہے
لہو کا جام ہے یہ ساغرِ شراب نہیں — بھڑکتی آگ کا شعلہ ہے آفتاب نہیں

جامعہ عثمانیہ کا قیام اور جامعہ کے ادیب و شعرا :

حیدرآباد میں اُردو ذریعہ تعلیم کی ایک یونیورسٹی کے قیام کا تذکرہ سب سے پہلے عہد مختار الملک میں پیدا ہوا تھا۔ دراصل ۱۲۹۲ھ م ۱۸۷۵ء میں شیخ احمد حسین خاں رفعت یار جنگ اول نے حیدرآباد میں ایک اُردو یونیورسٹی کے قائم کرنے کے لیے ایک تحریری یادداشت مختار الملک کی خدمت میں پیش کی تھی جس پر مختار الملک نے اپنی پسندیدگی کا اظہار کرنے کے ساتھ ساتھ رفعت یار جنگ کو یہ بھی لکھا تھا کہ تمہاری تحریر کے ایک ایک حرف سے میں متفق ہوں۔ مجھے خوشی ہوئی۔ لیکن سیاسی پیچیدگیوں کی وجہ سے مختار الملک نے یونیورسٹی کے قیام کے سلسلہ میں کوئی قدم نہ اٹھایا۔ رفعت یار جنگ بہادر، نواب مختار الملک بہادر صدر المہام کے قائم کئے ہوئے مدرسہ دارالعلوم کے فیض یافتہ تھے اور ترقی کر کے مولوی شیخ احمد سے رفعت یار جنگ بہادر ہو گئے تھے۔

دارالعلوم کے اس سپوت نے اپنی تجویز کے رد ہونے سے ہمت نہیں ہاری اور انہوں نے نو برس بعد ۱۳۰۱ھ میں اس وقت اپنی تجویز شاہ وقت کے سامنے پیش کی جب نواب میر محبوب علی خاں آصف جاہ سادس محبوب باغ/ باغ عامہ میں ایک جلسے کی صدارت بہ نفس نفیس فرما رہے تھے۔

رفعت یار جنگ نے اس جلسہ میں نظام یونیورسٹی کی تجویز پیش کی جو کہ ایک ایک برطانوی پارلیمنٹ کے ایک معزز رکن مسٹر بلنٹ کے تخیل "جامعہ مشرقیہ" سے ماخوذ تھی۔ اس جلسہ کے کچھ عرصہ بعد آصف جاہ سادس معہ عمادالسلطنت پیل گری کے باغات کی سیر فرما رہے تھے اسی زمانے میں علی گڑھ محمڈن کالج کے بانی سرسید احمد خاں نے آصف جاہ سادس سے ملاقات کی تھی۔ اس ملاقات پر جریدۂ روزگار نے ذیل کی خبر شائع کی۔

"ہم سمجھتے ہیں کہ صاحب ممدوح نظام یونیورسٹی کی بنا
کی مشورت کے لئے طلب کئے گئے ہیں۔ مگر بقول
محمد مرتضیٰ یہ تحریک ایک بجلی تھی اور غائب ہو گئی"

۱۳۱۲ھ میں مشرقی یونیورسٹی کی تجدید اہل دانش نے پھر سے آصف جاہ سادس کی خدمت میں پیش کی۔ اس برس نظام کالج کے جلسہ تقسیم انعامات آصف جاہ سادس کی صدارت میں منعقد ہوا۔ شاہ وقت کی موجودگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اور جلسہ کی اہمیت کا اندازہ لگاتے ہوئے وزیر اعظم آصفیہ سلطنت وقار الامراء نے خود یونیورسٹی کے قائم کرنے کی تجویز پیش کی۔ یہ تجویز چونکہ وزیر اعظم نے خود شاہ وقت کی موجودگی میں پیش کی تھی۔ اس لیے ایسا معلوم ہونے لگا کہ حکمران ملک اس تجویز کو فوری منظوری دے دیں گے اور یہی وجہ تھی علامہ شبلی نعمانی نے اپنے ایک مقالہ میں جو کہ

الندوہ میں شائع ہوا یہ ارادہ ظاہر کیا کہ وہ دارالعلوم ندوہ کو اس مشرقی یونیورسٹی سے ملحق کر دیں گے ۔ لیکن مشرقی یونیورسٹی کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوا ۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور مشرقی یونیورسٹی یا نظام یونیورسٹی کے سلسلے میں پیش کردہ ان تجاویز اور ان کی ناکامی کے اسباب بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"غرض اس قسم کی جملہ تحریکیں ناکام رہیں۔ مگر اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس زمانہ میں حیدرآباد میں عام طور پر علمی بیداری پیدا ہو چلی تھی اور خاص کر دارالعلوم کے فیض یافتوں نے ملک کے علمی ارتقاء میں خاطر خواہ جد و جہد شروع کر دی تھی ۔ ملا عبدالقیوم، مولوی اکبر علی، رضی الدین حسن کیفی، مولوی عبدالقدیر صدیقی، محمد مرتضیٰ، مولوی مرزا محمد بیگ اور مولوی محمد مظہر وغیرہ جیسے درجنوں صاحب علم و فضل اور اہل دل افراد پیدا ہو گئے تھے، جنہوں نے اپنی زندگیاں اسی علمی و ادبی جد و جہد میں گزار دیں اور حیدرآباد کی ترقی کی نسبت تحریر و تقریر اور نظم و نثر کے ذریعہ تخلیقی خیالات کی اشاعت کی۔ ان سبھوں کے دل کی آرزو تھی کہ

ملک میں ایک اپنی یونیورسٹی قائم ہو اور اس کا ذریعۂ تعلیم
اُردو ہو چنانچہ جب حضرت سلطان العلوم میں ان کی
مالیہ عیاں کامیابیوں کی شکل میں منتقل ہونے لگی تو انہوں
نے ایک انجمن طلبا قدیم دارالعلوم قائم کی۔۔۔ ان کے
مطبوعہ ضابطہ میں بھی انجمن کا ایک مقصد یہ درج کیا
ہے کہ " دارالعلوم کے یونیورسٹی کے درجہ پر پہنچنے کی
کوشش کرنا ـــــ " [1]

مشرقی نظام یونیورسٹی کی یہ جدوجہد جاری تھی کہ محمد مرتضیٰ نے "روح ترقی"
نام سے ایک کتاب ۱۳۲۲ھ میں لکھی اور تفصیل سے اس یونیورسٹی کی ضرورت کو
بیان کیا اسی کے ساتھ انہوں نے یہ بھی واضح کیا کہ یونیورسٹی سطح پر جب تک تعلیم کا
انتظام نہ ہوگا حیدرآباد ترقی نہیں کرسکتا۔ انہوں نے یہ بھی لکھا کہ اگر یونیورسٹی قائم
ہو تو اس کا ذریعہ تعلیم اُردو ہونا چاہیئے ـــــ "روح ترقی" میں وہ لکھتے ہیں:

"ابنائے ملک اسی طرح وقت ترقی کر سکتے ہیں جبکہ وہ
اپنی اس عام زبان (اُردو) کو تازہ رکھیں۔ مغربی
سیلاب کے ساتھ اس آواز کی ترقی اس مجنونانہ خبر
کی تکذیب کرتی ہے کہ ایک دن مغربی زبان (انگریزی)

---

[1] ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور "عہد عثمانی میں اُردو کی ترقی" ص ۸۷ ۱۹۳۶ء

ہماری اصل زبان ہو جائے گی۔ ایسا خیال قدرت کے ساتھ
بے سود جنگ کی تیاری ہے جس میں ناکامی کے سوا اور
کچھ حاصل نہیں۔ وہ دکن ہے جس نے ملکی لحاظ سے اردو
کی ضرورت سمجھی اور بندگان عالی (آصف جاہ سادس)
کے عہد میمنت عہد میں اردو کو یہ عظمت نصیب ہوئی کہ
وہ ہندوستان کی اعلیٰ دیسی حکومت کی سرکاری زبان
ہے۔ حضور شاہ دکن کی مربیانہ نظر عاطفت اور فیض عام
نے ہی اردو زبان کے اعلیٰ سے اعلیٰ مصنفین کو یہ طاقت
بخشی کہ وہ اپنے گراں پایہ نتائج علم کو دوسرے نامور
علمی مرکز کے پُر مغز جدید تحقیقات سے گھٹے ہوئے نہ
ہوں دنیا کے روبرو پیش کریں جن سے اردو زبان
کلاسیکی زبانوں کی اعلیٰ صف میں نظر آئے۔ اس
بناء پر حیدرآباد اردو کا اصلی مرکز ہو سکتا ہے اور
سلطنت کا استحکام اس میں منحصر ہے کہ اس ہی
زبان کو تمام ملکی تعلیم کا آلہ قرار دیا جائے اسی میں
شاہ کی اطاعت ہے اور اسی میں ملک کی بہبودی۔
اردو عام تعلیم کے لیے کافی صلاحیت رکھتی ہے اور
اس کے برخلاف بیانات محض لغو ہیں۔" [1]

۱۔ محمد مرتضیٰ "روح ترقی" ص ۲۵-۲۶ سنہ اشاعت ۱۳۲۲ھ

۱۳۳۲ھ میں محمد مرتضیٰ[10] اور ملا عبدالباسط نے دارالعلوم کے چند قدیم طلباء
کو جمع کیا اور "دارالعلوم کے قدیم طلباء کی انجمن" قائم کرنے کی سعی کی۔ چار اجلاس
قدیم طلباء کے منعقد ہوئے اور حیدرآباد میں تعلیم کو عام کرنے کی غرض سے "حیدرآباد
ایجوکیشنل کانفرنس" قائم کی گئی۔ اس انجمن کے قیام کے بعد تالیف و ترجمہ کے
کام کی جانب توجہ دی گئی اور ۱۷؍شوال ۱۳۳۲ھ کو دارالعلوم کا جشن ساٹھ سالہ
بڑے اہتمام سے منایا گیا۔ اس جلسہ کی صدارت نواب میر یوسف علی خان
سالار جنگ سوم مدارالمہام نے کی۔ اس جلسہ میں نواب فخر الملک بہادر معین المہام
اور ارباب تعلیمات موجود تھے۔ اس موقع پر دارالعلوم کی نسبت اصلاحی تجاویز
کا ذکر کرتے ہوئے قیام جامعہ نظام کی ضرورت پر زور دیا گیا۔ اقتباس دیکھیے:

> "ہمارے ملک میں دارالعلوم قائم ہے جس کے امتحانات
> ہمارے ہی ہاتھوں میں ہیں۔ ضرورت ہے کہ ان کی
> بنا مستحکم طور پر قائم ہو یا بالفاظ دیگر نظام
> یونیورسٹی قائم کی جائے۔ مشرقی یونیورسٹی قائم
> ہونے کے لیے حیدرآباد میں کسی قسم کی کوئی دقت
> نہیں ہے۔ ایک ایسی مجلس کا قیام جو سنڈیکیٹ
> کے فرائض محلاً انجام دے بالکل سہل و آسان ہے
> جس کا دائرہ بتدریج وسیع ہوگا"

اس تجویز و تحریک کو مدارالمہام نے منظور کیا اور ایک سال بعد ایجوکیشنل

کانفرنس کے دوسرے سالانہ اجلاس اورنگ آباد میں منعقد ہوئے جس کی صدارت مولوی شیخ محمد حبیب الدین مرحوم صدر محاسب سرکار عالی نے کی۔ اپنی صدارتی تقریر میں انہوں نے قیام جامعہ کی بابت گذشتہ برسوں میں پیش کردہ تجاویز و تحریکوں کا تذکرہ کرنے کے بعد مدلل انداز میں جامعہ کے قیام پر زور دیا ـــــ ایک اقتباس دیکھیے :

"اس کانفرنس کے اجلاس کا یہ دوسرا سال ہے اور اب وہ وقت آگیا ہے کہ ہم اپنی ترقی تعلیم کے اہم کام کے لیے انتہائی مقصد مرکوز خاطر رکھیں اور اس کے حاصل کرنے کے لیے متفقہ کوششیں کی جائیں۔ ہمارا مقصد اعلیٰ ترقی تعلیم تو ہے لیکن لفظ تعلیم بہت سے شعبوں پر حاوی ہے۔ مثلاً اعلیٰ تعلیم، تعلیم ثانویہ، تعلیم ابتدائی، تعلیم نسواں، اخلاق، جسمانی صنعت و حرفت و زراعت وغیرہ کی تعلیم۔ یہ سب شعبے بجائے خود مکمل نہیں ہو سکتے جب تک ممالک محروسہ سرکار عالی میں بلحاظ حالات ملک و مقاصد رعایا ہمارا ایک جامع العلوم یعنی یونیورسٹی قائم کی جائے کیونکہ جب ہم اپنے ملک کی خصوصیات پر نظر ڈالتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ ہمارے ملک میں حاکم و

محکوم کی جداگانہ قومیں نہیں ہیں اور ہماری حکومت
ہم سے مختلف المزاجی نہیں رکھتی ہے اور خوش قسمتی
سے اس ریاست دکن میں ہندوؤں اور مسلمانوں
کی تہذیب صدیوں کے میل جول سے ممتزج و مرکب
ہو گئی ہے اور یہاں کے روشن دماغ حکمرانوں نے ہمیشہ
کشادہ دلی اور فیاضی سے دونوں کی مدارات و دلجوئی
رکھی ہے۔ پس یہ وہ پاک خطہ ہے جہاں جامعہ العلوم
جیسی ایک عظیم الشان درسگاہ کا قیام ہر طرح سے
مناسب و موزوں ہے جو مغربی علوم وفنون کی تعلیم
اور اختراعات و ایجادات کے مواقع پیدا کرنے کے
ساتھ ساتھ علوم مشرقیہ کا مامن اور دلکش
مسکن بن سکے اور جس میں مشرق کے مختلف
علوم ادبیہ اور دقیق فلسفہ حکمت اور تصوف
اور تصوف اور حیرت انگیز اخلاقی و مذہبی تمدن
اور تعجب خیز صنائع و بدائع قدیم کے خزائن فراہم
کئے جا سکیں ۔

دنیا میں انسان جواہر معنوی کو کوئی اس جوش
سے ظہور میں نہیں لا سکتی اور علما و فضلاء وقت

کا مرکز نہیں بنا سکتی جیسی وہ یونیورسٹی بنا سکتی ہے
جس کو ابنائے ملک اپنی سعی اپنے اہتمام اپنے
ملک کے پیسے اپنی دماغی محنت اپنے علو ئے
ہمت اپنی حکومت کے ذریعہ قائم کریں اور جس
کو وہ اپنی یونیورسٹی کے نام سے پکاریں —
چنانچہ ہماری ہمسایہ ریاست میسور —
قیام یونیورسٹی پر رجوع ہے جس پر ملک کی اخلاقی و
دماغی ترقی کا انحصار ہے میری دلی تمنا اور پر خلوص
دعا اپنے ملک کے لئے بھی یہی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ
وہ دن دور نہیں ہے جب ہمارے ملک کی ضرورت
کے لحاظ سے ہمارے یہاں کے بھی جامع العلوم کا سنگ
بنیاد ہمارے ہر دلعزیز علم پرور بادشاہ ظل اللہ
میر عثمان علی خاں بہادر دام اقبالہ و زید اجلالہ
کے دست مبارک سے رکھا جائے گا۔" [۱]

مولوی حبیب الدین نے خلوص دل کے ساتھ دعا کی تھی۔ بارگاہ رب العزت
میں مقبول ہوئی اور نواب آصفجاہ سابع کے معتمد تعلیمات نے شاہ وقت نواب

---

[۱] بحوالہ "جامعہ عثمانیہ میں اردو کی ترقی" از ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور ص ۱۹۲

میر عثمان علی خان کی خدمت میں ۱۹۱۷ء م ۱۳۳۶ھ میں قیام جامعہ کی اجازت کے لیے عرضداشت پیش کی۔ معتمد تعلیمات کی اس عرضداشت کا توضیحی اور بغور جائزہ لینے کے بعد آصف جاہ سابع نے یہ درج ذیل فرمان جاری فرمایا ـــ

"اس یونیورسٹی کا اصل اصول یہ ہونا چاہئے کہ
اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ ہماری زبان اردو قرار دیا جائے
اور انگریزی زبان کی تعلیم بھی بحیثیت ایک زبان
کے ہر طالب علم پر لازمی گردانی جائے لہٰذا میں
بہت خوشی کے ساتھ اجازت دیتا ہوں کہ میری
تخت نشینی کی یادگار میں حسب مذکور اصول
محولہ عرضداشت کے موافق ممالک محروسہ کے لیے
حیدرآباد میں یونیورسٹی قائم کرنے کی کارروائی
شروع کی جائے۔ اس یونیورسٹی کا نام "جامعہ
عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد" ہوگا"

اعلیٰ حضرت کے اس فرمان کے جاری ہوتے ہی محکمۂ تعلیمات نے قیام جامعہ کی تیاری جلد سے جلد مکمل کرلی اور آخرکار ۱۹۱۸ء میں ایک منشور خسروی صادر ہوا جس کے ذریعہ اعلیٰ حضرت نے یونیورسٹی کی پوری تنظیم اس منشور خسروی کے اہم اور خاص خاص اجزاء کا بیان ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

نے اس طرح کیا ہے:

"چونکہ مابدولت واقبال کو اپنی عزیز و وفادار رعایا کی
فلاح و بہبود بدرجۂ اتم مد نظر ہے اور مقصد اعلیٰ
صرف اس صورت میں بوجہ احسن حاصل ہو سکتا ہے
کہ موجودہ انتظام تعلیم ممالک محروسہ سرکار عالی
کو بیرون جامعات سے مناسب حد تک آزاد و مستغنی
کرکے اصلی انتظام ملکی خصوصیات و حالات
کے اعتبار سے خود اندرون ملک کیا جائے اور مابدولت
واقبال حکم صادر فرماتے ہیں کہ:

۱۔ حیدرآباد دکن میں ایک جامعہ (یونیورسٹی) بنام
جامعہ عثمانیہ یکم محرم الحرام ۱۳۳۷ھ سے قائم
کیا جائے۔

۲۔ جامعہ عثمانیہ کا مقصد یہ ہے کہ مذہبی، اخلاقی، ادبی،
فلسفی، طبیعی، طبی، قانونی، زراعتی، تجارتی، اعلیٰ
تعلیم کا اور دیگر مفید علوم و فنون، سود مند
پیشوں اور صنعت و حرفت وغیرہ سکھانے
اور ان سب میں تحقیقات و ترقی کا انتظام کرے۔

۳۔ جامعہ عثمانیہ کی خاص خصوصیت یہ ہوگی کہ جملہ

علوم کی تعلیم زبان اردو میں دی جائے گی اور اس
کے ساتھ انگریزی زبان وادب کی تعلیم لازمی ہوگی وغیرہ"

الغرض نواب میر عثمان علی خان آصف جاہ سابع کے منشور کے مطابق یکم محرم ۱۳۳۷ھ کو جامعہ عثمانیہ قائم ہوگئی لیکن جامعہ میں باضابطہ تعلیم کا آغاز ماہ ذی الحجہ ۱۳۳۷ھ م ۱۹۱۹ء اگست سے ہوا جبکہ اردو زبان کی تاریخ میں سب سے پہلی دفعہ ایک ایسے کالج کا افتتاح عمل میں آیا۔ جس میں جملہ علوم و فنون کی تعلیم یعنی درس و تدریس اردو میں دی جاتی تھی ۔ جامعہ عثمانیہ کو یہ اعزاز ہمیشہ حاصل رہے گا کہ وہ دنیا کی پہلی جامعہ ہے جس میں اردو میں اعلیٰ سے اعلیٰ فنی اور کلیاتی تعلیم کا انتظام و التزام کیا گیا ۔

جامعہ عثمانیہ کے قیام کے بعد اردو ادب کو بے انتہا فروغ حاصل ہوا ۔ آصف جاہ کی دلچسپی کی وجہ سے اردو کی انجمنیں وجود میں آئیں تصنیف و تالیف کو فروغ ملا ۔ سارے ہندوستان میں جامعہ عثمانیہ کے چرچے ہونے لگے اور جوق در جوق اردو کے ادیب و شعراء حیدرآباد چلے آئے ۔ حیدرآباد میں شعر و ادب کی ایک کہکشاں بن گئی تھی ۔ عہد عثمانی کے سارے ادیب و شعراء کا اگر تذکرہ یہاں بیان کیا جائے تو کئی جلدیں درکار ہوں گی ۔ ذیل میں اس عہد کے چند اہم ادیب و شعراء کا ذکر کیا جاتا ہے :

عہدِ آصف جاہ سابع کے عہد میں عظمت اللہ خاں ایک اہم ادیب و شاعر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انہوں نے اپنی جدتِ طبع کی بنا خاص شہرت حاصل کی۔ عظمت اللہ خاں ایک اچھے نقاد و مبصر بھی تھے۔ ان کے چند تنقیدی مضامین رسالہ "اردو" کے علاوہ حیدرآباد کے دوسرے رسائل میں شائع ہوئے ہیں۔ انہوں نے مزاحیہ مضامین اور انشائیہ بھی قلمبند کئے۔ "سریلے بول" اُن کے کلام کا مجموعہ ہے۔

عظمت اللہ خاں نے غزل کے بجائے نظم نگاری کو وسیلہ اظہار بنایا ایک طرح سے وہ غزل مخالف تھے۔ انہوں نے اردو میں گیت کے فروغ کی مہم بھی چلائی اور اس بات پر زور دیا کہ نظموں اور گیتوں میں اردو عروض کے بجائے ہندی پنگل کا استعمال کیا جائے ـــ عظمت اللہ خاں کا یہ تجربہ اپنی انفرادیت کے لیے یاد کیا جاتا ہے۔

حکیم آزاد انصاری بھی اس عہد کے ایک معروف شاعر ہیں۔ وہ حالی کے متعلد ہیں۔ قدیم طرز کی شاعری کے دلدادہ ہیں۔ عموماً اصلاحی نظمیں لکھا کرتے تھے۔

قاضی غلام احمد شریف آثم حیدرآباد کے متوطن شاعر ہیں۔ ہر صنفِ سخن میں فیض یافتہ ہیں۔ ان کی نظم "فریبِ ہستی" کی ابتداء کے چند شعر ملاحظہ ہوں:

ارمان ہائے دل کے مقابل ہے جانِ زار — دنیائے کشمکش کی کوئی انتہا بھی ہے
دستِ جنوں ہے دامنِ حسرت ہے تار تار — منزل گہِ سکوں کہیں تیرا پتہ بھی ہے
جب دل ہی ہا دل میں نہ اپنے تمنا رہے کوئی — جانِ حزیں کو وقتِ مصیبت سنبھال لیں
تا چند رنج دوئی مقصد رہے کوئی — تدبیر پیر اڑیں کہ مقدر کو جان لیں

مرزا فرحت اللہ بیگ اردو کے مشہور انشا پرداز ہیں۔ مضمون نے اپنے انشائیوں سے اردو مضمون کو انگریزی توانائی عطا کی۔ "نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی کچھ میری زبانی" لکھ کر اردو میں خاکہ نگاری کو فروغ دیا۔ مضامین فرحت چھ جلدوں میں شائع ہوئے ہیں۔ حیدرآباد میں "اردو مجلس" کے نام سے بزم ادب قائم کی جس کے جلسوں میں اردو ادب کا جائزہ لیا جاتا تھا۔ فرحت نے ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ ان کے یہاں میر، غالب، حالی، شبلی کا رنگ یکجا ہو گیا ہے۔ غزل سے زیادہ نظمیں مشہور ہوئیں۔ نظم "جمنا کا کنارا" میں اپنے اصل وطن کو یاد کیا ہے۔ اس نظم کا پہلا بند ملاحظہ ہو:

اے اہل وطن پوچھ نہ مجھ سے حال زار دلی کا کبھی ہے یاد تجھے کوئی نظارا
ہے یاد وطن میں ہر جینے کا کہاں اس شہر کا گوشہ ہے لوں تو مجھے پیارا
آنکھوں میں سدا پھرتا ہے جمنا کا کنارا

فرحت ہی کی طرح علی اختر اختر نے بھی اپنی نظموں سے شہرت حاصل کی۔ شاعری میں اصلاح اپنے والد نابغ سے حاصل کی۔ غزلوں سے دلچسپی تھی "انوار" ان کی غزلوں کا مجموعہ ہے جو کہ شائع ہوا لیکن نظموں کا کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا۔ نظمیں مختلف نوع کی ملتی ہیں۔

غلام دستگیر مہر بھی اسی عہد کے شاعر ہیں۔ ہدایت علی ہدایت سے متاثر ہو کر شاعری کی ابتدا کی۔ ابتدا میں حبیب کنتوری کے آگے زانوئے ادب تہ کیا بعد ازاں ضامن کنتوری سے مشورہ سخن کیا۔

ضخیم دیوان مرتب و شائع کیا۔ ایک مثنوی "نقشِ قدم" بھی ان کی یادگار ہے۔ اکبر کے کلام میں سادگی کے ساتھ ساتھ رفعتِ تخیل بھی ملتا ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:

ایک وہ ہیں جو جفا کرتے ہیں — ایک ہم ہیں وفا پہ مرتے ہیں
زندگانی حباب آسا ہے — لوگ پھر بھی غرور کرتے ہیں

حسن کی لن ترانیاں عشق کی جاں ستانیاں
ہائے وہ بے نیازیاں لطفِ نیاز آگیا

کیا پوچھتے ہو جلوہ گہ ناز کا اسرار
کیا جانئے کیا دیکھا ہے کچھ یاد نہیں ہے

اکبر کی طرح حیدر بھی ضامن کنتوری کے تلامذہ سے ہیں۔ نام سید حیدر پاشاہ قادری، حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ بچپن میں جب شعر گوئی کا شوق پیدا ہوا تو اولاً ہاتف پھر توفیق حیدرآبادی سے کلام پر اصلاح لی۔ بعد ازاں ضامن کے آگے زانوئے ادب تہہ کیا۔ قدیم رنگ تغزل میں غزل خوب کہتے تھے۔ مشق سخن سے استاد سخن کی حیثیت حاصل کرلی۔ حیدر کے بیان شوکت لفظی، الفاظ کی بندش، محاورہ اور روزمرہ کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ توفیق کے رنگ غزل ملاحظہ ہو:

ہم نے کچھ سمجھا تھا لیکن ہو کا عالم ہے وہاں
کیا پشیمانی ہوئی ہے لامکاں کو دیکھ کر

اعتبارِ زندگی ہے اک فریبِ اعتبار

سب اثر میں آتے ہیں نام و نشاں کو دیکھ کر

اب کے ایسا انقلاب آیا ہے باغ دہر میں

خود خزاں بھی رو رہی ہے گلستاں کو دیکھ کر

دینے والے کا تو کر اندازہ اور خود کو نہ دیکھ

مانگ روزی شوکتِ روزی رساں کو دیکھ کر

زندگی بھر دل میں حیدر کثیر یزداں کی ہو یاد

موت آئے تو علی کے آستاں کو دیکھ کر

مرزا علی جعفر جعفر بھی اسی دور کے شاعر ہیں۔ تعلیم گھر پر ہوئی۔ شاعری کا فن ورثہ میں ملا تھا چنانچہ بچپن ہی سے شعر کہتے تھے۔ مشق سخن بہم پہنچانے کی غرض سے ناجی سے اصلاح لی اور ناجی کے ارشد تلامذہ میں شمار ہوتے ہیں۔ نوحہ، سلام، قصائد، مراثی اور رباعی میں طبع آزمائی کی ہے۔ قدیم طرز سخن کو خوب نبھایا ہے۔ مرثیہ نگاری اور نوحہ کہنے میں مہارت رکھتے تھے۔

نجم آفندی بھی مرثیہ و رباعی خوب کہتے تھے۔ مرزا تجمل حسین آفندی اور نجم تخلص تھا۔ آگرہ میں پیدا ہوئے لیکن حیدرآباد میں بود و باش اختیار کیا۔ بارہ برس کی عمر سے شعر کہنا شروع کیا۔ شاعری کا فن خاندان میں چار پشتوں سے چلا آرہا تھا۔ نجم کے والد بزم آفندی بھی اپنے زمانے کے اچھے شاعر تھے۔ نجم نے اپنے والد ہی سے شاعری پر اصلاح لی۔
نجم کے کلام میں الفاظ کی بندش، محاورہ کی برجستگی، انداز بیان کی قدرت، مضمون آفرینی، رمزیت اور سوز و گداز بدرجہ اتم پایا جاتا ہے۔ نجم نثر بھی خوب لکھتے تھے۔ شاعری میں جدید تقاضوں کو پورا کیا

نجم آفندی، بیخود کی طرح حیرت بدایونی نے اب بارہ برس کی عمر سے شعر کہنا شروع کیا۔

بدایون میں پیدا ہوئے تعلیم کی تکمیل کے بعد حیدرآباد آ گئے۔ اور حکومت آصفیہ کی ملازمت میں شامل ہو گئے۔ شاعری کا ذوق فطری تھا چنانچہ غالب کی طرح کسی کو اپنا اُستاد نہ بنایا۔ ذوقِ صحیح ہی اُن کا رہبر و رہنما بن گیا۔ حیرت نے تقریباً تمام اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے لیکن غزل اُن کی محبوب سخن ہے۔ کلام میں پختگی اور برجستگی پائی جاتی ہے۔ زبان و بیان پر پوری قدرت حاصل ہے نمونہ کلام دیکھئے ؎

انقلابات آتے ہی آتے رہیں، رنگ برنگ عالم بدلتا رہے
ہم سے کیا ہم پرانے گنہگار ہیں، ساقیا دور پر دور چلتا رہے۔
غنچہ بن کر رہو، سرو قامت رہو، کہہ رہی ہیں بہاریں سلامت رہو
اک قیامت ہو تم، تا قیامت رہو، حُسن جادو کے سانچوں میں ڈھلتا رہے۔

خیر و شر کے تصادم سے ہے زندگی
یا الٰہی سلامت رہیں خیر و شر۔

محمد حبیب اللہ المخلص بہ وفا اسی عہد کے شاعر ہیں۔ حبیب اللہ ذکا کے بیٹے ہیں۔ فارسی اور اُردو دونوں میں طبع آزمائی کرتے رہے۔ فارسی میں سید شمس، نوری اور ضیا سے کلام پر اصلاح کی اور اُردو میں حالی پیدل، جلیل اور نظم طباطبائی کو اپنا کلام دکھایا۔ جملہ اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے مختصر بحروں کے ساتھ طویل اور سنگلاخ زمینوں میں خوب غزلیں کہیں ہیں۔

راجہ نرسنگ راج عالی، رگھویندر راؤ جذب، لچھمی سنگھ خوشتر، جمشید جی لسٹی جی آفت، حکیم مست گرد ہر پرشاد رہبر، سید علی منظور وغیرہ بھی شامل ہیں اس عہد کے شاعر ہیں جنہوں نے اپنے کلام سے بزمِ سخن کو فروزاں کیا

نواب میر عثمان علی خاں آصف جاہ سابع کے عہد میں آصف جاہ سادس کے عہد میں ۔
کس طرح نثر کو اپنی خوب ترقی ملی ۔ مزاحیہ شاعری نے اپنی اس عہد میں شہرت حاصل کی
اعجاز حسین کھٹا ، نذیر رشمانی ، سرور ڈنڈا نے اپنے کلام سے محفلوں کو زعفران زار بنا دیا ۔

آصف جاہ سادس کے عہد سے شمالی ہند سے اہلِ علم حیدرآباد کا رخ اختیار
کرنے لگے ، چنانچہ مرزا فرحت اللہ بیگ ، مولوی مسعود علی محوی ، ڈاکٹر غلام یزدانی ، آغا حیدر حسین
مولانا وزیر حسن ، محشر عابدی ، وغیرہ وغیرہ عہد آصف جاہ سابع کے ایسے نثر نگار ہیں جنہوں نے حیدرآباد
کو اپنا وطن مانا ، اور اپنی نثر کی تخلیقات سے اردو ادب کو مالا مال کیا ۔ اسی زمانہ میں حیدرآباد
کے چانچ ، اور جامعہ عثمانیہ کو نونہال اپنی نثر کا داد حاصل کر رہے تھے ۔

سید علی اصغر بلگرامی ، آپ کے اجداد کا تعلق سرزمین بلگرام سے ہے لیکن آپ کی
پیدائش حیدرآباد میں ہوئی ۔ ہندوستان کے تمام اہم رسالوں میں آپ کے مضامین شائع ہوئے ۔ دکن کی تاریخ
" مآثرِ دکن " کے نام سے شائع کی ، " فلسفہ ازدواج " اُن کی دوسری مشہور تصنیف ہے ۔

محمد مظہر ، دارالعلوم کے تعلیم یافتہ ہیں ۔ جامعہ عثمانیہ کی تحریک میں اہم حصہ ادا کیا ۔
" علم آصفی کی دولت کا تذکرہ باب حکومت " اُن کی اہم تصانیف ہیں ۔

مولوی سراج الدین اب اسی عہد کے نثر نگار ہیں ۔ تاریخ سے دلچسپی تھی چنانچہ ان کی کتابیں اس موضوع پر تالیف کیں ۔
" ذکاء علی خاں (حصہ اول و دوم) " " میر عالم " اور " سیر فلک " اُن کی مشہور تصانیف ہیں جن میں حیدرآباد
اور دکن کی تاریخ کو مستند حوالوں سے بیان کیا گیا ہے ۔

ہارون خاں شیروانی ، حیدرآباد دکن کے مشہور مورخ ہیں ۔ محتاج تعارف نہیں ۔ حکومت ہند نے ان کی تعلیم
خدمت کے صلہ میں انہیں پدم بھوشن کا خطاب دیا ۔ " انگریزی میں تصانیف لکھی ہیں ۔ لیکن اُن کی ہر کتاب
اردو میں ترجمہ ہوئی ہے ۔ تاریخ میں سیاسیات ، دکن کالچر ، بہمنی عہد کی تاریخ " تاریخ دستور ہند "
اُن کی چند اہم تصانیف ہیں ۔ ۔

ڈاکٹر حمید اللہ بھی ہارون خان شیروانی کی طرح محتاج تعارف نہیں۔ جامعہ عثمانیہ کے سپوت ہیں جامعہ عثمانیہ سے ایم۔اے کرنے کے بعد خبر بیٹی و فرانس سے ڈی فل اور ڈی لٹ کی ڈگریاں حاصل کیں۔ اردو۔ ہندی۔ فارسی عربی اور انگریزی پر عبور حاصل تھا بعلاوہ ازیں فرنچ، جرمنی، اطالینی پر بھی عبور حاصل کیا۔ اسلامی تاریخ کے ماہر مانے جاتے ہیں حسب ذیل تصانیف کے مصنف ہیں۔

① آبادی کے متعلق قرآن کا مواد ② رومی اور اسلامی ادارہ غلامی۔
③ رسول کریمؐ کی سیرت کا کیوں مطالعہ کیا جائے۔ ④ قانون بین الممالک کے اصول اور نظریہ
⑤ اسلامی قانون بین الممالک ⑥ عہد نبوی کے میدان جنگ ⑦ عہد نبوی میں نظام حکمرانی۔

ڈاکٹر حمید اللہ موجودہ عہد کے عظیم اسکالر سمجھے جاتے ہیں آپ نے دو ماہ قبل ہی فرانس میں داعی اجل کو لبیک کہا۔

ڈاکٹر رضی الدین، حیدرآباد کے بانی اور جامع عثمانیہ کے سپوت ہیں۔ ماہر فن ریاضی تھے لیکن فارسی اور اردو ادبیات سے خاص شغف رکھتے تھے۔ خصوصاً اقبال اور اقبال ان کے پسندیدہ شعراء تھے کئی کتابوں کے مصنف ہیں اور عالمی شہرت یافتہ ریاضی داں ہونے کے باوجود اردو ادب پر مضامین گاہے ماہے لکھا کرتے تھے۔

ڈاکٹر ولی الدین بھی جامعہ عثمانیہ کے سپوت ہیں۔ فلسفہ سے ابتداء ہی سے دلچسپی تھی۔ چنانچہ اسی مضمون میں لندن سے ڈاکٹریٹ کی اور جامعہ عثمانیہ کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ مغربی فلسفہ کو اسلامی فلسفہ کی روشنی میں متعارف کروانے کا اہم کام انجام دیا۔ خصوصیت "ابطال مادیت" "قرآن کا فلسفہ مذہب" "اقبال اور حدیث جبر و قدر" آپ کی تصانیف ہیں۔

ڈاکٹر یوسف حسین خاں بھی ڈاکٹر ولی الدین کی طرح یورپ سے ڈاکٹری کی ڈگری حاصل کی۔ واپسی پر جامعہ عثمانیہ میں بطور ریڈر تقرر عمل میں آیا۔ اردو ادب سے خاص دلچسپی رکھتے ہیں۔ غالب اور اقبال ان کے پسندیدہ شاعر ہیں۔ غالب پر "غالب اور آہنگ غالب" اور اقبال کی شاعری پر "روح اقبال" لکھی۔ "اردو غزل" لکھ کر اردو غزل کے ارتقاء کو بیان کیا۔ حسرت موہانی پر بھی ایک مختصر کتابچہ لکھا۔

عبدالمجید صدیقی دارالعلوم کے سپوت ہیں۔ تاریخ سے دلچسپی تھی۔ جامعہ عثمانیہ سے وابستہ تھے۔ دکن کی تاریخ پر مہارت رکھتے تھے۔ "تاریخ گولکنڈہ" "مقدمہ تاریخ دکن" "بہمنی سلطنت" "ارسطو جاہ اور تاریخ سیاسیات" ان کی تصانیف ہیں۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کے کہنے پر ملا نصرتی کی مثنوی "علی نامہ" مرتب اور شائع کی۔ "سب رس" حیدرآباد اور "اردو" میں ان کے کئی مقالات شائع ہوئے ہیں۔

تمکین کاظمی جامعہ عثمانیہ کے سپوت ہیں۔ نثر بہت اچھی لکھتے ہیں کئی مقالات شائع ہوئے جو "ہمایوں" "ساقی" "مخزن" "اردو دنیا" "سب رس" "اردو" رسالوں کی زینت بنے اور قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ "مومن خاں مومن" اور "تذکرۂ ریختی" تصانیف ہیں۔ مزاح نگاری سے خاص لگاؤ تھا چنانچہ اپنے اس طرز کے مضامین کا مجموعہ "غنچۂ تبسم" کے نام سے شائع کیا ہے۔ امراؤ جان ادا حقیقت یا افسانہ پر ایک مختصر کتابچہ بھی لکھا ہے۔

ڈاکٹر محمد غوث محمد مرتضیٰ کے ساتھی ہیں۔ جامعہ عثمانیہ کے قیام کی تحریک میں اہم حصہ ادا کیا۔ دارالعلوم کے سپوت ہیں۔ حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کے معماروں میں شامل تھے۔ دفتر دیوان و مال کے عربی، فارسی اور اردو مخطوطات کی ضخیم وضاحتی فہرست تیار کی تھی۔

ابوالفیض عبدالواحد حیدرآباد کے ایک ایسے سپوت ہیں جنہوں نے کبھی شہرت کی تمنا نہ کی۔ نثر میں لاتعداد مقالے سپرد قلم کیے ہیں۔ ڈاکٹر زور کی مرتبہ "مرقع سخن" کی چار جلدوں میں واحد صاحب کے تقریباً آٹھ مضامین شامل ہیں۔ دکنی کے قدیم شاعر غواصی کا دیوان مرتب کیا ہے۔ دکنی ادب پر کئی مضامین سپرد قلم کیے۔

شیخ چاند جامعہ عثمانیہ کے ایسے سپوت ہیں جنہوں نے اپنی تحقیق کی اپج کے ذریعہ اردو تحقیق کی بنیادوں کو مضبوط کیا۔ "سودا" پر ان کا پی۔ ایچ۔ ڈی کے لیے لکھا گیا تحقیقی مقالہ آج بھی مثال کے طور پر یاد کیا جاتا ہے۔ "ملک عنبر" شیخ چاند کی دوسری کتاب ہے۔ رسالہ "اردو" میں ان کے کئی مقالے شائع ہوئے ہیں۔

عہد آصفیہ کے آخری اہم نثر نگار کے طور پر ہم ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور اور سید محمد کا ذکر کرتے ہیں۔ ڈاکٹر سید محمد نے "ارباب نثر اردو" لکھ کر اردو ادب میں اپنا نام جاوداں بنالیا ہے اور ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کی لسانی تحقیقات نے اردو لسانیات میں

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کی لسانی تحقیقات نے اردو لسانیات میں انقلاب پیدا کر دیا۔ ان کا زندہ جاوید کارنامہ ادارۂ ادبیات اردو اور اس ادارہ کا عظیم الشان کتب خانہ ہے۔ ادارہ ادبیات اردو کے مخطوطات کی فہرست کلیات محمد قلی قطب شاہ، حیات میر مومن وغیرہ آپ کے شاہکار ہیں۔

عہد آصفیہ کے آخری دہے میں عثمانیہ کے تعلیم یافتہ نوجوانوں نے شاعری کی دنیا میں بڑا نام پیدا کیا۔ ان میں مخدوم محی الدین، صاحبزادہ میکش جلال الدین اشک، سکندر علی وجد، اور میر حسن نے بڑا نام پیدا کیا اور جامعہ عثمانیہ کے نام اور کام بھی اسم با مسمیٰ ہوگیا ہے۔

حیدرآباد میں مخدوم نے اپنے کلام کے باوصف جو شہرت لوازم الشہر کی محبت پائی شاید ہی کسی اور شاعر کو نصیب ہوئی ہوگی۔ مخدوم کی نظم "بیلا دوشالہ" اور "چارہ گر" (دو بدن پیار کی آگ میں جل گئے) مخدوم کی وفات کے تقریباً چالیس برس بعد بھی اہل حیدرآباد کے دلوں کو گرماتا ہے لبھاتا ہے۔

پچھلے صفحات پر عہد عثمانی کے شعراء و ادباء کی خدمات کا تذکرہ و تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ ذیل میں نواب میر عثمان علی خاں اور ان کے فرزندوں کے اردو خدمات کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

شہزادہ اعظم جاہ بہادر اصلی نام میر حمایت علی خاں تھا۔ ۸ محرم ۱۳۲۵ھ کو دلہن پاشا کے بطن سے عدن باغ میں پیدا ہوئے۔ ۱۳۳۷ھ میں اعظم جاہ کے خطاب سے سرفراز ہوئے۔ یکم رجب ۱۳۵۰ھ م ۱۲؍ نومبر ۱۹۳۱ء کو سابق سلطان ترکی عبدالمجید خاں کی صاحبزادی در شہوار سے فانس (فرانس) میں عقد نکاح پایا۔ ۲۵؍ شعبان ۱۳۵۰ھ کو "والاشان" کا خطاب عطا ہوا۔ نواب عثمان یار الدولہ سپہ سالار و ناظر آصفی کے انتقال پر یکم ربیع الثانی ۱۳۵۳ھ میں شہزادہ ممدوح کو کمانڈر و ناظر آصفی مقرر کیا گیا۔ اسی موقع پر آصف سابع کے ولیعہد قرار دیے گئے۔

شہزادہ اعظم جاہ کے تخلص اختیار کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ بات ممکن ہے کہ انہوں نے خوب شعر کہے ہوں گے لیکن تا حال اُن کی صرف ایک ہی غزل دستیاب ہے۔ جس کا ذکر تسکین عابدی نے "شہزادگان دکن" میں کیا ہے۔ اس غزل کا مطلع ذیل میں درج کیا جاتا ہے ؎

مار ہی ڈالا مجھے ناز و ادا سے پہلے
جان دینا ہی پڑا مجھ کو قضا سے پہلے

شہزادہ معظم جاہ بہادر۔ آصف جاہ سابع کے دوسرے فرزند صاحبزادہ میر شجاعت علی خاں نام اور شجیع تخلص۔ ۱۵؍ ذیقعدہ ۱۳۲۵ھ کو پیدا ہوئے۔ ۱۳۳۶ھ میں معظم جاہ بہادر کا خطاب عنایت ہوا۔ ۱۲؍ نومبر ۱۹۳۱ء کو سابق سلطان ترکی کی حقیقی بھانجی شہزادی نیلوفر سے عقد نکاح پایا۔

شجیع کو مشقِ سخن سے فطری شغف ہے چنانچہ سنہ ۱۲۵۳ھ کے اس فرمان سے پتہ چلتا ہے کہ اس وقت تک انہوں نے تقریباً سات سو غزلیں کہی تھیں جلیل سے تلمذ حاصل تھا۔ کلام کا نمونہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

اپنے وعدہ پہ کب آتے ہیں   شکوہ کیجئے تو مسکراتے ہیں

نہ محبت نہ رحم کچھ ان میں   پھر وہ کیوں اتنا یاد آتے ہیں

جان لینے کی دل لبھانے کی   کون ادا تیرے بانکپن میں نہیں

انتہا تھی اک جی کہانی کی   پیرہن آنکھوں نے کھل متانی کی

شہزادہ کاظم جاہ بہادر ــــــ میر کاظم علی خاں نام تخلص کاظم آصف جاہ سابع کے فرزند ہیں۔ ولادت ۲ شعبان سنہ ۱۳۱۲ھ کو ہوئی فارسی اور اردو میں طبع آزمائی کرتے ہیں۔ اکثر کلام رسائل اور اخبارات میں شائع ہوا ہے۔ نمونہ کلام دیکھیے:

در ساقی پہ مثل میکشان   شیخ بھی بن کے مے فروش رہا

زلفِ جاناں کو چھو کے اے کاظم   کب نسیمِ سحر کو ہوش رہا

نواب میر عثمان علی خاں آصف سابع کے مزید پانچ فرزند بھی شعر و شاعری سے دلچسپی رکھتے ہیں اور خوب شعر کہتے ہیں یہ ہیں ــــ نواب حشمت جاہ بہادر حشمت، شہزادہ ہاشم جاہ بہادر ہاشم، شہزادہ تقی جاہ بہادر تقی، شہزادہ لیاقت جاہ بہادر اور شہزادہ سعادت جاہ بہادر سعادت

کیوں نہ ہو جب والدین خود شاعر ہوں۔ محل میں متعدد شاعری کا چرچا ہوتا ہو شہر میں شعر و شاعری کا بول بالا ہو۔ نواب آصف جاہ سابع کی محل مبارک بھی شاعرہ تھیں۔ اعجاز تخلص اختیار کیا تھا۔ علیا حضرت دلہن پاشاہ نواب جہانگیر یار جنگ کی دختر نیک اختر تھیں ۱۶ رصفر ۱۳۲۷ھ کو ایڈن باغ میں آصف جاہ سابع سے رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوئیں۔ نمونہ کلام دیکھیے:

اُن کو طلب دوا کی لاج نہیں — درد دل کا کوئی علاج نہیں
بوئے گیسو صبا جو لائی ہے — دل کو تسکین ہے اختلاج نہیں
جو ہمیں ناصبور کہتے ہیں — ہم انہیں بے شعور کہتے ہیں
دل میں جو داغ عشق ہے اعجاز — ہم اسے شمع طور کہتے ہیں

نواب میر عثمان علی خاں عثمان: شاعری ورثہ میں ملی تھی۔ اردو ونیز فارسی عربی کے علاوہ انگریزی، مرہٹی، تلنگی پر عبور رکھتے تھے۔ فنون لطیفہ میں مصوری اور موسیقی سے شغف تھا۔ طبلہ اچھا بجاتے تھے۔ ابتدائے مشق سخن میں داغ کو اصلاح کلام کا اعزاز بخشا پھر جلیل کو یہ شرف حاصل ہوا۔ فارسی، اردو اور برج میں طبع آزمائی کی ہے۔ دیوان شائع ہو چکا ہے قدیم طرز میں شعر کہتے ہیں نمونہ کلام ذیل میں درج کیا جاتا ہے

پنہاں نظر سے ہو اروئے یار مشکل ہے — اب اپنے دل پہ ہمیں اختیار مشکل ہے
کیا محفل ہستی کا نقشہ متغیر ہے — ساقی ہے نہ مطرب ہے شیشہ ہے نہ ساغر ہے

انداز تیرے قاتل سب جان کے دشمن ہیں
مضمون ہے کہ ناوک ہے غمزہ ہے کہ خنجر ہے

اب چشم عنایت سے پیاس اُس کی بجھا دیجئے
لب تا بہ لب عثمان یا ساقی کوثر ہے

نغمۂ بلبل جو سنتا ہے تو اے اہل چمن
مثل گل ہر دم سراپا گوش رہنا چاہیے

خدا ہی کشتیٔ دل کا ہے حافظ بحر الفت میں
نہ لنگر جس کا باقی ہے نہ جس کا بادباں باقی

سرزمین طیبہ کا رتبہ میں عثمان کیا کہوں
سنگریزے جس کی گلیوں کے ستارے ہو گئے

پوچھتا ہے ملک الموت سے اک دن مجھ کو
آپ کا کوچۂ قاتل میں گزر ہے کہ نہیں

نواب میر عثمان علی خاں آصف جاہ سابع کو موسیقی سے خاص دلچسپی تھی۔ ستار اور طبلہ بھی بجانا جانتے تھے۔ ہندوستانی موسیقی کی صنف نغمہ ٹھمری کو مشق سخن بنایا ہے۔ بعض اچھی ٹھمریاں کہی ہیں موسیقی کی اضافہ نغمہ کے لیے برج ہندی لہجہ اختیار کیا جاتا ہے۔ عثمان نے بھی اسی مناسبت سے اپنی ٹھمریوں میں زبان استعمال کی ہے۔ ذیل میں دو ٹھمریاں درج کی جاتی ہیں۔

ٹھمری (۱) گلناری میں کو مارت ہے پچکاری

گھاٹ میں کیسا رنگ بکھرا ہے

وہ کہیں گورا زن گاری

سائیں میاں تورے نین رسیلے

مار لگا ایسی کاری

ٹھمری (۲) بارے جوبنا پہ ہاتھ کس نے ڈالا سکھی

لاج گئیو موری جگ میں سائیں

کیسی ٹھٹھولی نکالا سکھی

—

عہد عثمانی میں اُردو خدمات " اردو کی ترقی " اُردو کے فروغ کا بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر یوسف حسین خان اپنی تصنیف " تاریخ دکن " میں لکھتے ہیں ۔ اقتباس دیکھئے ۔

"علم وفن اور شعر وسخن کی سرپرستی کی قدیم آصف جاہی روایات موجودہ اعلیٰ حضرت
میر عثمان علی خان خلد اللہ ملکہ وسلطنتہ کے عہد ہمایوں میں چار روبہ ہیں۔
اعلیٰ حضرت بندگان اقدس فارسی اور اُردو کے اعلیٰ پائے کے شاعر ہیں اور عثمان
تخلص فرماتے ہیں۔ آپ کے کلام کو ملک میں خاص مقبولیت حاصل ہے۔ آپ
نواب فصاحت جنگ بہادر جلیل سے مشورہ سخن لیتے ہیں جو امیر مینائی مرحوم
کے شاگرد اور جانشین ہیں اور غزل کے مسلّمہ و صاحب طرز استاد مانے جاتے ہیں۔
عہد عثمانی میں شعر وسخن کو سرزمین دکن میں خوب ترقی کا موقع ملا۔۔۔
اعلیٰ حضرت کے ذوقِ سخن گستری کا اہل ملک کے ادبی مذاق پر نہایت
اچھا اثر پڑا ہے اور حیدرآباد نے اُردو کی ادبی دنیا میں ایک خاص مقام حاصل
کر لیا ہے ———

۲۴ فبروری ۱۹۶۷ء کے دن اُردو زبان شعر وادب کا یہ شیدائی جسے
نے محبت سے اپنی چاہت کے طور پر "سلطان العلوم" کے لقب سے یاد کیا تھا داعی
اجل کو لبیک کیا اور اسی کے ساتھ ایک عہد ایک تہذیب ایک تمدن ہی کا نہیں
تعلیم کو عام کرنے والے ایک عزمِ صمیم کا خاتمہ ہو گیا ہے ؎

فلک کے جور سے سب لطف مٹ گیا عثمان
نہ مئے ہے اپنی نہ وہ صحبت نہ یار باقی ہے۔

(عثمان)

٦

باب ششم

عہد آصفیہ میں اردو شعر و ادب کا ارتقاء
بہ یک نظر (اختتامیہ)

"آصفیہ عہد میں شعر و ادب کا ارتقاء" دکن میں عہد قطب شاہی و عادل شاہی کے اردو ادب کا تسلسل و ارتقاء ہے۔ قطب شاہی اور عادل شاہی حکومتوں کے خاتمہ کے بعد اورنگ آباد میں اردو ادب کی ایک جدید شمع روشن ہوئی جہاں لسانی اعتبار سے اردو کو ایک نیا ادب، نیا آہنگ ملا۔ اورنگ آباد کی زبان کا کینڈا گولکنڈہ اور بیجاپور کے ادبی زبان سے نہ صرف مختلف تھا بلکہ زیادہ فصیح اور شگفتہ بھی۔

عہد آصفیہ میں اردو شعر و ادب کا ارتقاء

اردو ادب کی تاریخ کا وہ روشن ترین باب ہے جو جدید اردو ادب کو اس کے قدیم ادبی روایت یعنی دکنی

کے قدیم دور سے منسلک و مربوط کرتا ہے اور اس طرح اردو شعروادب کے ارتقاء کی روایت رواں دواں مسلسل و مستحکم صورت میں ہم تک پہنچی ہے ۔

نواب میر قمرالدین خاں نظام الملک آصف جاہ نے ۱۷۲۴ء م ۱۱۳۶ھ میں آصفیہ سلطنت کی بنیاد رکھی ۔ اورنگ آباد کو اپنا دارالسلطنت قرار دیا ۔ آصف جاہ اول خود بھی فارسی کے اچھے شاعر تھے ۔ بیدل سے اصلاح لی تھی ۔ اردو میں بھی شعر کہتے تھے ۔ چنانچہ قدیم تذکروں میں آصف جاہ اول کے چند شعر دستیاب ہوئے ہیں ۔ جس زمانے میں آصفیہ سلطنت کی بنیاد رکھی گئی اورنگ آباد میں ولی اورنگ آبادی کی شعری روایت ابھی زندہ و تابندہ تھی ۔ آصف جاہ اول کے انتقال کے بعد

اُن کے دوسرے فرزند میر احمد علی خاں ناصر جنگ متخلص بہ ناصرؔ نے حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لی ۔ ناصرؔ فارسی اور اُردو کے اچھے شاعر تھے ۔ صائب کا تتبع کرتے تھے ۔ شعراء و ادیبوں کے سرپرست تھے ۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ نے انھیں ادب نوازی کے لیے سلطنت قطب شاہیہ کے حقیقی جانشین قرار دیا ۔ ناصرؔ اُردو کے اچھے شاعر تھے گوکہ اُن کا دیوان آج تک دستیاب نہیں ہوا ہے لیکن جتنا کچھ کلام دستیاب ہوا ہے، اُس سے ناصرؔ کی شعری صلاحیتوں کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے ۔ راقم الحروف نے آصف جاہ اول آصفؔ اور ناصرؔ جنگ کی شعری صلاحیتوں کا بخوبی اندازہ قائم کرنے کے لیے ان کے کلام کے نمونے مقالے میں درج کیے ہیں اور ان کے محاسن و معائب پر اظہار خیال کرنے کی کوشش کی ہے ۔

ناصر جنگ نے ابھی حکومت کو استحکام بھی عطا نہ کیا تھا کہ انھیں شہید کر دیا گیا اور پھر مظفر جنگ نے حکومت کی باگ ڈور سنبھالی لیکن وہ بھی قتل کر دیے گئے اور آصف جاہ اول کے تیسرے فرزند صلابت جنگ نے عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لی۔ مظفر جنگ اور صلابت جنگ کے زمانے میں دکن میں تھوڑے تھوڑے عرصے سے جنگ کے بادل چھاتے رہے ایسے میں شعراء و ادباء مملکت کی سرپرستی سے محروم رہے۔ صوفی و عوامی شاعر بھی ماحول کی پراگندگی کی وجہ سے شعر و شاعری کی جانب توجہ نہ دے سکے کہ چین کا سانس لینا جب حرام ہو جائے تو تخیل کہاں وا جدان کی ہم آہنگی نصیب ہوتی ہے۔ دس برس کا یہ عرصہ آصفیہ عہد میں ایک طرح سے خانہ جنگی میں گذرا جس کی وجہ سے

اورنگ آباد کی بساط شعروادب پر ایک طرح کی
خاموشی طاری رہی۔

۱۷۶۱ء میں آصف جاہ اول کے چوتھے
صاحبزادے میر نظام علی خاں نے شاہ عالم آفتاب
سے سند صوبہ داری حاصل کرنے کے بعد اپنے بڑے بھائی
صلابت خاں کو گرفتار کرلیا اور انھیں بیدر کے قلعہ
میں قید کردیا اور خود آصف جاہ ثانی کے لقب سے
اقتدار سنبھال لیا۔ انھوں نے کچھ عرصہ بعد دارالسلطنت
اورنگ آباد سے حیدرآباد منتقل کیا۔ انتقالِ دارالسلطنت
کا مرحلہ دراصل اردو شعروادب کے احیاء کا روشن
باب ثابت ہوا اور سلطنتِ قطب شاہیہ کے زوال
کے بعد آخری قطب شاہی تاجدار ابوالحسن کی دولت آباد

کو ولی دکنی کے ساتھ جو شعری روایت دولت آباد

(اورنگ آباد) منتقل ہوئی تھی ۔ اردو شعروادب کی

وہی روایت نوے ۹۰ برس بعد پھر ایک بار حیدرآباد

کی سرزمین پر سرسبز و شاداب ہونے لوٹ کے

اپنے گھر آ گئی تھی ۔

نظام الملک آصف جاہ ثانی کے عہد میں

مملکت کو استحکام حاصل ہوا ۔ امن و امان کا دور دورہ

ہوا ۔ حیدرآباد پھر سے شعروادب کا گہوارہ بن گیا ۔

اس زمانے میں سینکڑوں شعراء نے اورنگ آباد سے

حیدرآباد کا رخ کیا ۔ خود حیدرآباد میں بھی نامور شعراء

موجود تھے ـــــ ان میں بیشتر شعراء ولی کے شاگرد تھے ۔

سراج اورنگ آبادی ، داؤد اورنگ آبادی ، عبدالولی عزلت

درگاہ قلی خاں درگاہ، درد مند، آزاد، رشید اعظم، شاہ میر، شاہ خاکی، عاجز اورنگ آبادی، قاسم، عاشق، ایجاد، شفیق، تمنا، تجلی، ایمان، کاظم ہیم چند اور ذرہ، شعر وادب کی شمع فروزاں کئے ہوئے تھے۔

اس عہد میں جہاں اُردو مثنوی کو ایک بار پھر حیدرآباد میں فروغ حاصل ہوا، اسی کے ساتھ تذکرہ نگاری کو بھی فروغ ملا۔ عزلت، تجلی، تمنا، شفیق، آزاد درگاہ نے تذکرے لکھ کر اپنے عہد کے شعر وادب ہی کو محفوظ نہیں کیا بلکہ اپنے عہد کے تہذیبی نقوش بھی محفوظ کر دیے ــــ اسی عہد میں حمید اورنگ آبادی، قاسم، اشتغال اور قوت نے بھی تذکرے لکھے۔

مثنوی کے باب میں سراج اورنگ آبادی کی "بستان خیال" اپنی سلاست، روانی، شگفتگی اور بیان کی چستی و برجستگی کے ساتھ مضامین فطرت اور جزئیات کے لیے بے مثال قرار دی گئی ہے۔ اسی عہد میں عاجز، تمنا اور شیدا، درد مند نے بھی مثنویاں لکھی۔ اس عہد کی ایک منفرد مثنوی عبدالولی عزلت کی تحریر کردہ "راگ مالا" ہے جو موسیقی کے موضوع پر لکھی گئی اردو میں پہلی راگ مالا ہے۔ آصفیہ سلطنت کے ابتدائی عہد میں اردو شعر و ادب کا روشن باب قرار دیا جا سکتا ہے۔

۱۸۰۳ء میں میر نظام علی خاں آصف جاہ ثانی کا انتقال ہو گیا۔ اس سنہ سے قبل ہی دلی کے شعراء نے حیدرآباد کا رخ اختیار کیا تھا۔ مرزا علی لطف، بیان

اور شاہ نصیر نے حیدرآباد کو اپنا وطن ثانی بنالیا تھا۔

۱۸۰۳ء میں مغلیہ سلطنت ایک طرح
سے انگریزوں کے زیرِ نگیں آگئی۔ سلطنت مغلیہ کی
بساط الٹنے کو تھی۔ شعروادب جائے سکون پانے
کی غرض سے چھوٹی چھوٹی ریاستوں کا رخ کر رہے تھے۔
مرزا علی لطف، شاہ نصیر، شہید، شاہ کمال حیدرآباد
آئے۔ ۱۸۰۳ء سے ۱۸۶۷ء تک کا زمانہ حیدرآباد
میں بیرون شعراء کی آمد اور حیدرآباد کی شعری
فضاء اپنے نغموں سے مزین کرنے کے لیے یادگار سمجھا
جائے گا۔ اس عہد میں چندولال شاداں وزیر اعظم
مملکت آصفیہ تھے۔ وہ خود بھی شاعر تھے اور شعراء
کی سرپرستی کے لیے مشہور تھے۔

اس زمانے میں حیدرآباد میں شاداں، تپش، آفاق، فیض، جوہر، ہمرنگ، احسن جیسے شعراء موجود تھے۔ اسی زمانے میں اردو شعر و ادب کے افق پر خواتین بھی نمودار ہوئیں اور لطف النساء امتیاز نے ۱۲۱۲ھ میں اپنا دیوان مرتب کیا اور پہلی خاتون شاعرہ قرار پائی۔ مہ لقا بائی چندا بھی اسی دور سے تعلق رکھتی ہے۔ جس نے غزلیات کی طرح اردو میں موسیقی کے اوزان پر مشتمل گیت موزوں کیے۔

اس عہد میں نثری تصانیف بھی لکھی گئیں چنانچہ تذکروں کے ساتھ ساتھ داستانیں بھی تخلیق کی گئیں۔ تاریخی کتب بھی مرتب کی گئیں۔ حیدرآباد کی ادبی فضاء

اس عہد میں سیاست سے زہر آلود ہونے لگی تھی اور ملکی اور غیر ملکی کے تذکرے فضاؤں میں گونج رہے تھے لیکن اُردو کا شعر و ادب اپنی منزل کی جانب رواں دواں تھا۔ اسی زمانے میں حیدرآباد میں صحافت کا بھی آغاز ہوا اور اُردو کا پہلا سائنسی رسالہ حیدرآباد میں جاری ہوا۔

۱۸۶۸ء میں نواب میر محبوب علی خاں سریر آرائے سلطنت ہوئے۔ آصف جاہ سادس کا عہد اس لیے اُردو میں اہم تصور کیا جاتا ہے کہ اس عہد میں داغ اور امیر حیدرآباد آئے اور اسی زمانے میں اُردو کو فارسی کے بجائے سلطنتِ آصفیہ کی سرکاری زبان قرار دیا گیا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب

ہندوستان میں انگریزوں کی حکومت قائم ہو چکی تھی ۔
مغل شہنشاہیت کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ ہندوستان
کی جنگ آزادی کی جدوجہد شروع ہو چکی تھی۔ ان
سیاسی تبدیلیوں کے باوجود حیدرآباد شعروادب
کا گہوارہ بنا ہوا تھا۔ اردو زبان کی اپنی جامعہ کی
باتیں فضاء کو معطر کئے ہوئے تھیں اور اردو ادب کے
تقریباً تمام مشاہیر حیدرآباد سے وابستہ تھے ۔
تصنیف و تالیف کو چار چاند لگ رہے تھے۔ ادب
کی ہر صنف کو فروغ حاصل ہو رہا تھا ۔

اسی زمانے میں صحافت نے ارتقاء پایا ۔
قصہ کہانی کے ضمن میں ناول اور افسانے لکھے جارہے تھے ۔
عبدالحلیم شرر نے اپنا مشہور رسالہ "دلگداز"

حیدرآباد سے جاری کیا۔ رتن ناتھ سرشار "دبدبۂ آصفی"
کے ذریعہ اپنا دبدبہ حیدرآباد میں قائم کرنے کی کوشش
کر رہے تھے۔ ظفر علی خاں نے اپنی پہلی تصنیف حیدرآباد
میں مکمل کی اور شائع کی۔ اسی عہد میں کلام غالب کی
پہلی شرح عبدالولی اعلیٰ نے لکھی اور کلام غالب کی
مشہور شرح بھی حیدرآباد ہی میں نظم طباطبائی نے
لکھی اور واجد تلگنڈوی نے اردو کا پہلا افسانہ حیدرآباد
میں تخلیق کیا جو ماہنامہ "صحیفہ" میں شائع ہوا۔
داغ و امیر کا یہ دور عہد آصفیہ میں اردو ادب
میں کا تعین تاریخ اردو ادب کا ایک روشن باب ہے۔

1911ء میں نواب میر محبوب علی خاں کا انتقال
ہوا اور نواب میر عثمان علی خاں سریر آرائے
سلطنت ہوئے۔ آصف جاہ سادس کا عہد آصفیہ

عہد میں اردو کی ترقی، ترویج و ارتقاء کے عروج
کا زمانہ ہے۔ انھیں کے عہد حکومت میں اردو کی
پہلی جامعہ "عثمانیہ" کا قیام عمل میں آیا،
دارالترجمہ کا قیام ہوا۔ جدید نظم کو حیدرآباد میں
فروغ حاصل ہوا اور اردو زندگی کی ہر سانس کی
حرارت بن گئی۔

۱۷۲۴ء میں قیام مملکت آصفیہ سے ۱۹۴۸ء
میں سقوط سلطنت آصفیہ تک، سلطنت آصفیہ میں
تخلیق پانے والے اردو شعر و ادب کے ارتقاء کا جائزہ
اس امر کو واضح کرتا ہے کہ عہد آصفیہ میں اردو
کو نئی زندگی ہی نہیں ملی بلکہ قدیم اردو ادب کو ایک مستحکم
روایت نصیب ہوئی اور اردو شعر و ادب کا قافلہ
اپنی آن بان شان کے ساتھ آج ———

جی ہاں عہدِ آصفیہ میں اردو کی ترقی و ترویج کے لیے جو اقدامات کیے گئے یہ اسی کا ثمرہ ہے کہ اردو نے ہندوستان سے نکل کر برصغیر میں اپنا ایک مقام بنایا ہے اور عہدِ آصفیہ ہی کی اردو سرپرستی کا یہ فیضان ہے کہ ٹیلی ویژن پر ساری دنیا کی فضاؤں میں کو مسخر کرنے والا پہلا خالص اردو چینل (Channel) حیدرآباد ہی کی سرزمین سے شروع ہوا ہے۔ الغرض عہدِ آصفیہ میں اردو شعر و ادب کے فروغ و ارتقاء کے جائزہ کے بنا اردو ادب کی تاریخ مرتب نہیں ہوسکتی ——

۔ ختم شد ۔

کتابیات

"کتابیات"

مخطوطات / مسودات

۱۔ اٹھارہویں صدی کی دکنی شاعری کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ	نسیم الدین فریس
۲۔ اردو ادب میں ہندوستانی موسیقی - ایک جائزہ	حبیب نثار
۳۔ اردو اور تلگو افسانوی ادب کا تقابلی مطالعہ	اودھیش رانی
۴۔ اورنگ آباد میں اردو ادب کا ارتقاء	خالدہ یوسف
۵۔ دکھنی سنگھاسن بتیسی مخطوطہ نمبر 11 نثری افسانہ	مخزونہ کتب خانہ سالارجنگ
۶۔ دیوان حقائق علوی	میر امداد علی علوی
۷۔ میر امداد علی علوی حیات اور فن	رشید النساء بیگم

سلسلہ نمبر	مطبوعہ تصانیف	مصنف / مرتب	سنہ اشاعت
۸	اُردو ادب کی تاریخ	گراہم بیلی مترجم سید محمد عظیم	سنہ ۱۹۹۷ء
۹	ارباب نثر اُردو	سید محمد	سنہ ۱۹۳۷ء
۱۰	اُردو صحافت	مرتب انور علی دہلوی	سنہ ۱۹۸۷ء
۱۱	ادبیات آصف سابع	مرتبہ افسر واحدی	سنہ ۱۹۸۸ء
۱۲	اُردو کی نثری داستانیں	گیان چند	سنہ ۱۹۸۷ء
۱۳	اُردو مثنوی شمالی ہند میں	گیان چند جین	سنہ ۱۹۶۹ء
۱۴	اُردو مثنوی کا ارتقاء	عبدالقادر سروری	طبع اول
۱۵	اُردو نثر کا آغاز و ارتقاء	رفیعہ سلطانہ ڈاکٹر	مطبوعہ مجلس تحقیقات اُردو حیدرآباد
۱۶	المحبوب	نصیر الدین ہاشمی	سنہ ۱۹۹۶ء
۱۷	ابجد سے شاذ تک	مرتبہ ادارۂ سیاست	سنہ ۱۹۸۸ء
۱۸	افتخار علی شاہ وطن حیات اور کارنامے	عقیل ہاشمی ڈاکٹر	سنہ ۱۹۸۰ء
۱۹	بجھتے چراغ	محمد اکبر الدین صدیقی	سنہ ۱۹۷۵ء
۲۰	بہادر شاہ ظفر	نجو قمر	طبع اول
۲۱	تاریخ ادب اُردو جلد دوم حصہ دوم	جمیل جالبی ڈاکٹر	طبع اول [illegible]
۲۲	توفیق حیدرآبادی، حیات اور شاعری	سید موسیٰ کاظم	طبع اول

۲۳۔ تاریخ دکن طبع عالیہ	یوسف حسین خاں	۱۹۳۴ء
۲۴ تاریخ نوائط جلد اول	عزیز جنگ ولا	طبع اول
۲۵ تذکرہ دربار حیدرآباد	رمن راج سکسینہ	۱۹۸۸ء
۲۶۔ تذکرہ مشعرائے اورنگ آباد	سردار علی	طبع اول
۲۷۔ تذکرۂ آصفیہ	شاہ تجلی علی تجلی	
۲۸۔ تذکرہ محبوبیہ جلد دوم	غلام صمدانی خاں گوہر	۱۳۱۹ھ
۲۹ جامعہ عثمانیہ	مرتب محمد عبدالحئی	۱۹۹۳ء
۳۰۔ جنوبی ہند میں رباعی گوئی	صاحب حیدرآبادی	۱۹۸۴ء
۳۱۔ حرف اعتبار	سید داؤد اشرف ڈاکٹر	۲۰۰۱ء
۳۲۔ حیات آصف	محمد محبوب جنیدی	
۳۳۔ حیدرآباد دکن کے علمی و ادبی رسائل	محمد انوارالدین پروفیسر	۱۹۹۴ء
۳۴۔ حیدرآباد کے علمی و ادبی ادارے	شفیعہ قادری	۱۹۸۳ء
۳۵۔ حیدرآباد کی تیس سالہ سیاسی جد و جہد	کے کرشنا سوامی مدیراج	۱۹۳۸ء
۳۹۔ حیدرآباد کے ادیب جلد اول	زینت ساجدہ	۱۹۶۳ء
۴۰۔ حیدرآباد کے ادیب جلد دوم	زینت ساجدہ	۱۹۶۴ء
۴۱۔ حیدرآباد کے شاعر	سلیمان ادیب	۱۹۶۲ء
۴۲۔ حیدرآباد میں بیرونی شعراء	مرتب سیدہ جعفر ڈاکٹر	۱۹۸۸ء

۴۳۔	خواتین دکن کی اردو خدمات	نصیر الدین ہاشمی	۱۳۵۹ھ
۴۴۔	خم خانۂ جاوید جلد اول	لالہ سری رام	۱۹۴۰ء
۴۵۔	دار العلوم کے سپوت	حافظ محمد مظہر	۱۹۵۳ء
۴۶۔	داستان ادب حیدرآباد	سید محی الدین قادری ڈاکٹر	۱۹۸۲ء
۴۷۔	داستان نظام علی خاں شاہ کرنر	مرتب میر نجم الدین خاں ڈاکٹر	
۴۸۔	داغ حیات اور کارنامے	مرتب کامل قریشی	۱۹۸۶ء
۴۹۔	داغ دہلوی	تمکین کاظمی	۱۹۵۵ء
۵۰۔	داغ دہلوی	نور اللہ محمد نوری	۱۹۶۰ء
۵۱۔	دکنی رباعیاں	سیدہ جعفر ڈاکٹر	۱۹۶۶ء
۵۲۔	دکھنی (قدیم اردو) کے چند تحقیقی مضامین	نصیر الدین ہاشمی	۱۹۶۳ء
۵۳۔	دکنی کی مخصوص شعری اصناف	حبیب نثار ڈاکٹر	۱۹۹۵ء
۵۴۔	دکنی میں اردو	نصیر الدین ہاشمی	۱۹۸۶ء
۵۵۔	دکنی ہندو اور اردو	نصیر الدین ہاشمی	۱۹۵۷ء
۵۶۔	دو ملک ایک کہانی	ابراہیم جلیس	
۵۷۔	دیوان بساطے باقی	باقی	
۵۸۔	دیوان چمنستان حمزہ	محمد امیر حمزہ	۱۳۷۹ھ

۵۹۔ دیوان توفیق	مرتب سید عترت شمیم	نادر ل
۶۰۔ دیوان داؤد اورنگ آبادی	مرتب خالدہ بیگم	۱۹۵۸ء
۶۱۔ دیوان سرمایۂ حیات	ترک علی شاہ ترکی	۱۳۳۲ھ
۶۲۔ دیوان عشق	مرتب محمد اکبرالدین صدیقی	۱۹۶۰ء
۶۳۔ دہلی بارہویں صدی میں (مرقع دہلی)	مرتب کلیم سید مظفر	
۶۴۔ راہرو اور کارواں	حفیظ قتیل	۱۹۵۵ء
۶۵۔ ریاض مختاریہ	میر علاؤ علی دانش	۱۹۶۲ء
۶۶۔ ریاست حیدرآباد میں جدوجہد آزادی	سید محمد جواد رضوی ۲۰۰۰ء	۲۰۰۰ء
۶۷۔ سخنوران دکن	تسکین عابدی	۱۳۵۷ھ
۶۸۔ سلطان العلوم اور ان کی علمی خدمات	حامد لطیف ملتانی قادری	۱۹۹۳ء
۶۹۔ شعرائے اردو کے تذکرے	حنیف نقوی ڈاکٹر	۱۹۶۷ء
۷۰۔ صدیقی خوان یغما	محمد انوارالدین صدیقی	۱۳۷۵ھ
۷۱۔ عہد آصفیہ میں اردو نثر کا ارتقاء	محمد طیب انصاری ڈاکٹر	۱۹۹۹ء
۷۲۔ عہد ارسطو جاہ علمی و ادبی خدمات	لئیق صلاح ڈاکٹر	۱۹۸۶ء
۷۳۔ فانوس خیال	توفیق حیدرآبادی	
۷۴۔ فصاحت جنگ جلیل	علی احمد جلیلی ڈاکٹر	۱۹۹۱ء

۷۵۔ کاروان سخن	مرتب عادل حیدرآبادی	۱۹۵۶ء
۷۶۔ گلشن پرشاد شاد	حبیب ضیاء ڈاکٹر	۱۹۵۸ء
۷۷۔ کلیات ایمان	سیدہ ہاشمی مجیب	۱۹۸۲ء
۷۸۔ کلیات سراج	مرتب عبدالقادر سروری پروفیسر	۱۹۸۲ء
۷۹۔ گل عجائب	مرتب مولوی عبدالحق	۱۹۲۸ء
۸۰۔ گل عجائب	اسد علی خاں تمنا	۱۹۸۵ء
۸۱۔ گلدستۂ جشن آصفیہ	عبداللہ خاں ضیغم	۱۳۲۹ف
۸۲۔ گلشن گفتار	حمید اورنگ آبادی مرتب سید محمد	طبع اول
۸۳۔ ماہ لقا حالات زندگی مع دیوان	مرتب راحت عزمی	۱۹۹۸ء
۸۴۔ محبوب الزمن تذکرۂ شعرائے دکن	عبدالجبار خاں ملکاپوری	۱۳۲۹ف
۸۵۔ مدراس میں اردو	محمد افضل الدین اقبال ڈاکٹر	۱۹۸۵ء
۸۶۔ مرقع سخن جلد اول	مرتب سید محی الدین قادری زور ڈاکٹر	۱۹۳۵ء
۸۷۔ مرقع سخن جلد دوم	مرتب سید محی الدین قادری زور ڈاکٹر	۱۹۳۷ء
۸۸۔ مرقع سخن جلد سوم	مرتب سید محی الدین قادری زور ڈاکٹر	۱۹۳۴ء
۸۹۔ مرقع سخن جلد چہارم	مرتب سید محی الدین قادری ڈاکٹر	۱۹۳۹ء
۹۰۔ مشاہدات	ہوش بلگرامی	مکتبہ دارالکتاب لاہور

۹۱۔	مطالعہ	حبیب نثار ڈاکٹر	۱۹۹۶ء
۹۲۔	مملکت آصفیہ جلد اول	محمد عبدالغنی ڈاکٹر	۱۹۲۸ء
۹۳۔	مملکت آصفیہ جلد دوم	محمد عبدالغنی ڈاکٹر	۱۹۲۸ء
۹۴۔	سید اسد علی تمنا	مہر جہاں ڈاکٹر	
۹۵۔	سید اسد علی علوی	... ... علوی	
۹۶۔	میر شمس الدین فیض حیات اور کارنامے	لئیق صلاح	۱۹۸۰ء
۹۷۔	میر عثمان علی خان آصف سابع حیات اور کارنامے	طیبہ بیگم	۱۹۹۵ء
۹۸۔	محب اور ملک	سیدہ جعفر ڈاکٹر	۱۹۹۵ء
۹۹۔	مہاراجہ چندولعل شاداں حیات اور کارنامے	عقیلہ شوکت ڈاکٹر	۱۹۸۳ء
۱۰۰۔	نظم طباطبائی	اشرف رفیع ڈاکٹر	۱۹۸۶ء
۱۰۱۔	نغمۂ عنادل	راجہ راجیشور راؤ اصغر	۱۳۵۷ھ

رسالے

"اردو" جلد سوم مدیر عبدالحق بابت اپریل ۱۹۲۳ء

"جامعہ دہلی" جلد ۱۲ شمارہ ۳،۴

"مجلہ طیلسانین" جلد ۷ شمارہ ۱

"نقوش" شخصیات نمبر ۱۹۵۶ء

"نوائے ادب" بابت جولائی ۱۹۵۳ء

Department of Urdu,
School of Humanities,
University of Hyderabad,
Hyderabad-500 046.

Dt. 31-12-2002

This is to certify that **MOHD. BASHEER UDDIN** have carried out the research embodies in the present thesis entitled **"Ahed-e-Asafia Mein Urdu Sher-o- Adab Ka Irteqa" (Development of Urdu Prose & Poetry in the Asafia dyasty)** for the full period prescribed under Ph.D. ordinances of the University

I declare to the best of my knowledge that no part of this thesis was earlier submitted for the award of research degree of any University.

(Signature of the candidate)

Name: **Mohd. Basheer uddin**

Enrolment No. 98HUPH06

(Signature of the supervisor)

Head, Dept. of Urdu

Dean, School of Humanities

University of Hyderabad

AHED-E-ASAFIA MEIN URDU SHER-O-ADAB KA IRTEQA
(Development of Urdu Prose & Poetry in the Asafia dynasty)

DISSERTATION

Submitted to the University of Hyderabad, in Partial fufilmnet of the requirements of the award of the Degree of

DOCTOR OF PHILOSOPHY

IN

URDU

Submitted

By

MOHD BASHEER UDDIN
M.A., M.PHIL.(Hyd)

Supervised

By

Dr Mohd. Anwaruddin
Professor in Urdu
University of Hyderabad

Department of Urdu
School of Humanities
University of Hyderabad

2002